زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

جلد:۱۵ شمارا جنوری فروری ۲۰۰۶ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِسالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارا سری نگر سے
بالاکوٹ تک اجتماعی قبروں کے مکیں
اور اُن کے
مقہورُ و مجبورُ عزاداروں
سے منسوب ہے۔

بانی مدیرِاعلیٰ

# سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

# گلزار جاوید

مدیرِ معاون

# بینا جاوید

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

رابطہ:537 ویسٹریج-III راولپنڈی۔فون:5467235 - 92-51-5462495 ای۔میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

سرورق، پسِ ورق....... شعیب حیدر زیدی

پیشانی.................... وقار جاوید

قرطاسِ اعزاز.................. ادارہ

رنگِ قمر............... مصطفیٰ ملک

اردو افسانے کے اسالیب... مرزا حامد بیگ

براہِ راست..................... گلزار جاوید

افسانے کا نیا افق...... ڈاکٹر تبسم کاشمیری

گم شدہ کلمات ........ جیلانی کامران

مرزا حامد بیگ کے افسانے...... علی تنہا

تار پر چلنے والی...... ڈاکٹر توصیف تبسم

افسانہ..............

جانکی بائی کی عرضی........... مرزا حامد بیگ

ادبار قلب.................. قاری شا

قلبِ صمیم

افتخار عارف، علیم صبا نویدی

سخنِ تازہ........

مشکور حسین یاد، شبنم شکیل، نامی انصاری، کرشن
کمار طور، اکبر حمیدی، محشر زیدی، حسن جوہر،
سرور انبالوی، شاہد واسطی، جلیل عالی، قیصر نجفی،
انوار فیروز، عبدالرحمان عبد، صدیق شاہد، صابر
آفاقی، سلطان صبروانی، محمد ظہیر، حنیف ترین،
غالب عرفان، کاوش پرتاپ گڑھی، اکرام تبسم،
کرامت بخاری، ضمیر نوری، نذیر کجاہی، ماجد
سرحدی، علی آذر، نجم جاوید، امتیاز دانش، مشتاق
شبنم، حکیم خان حکیم، پرویز ساحر، شہاب صفدر،
عادل فریدی، رعنا پروین، عادل حیات، طالب
انصاری، شہباز خواجہ

افسانے.........

قیاس.................. جوگندر پال

سانپ اور سانپ.......... ستیہ پال آنند

فاصلہ.................... جتندر بلو

مکمل نامکمل............... مشتاق اعظمی

فردوسِ بریں................ گلزار جاوید

نظمِ عصر......

ستیہ پال آنند، ڈاکٹر سرسوتی روشن، شاہد واسطی،
کاوش پرتاپ گڑھی، قیصر نجفی، ماجد سرحدی،
حنیف ترین، صدیق فنکار، سری واستو ہند، نذیر
کجاہی، شگفتہ نازلی، غالب عرفان، بھگوان داس
اعجاز، علی آذر، سجاد مرزا، مشتاق شبنم، ندیم ساحل،
دل نواز دل

نشانِ راہ.......

الہامہ............... علیم صبا نویدی

تخلیقِ عصر......

تازہ تصانیف کا تعارف...... عطیہ سکندر علی

مجلسِ چہار سو......

پروفیسر غفور احمد سے مکالمہ..... گلزار جاوید

رس رابطے......

جستجو، ترتیب، تدوین...... اعجاز کھوکھر

متاعِ چہار سُو

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

کے نام

# رشکِ قمر..... مصطفٰے ملک

نام: ڈاکٹر حامد حسین

ادبی شناخت: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ولدیت: محمد اکرم بیگ (سندھ پولیس میں ڈی ایس پی)

تاریخ پیدائش: 29 اگست 1949ء

جائے پیدائش: کراچی

ڈومیسائل: اٹک (پنجاب)

تعلیمی لیاقت: ایم اے (اردو)، پنجاب یونیورسٹی (1972)، پی ایچ ڈی (اردو)، پنجاب یونیورسٹی (1986)

آغاز ملازمت: گورنمنٹ ڈگری کالج، کوہمری 30 اکتوبر 1974ء

شادی: 8 مئی 1977ء ہمراہ اختر مرشوکت جہاں

موجودہ ذمہ داری: صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ لاہور۔

موجودہ پتہ: 225، نشتر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور، فون رہائش: 042-5426945 موبائل: 0300-4389515

ای میل: mirza_hamid_baig@yahoo.com

اہم ذمہ داریاں:

(۱) ریسرچ سکالر، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور (22 فروری 1974ء تا 31 اکتوبر 1974ء)۔

(۲) مدرس، ممبر، نگران اور خارجی ممتحن ایم فل (اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (مارچ 1978ء تا مارچ 1995ء)۔

(۳) ممبر اورکنگ ، سرکولرونگ، ایم ایس سی تعلیم برائے خواتین پروجیکٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد (جنوری 1995ء تا جون 1995ء)۔

(۴) ترتیب پرچہ امتحان اور خارجی ممتحن، ایم فل (اردو) کورس 708، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور (2001ء تا 2003ء)

(۵) ترتیب پرچہ امتحان اور خارجی ممتحن، ایم اے اردو، پرچہ فکشن II، یونیورسٹی آف پشاور 1997ء تا حال۔

(۶) ترتیب پرچہ امتحان اور خارجی ممتحن، ایم اے اردو، پرچہ تنقید، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی آف فیصل آباد (2005ء تا حال)

(۷) مصنف ولیول اردو ٹیکسٹ بک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس برطانیہ (2002ء تا حال)

(۸) ممبر بورڈ آف سٹڈیز، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور (2003ء تا حال)

(۹) نگران پی ایچ ڈی، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور (2003ء تا حال)

تخلیقات:

(۱) گمشدہ کلمات (افسانے) خالدین پوسٹ بکس 1197 لاہور (1981)

(۲) افسانے کا منظر (تنقید) مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور (1981)۔

(۳) تیسری دنیا کا افسانہ (تنقید) خالدین پوسٹ بکس 1197 لاہور (1982)

(۴) تار پر چلنے والی (افسانے) پولیمر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور (1984)۔

(۵) قصہ کہانی (پنجابی افسانے) پنجابی ادبی بورڈ، لاہور (1984)۔

(۶) اردو اور صوفی ازم (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1986)۔

(۷) عزیز احمد: کلیات (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1986)۔

(۸) کلیات تراجم: طلسمِ حب (تحقیق) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1986)۔

(۹) ترجمے کا فن: نظری مباحث (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1987)۔

(۱۰) سفرنامے کی مختصر تاریخ (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1987)۔

(۱۱) کلیات تراجم: نثری ادب (تحقیق) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1987)۔

(۱۲) مغرب سے نثری تراجم (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1988)۔

(۱۳) اطالیہ میں اردو (تحقیق) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1989)۔

(۱۴) گناہ کی مزدوری (اردو افسانے) ابلاغ، 733 آئی ٹین فور، اسلام آباد (1991)۔

(۱۵) اردو افسانے کی روایت (تحقیق و تنقید) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (1991)۔

(۱۶) حمیدہ کی کہانی (طویل افسانے) UNESCO + AIOU، اسلام آباد (1992)۔

(۱۷) اردو کا پہلا افسانہ نگار (تحقیق و تنقید) راشد الخیری اکیڈمی کراچی (1992)۔

(۱۸) مصطفیٰ زیدی کی کہانی (تحقیق و تنقید) گورا پبلشرز لوئر مال لاہور (1993)۔

(۱۹) مقالات (تحقیق و تنقید) پولیمر پبلشرز، اردو بازار، لاہور (1994)۔

(۲۰) نثاری (تحقیق و تنقید) کلاسیک، دی مال لاہور (1995)

(۲۱) نسوانی آوازیں (تحقیق و تنقید) سارنگ پبلشرز، لاہور (1996)۔

(۲۲) میر امن دلی والے (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1998)۔

(۲۳) ٹی۔ ایس ایلیٹ (تحقیق و تنقید) دوست پبلی کیشنز اسلام آباد (1999)۔

(۲۴) اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ (تحقیق و تنقید) کلاسیک، دی مال لاہور (1999)۔

(۲۵) عالمی کلاسیک: لیکچرز (تحقیق و تنقید) یونیکٹ پبلشرز، لاہور (2000)۔

(۲۶) لاکر میں بند آوازیں (ہندی افسانے) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی بھارت (2001)۔

(۲۷) باغ و بہار (مرتبہ) اردو سائنس بورڈ، دی مال، لاہور (2004)۔

(۲۸) اردو ناول آغاز (مکمل حصہ) برائے انٹرمیڈیٹ اردو کورس، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

(۲۹) کوہ مری کی سیر (مکمل حصہ پنجابی کہانی) برائے بورڈ انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور۔

(۳۰) عالمی کلاسیک ہومر (مکمل حصہ) برائے بی اے اردو کورس، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

(۳۱) قصہ، ناول، افسانہ (مکمل حصہ) برائے ایم ایس سی، خواتین تعلیم پروجیکٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

(۳۲) سفرنامہ حج (مکمل حصہ) برائے ایم ایس سی، خواتین تعلیم پروجیکٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

(۳۳) افسانہ: مغل سرائے (مکمل حصہ) برائے او لیول کورس، آکسفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ۔

ادارت: (۱) "لفظ" خاص شمارہ جشن صد سالہ برائے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور 1972۔

(۲) "لفظ" خاص شمارہ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور 1973۔

(۳) "گورڈونین" خاص اقبال نمبر گورڈن کالج، راولپنڈی 1977۔

(۴) "گورڈونین" سالانہ شمارہ، گورڈن کالج، راولپنڈی 1979-1981۔

(۵) "گورڈونین" خاص ہجرہ نمبر، گورڈن کالج، راولپنڈی 1981-1982۔

(۶) "اورنگ" خاص گولڈن جوبلی نمبر، گورنمنٹ ڈگری کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی 1990۔

(۷) "مشعل" خاص گولڈن جوبلی نمبر، گورنمنٹ کالج اٹک 1997-1998۔

(۸) "گل بکاؤلی" خاص نمبر لاہور 2002۔

اعزازات:

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب کے فن و شخصیت پر ڈاکٹر علمدار حسین بخاری کی زیر نگرانی ایم اے کا مقالہ بعنوان "ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری" بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان 1996-98 میں لکھا گیا ہے۔ مقالہ نگار نفیس اختر تھیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے فن و شخصیت پر قریب ایک درجن رسائل خصوصی اشاعت کا اہتمام کر چکے ہیں جن میں ماہنامہ "اسلوب" مسرم بھارت، ماہنامہ "فنکار" کراچی، ماہنامہ "توازن" مالیگاؤں بھارت نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب ادبی سفر میں ایک صد کے قریب ادبی، تنقیدی، فکری اور فنی مقالات تحریر فرما چکے ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ بے شمار ٹی وی ڈرامے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں جن میں سرفہرست "تنہائی میں چلنے والا"، "کچھوے کی بولیا"، "لاٹ صاحب کی سواری" اور "قصہ کہانی" کے سلسلے کے بے شمار ڈرامے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب ملک کے ایک درجن سے زائد بلند قامت اہل قلم کی تخلیقات کے پیش لفظ اور دیباچے بھی تحریر فرما چکے ہیں۔ آپ کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے آپ کے افسانوی مجموعے "قصہ کہانی" پر 1984 میں داؤد ادبی ایوارڈ، 1991 میں "گناہ کی مزدوری" پر نیشنل بک کونسل ایوارڈ، 1993 میں آپ کی تخلیق "مصطفیٰ زیدی" پر بھی نیشنل بک کونسل ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب بے شمار ملکی و غیر ملکی ادبی سیمینارز میں شرکت کر کے علم و فکر کی روشنی پھیلا چکے ہیں جب کہ مستقبل میں بھی ڈاکٹر صاحب کے حوصلے اور ارادے مضبوط ہیں۔

# اردو افسانے کے اسالیبِ بیان

مرزا حامد بیگ

سوال یہ ہے کہ اردو افسانے کے سرمایے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے کیا حقیقتِ واقعہ، کردار نگاری، تانیث اور اسلوبِ بیان یکساں اہم ہیں یا اُن میں سے کوئی ایک؟

اس سوال پر غور کیے بغیر ہمارے ہاں عمومی طور پر اردو افسانے سے متعلق تنقیدی مباحث میں حقیقتِ واقعہ اور کردار نگاری کے مقابلے میں اسلوبِ بیان بہت کم زیرِ بحث آیا ہے جب کہ فن پارے کے اہم گتھے اور سچے ہوئے عناصرِ ترکیبی کا کامل تجزیہ اسلوبِ بیان کو زیرِ بحث لائے بغیر ممکن نہیں۔

اردو کے پہلے افسانے "نصیر اور خدیجہ" از راشد الخیری مطبوعہ "مخزن" دسمبر ۱۹۰۳ء تا حال کے دورانیے پر مشتمل اردو افسانے کے سو سالہ سفر میں بروئے کار لائے جانے والے اسالیبِ بیان کا جائزہ آگے آنے والے کل کے لیے اس تجربے کا جواز کرنے کے قابل ہو سکتا ہے، جس کی خواہش ہمیشہ کی جاتی ہے۔

آج اِس خصوص میں کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ان ساٹھ کی دہائی میں اور اس کے بعد افسانہ نگار کا ہدف موجود سے پرے کا علاقہ بھی رہا ہے۔ یوں موجود اور واضح کے مقابل غیر واضح، شعور کے مقابل لاشعور اور اجتماعی لاشعور، حقیقت اور روایت کے مقابل شک اور خارجیت کے مقابل داخلی تجربوں نے اہمیت اختیار کر لی اور حقیقتِ واقعہ جسے افسانے کا جوہر اور توانائی کا مرکز تصور کیا جاتا تھا کی اہمیت بہ ہر جا کم ہو کر رہ گئی۔ جس کے نتیجے میں آدرش، مینی فیسٹو کے پابند اور رومانوی یک رُخے بیانیے کی جگہ علامتی، استعاراتی، تجریدی اور کیوبسٹک اظہاریان نے اہمیت حاصل کی۔

پیچھے مڑ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ویں صدی کا آغاز بہت بڑی اکھاڑ پچھاڑ سے ہوا۔ حالیات، امپیریل ازم، سوشل ازم اور ایستھیٹک ازم کے ریلوں اور یورپ کی نت نئی تحاریک کے اثرات نے ہمارے افسانوی بیان کو حد درجہ متاثر کیا۔ بے شک، کسی بھی نوع کی بڑی تبدیلی کا پہلا مظہر ایسے ہی تجاذب میلانات سے ظہور پاتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کی ادراک پسندی اور ڈپٹی نذیر احمد کی مقصدیت کے مقابل کہانی کے سادہ بیانیے، تمثیل نگاری اور داستانوی بیان کی شعریت نے دم توڑ دیا تو اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کی معرفت ڈپٹی نذیر احمد کے تمثیلی قصوں سے مخصوص زبان کا دہلوی انگ اردو مختصر افسانے کے فریم میں منتقل ہو گیا اور اس اسلوبِ اظہار میں مختلف علاقہ جات اور تہذیبی مراکز کے محاورے اور روزمرہ کے اضافہ جات دیکھنے کو ملے جیسے عباسی بیگم کے ہاں جنوبی ہند کے ضلع کرشنا اور فرسا پور کا مضافاتی انگ اور روزمرہ کا استعمال، سجاد حیدر کا اتر پردیش سے متعلق مخصوص لہجہ، آمنہ نازلی کا دہلوی محاورہ اور اُمت الوحی کے ہاں پنجابی زبان کی آمیزش سے پیدا ہونے والا مخصوص آہنگ۔ نسوانی آدرشی حقیقت نگاری اور رومان نگاری سے مخصوص رہا جس میں آگے چل کر صدیقہ بیگم سیوہاروی، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی اور بانو قدسیہ نے اپنے اپنے علاقائی اثرات کے تحت نئے لہجے تراشے۔

اردو کے دیگر دو ابتدائی افسانہ نگاروں علی محمود اور وزارت علی اور بی نے ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۶ء کی مختصر درمیانی مدت ہی میں علاقہ بہار سے مخصوص ہندوستانی Noble savage کی سادہ زبان کا چلن عام کر دیا۔ آگے چل کر اسی روایت میں جمیل عظیم آبادی، اعظم کریوی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، انور عظیم، احمد یوسف، اُمِ عمارہ، حسین الحق، عبدالصمد، علی امام، شوکت حیات اور شموئل احمد کے افسانوں میں اِس بہاری انگ کی گھلاوٹ اور اکھڑپن کے متنوع روپ دیکھنے کو ملے۔ ۱۹۰۶ء سے سجاد حیدر یلدرم کی معرفت اردو نثر میں رومانی مثالیت نے رواج پایا۔ یہ کلاسیکیت کی نفی، مقصدی حقیقت پسندی کا ردِ عمل تھا۔ داخلیت، جس کا وصفِ خاص ہے۔ جب کہ نیاز فتح پوری کی رومانیت کی نمایاں پہچان وارفتہ نوائی ہے جس کے ڈانڈے بعض اوقات کمزور سی حقیقت پسندی سے بھی جا ملتے ہیں۔ ایسے میں مجنوں گورکھ پوری کی رومانی قنوطیت اور حجاب امتیاز علی کے ہاں پایا جانے والا احساسِ اجنبیت دو الگ ذائقے ہیں۔

اس دور کی فکشن میں رومان کا والا و شیدا رابندرناتھ ٹیگور تھے۔ ٹیگور کے دو ابتدائی افسانوی مجموعوں "Hungry Stones" اور "Mashi" میں پائی جانے والی دور رس حیرت اور شاعرانہ پن سے ہمارے اولین رومانی افسانہ نگار متاثر دکھائی دیے لیکن آگے چل کر نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھ پوری اور حجاب کے ہاں آسکر وائلڈ کی زوال حال پرستی، بنگال کی تصوف فضا بندی، نیز رائڈر ہیگرڈ اور عمر خیام کی رومانی انفرادیت کے اثرات بھی محسوس کیے گئے جب کہ سر عبدالقادر سرفراز، گل، لطیف الدین پر بہار روایت سے متاثر دکھائی دیے۔

یلدرم اور نیاز کے ہاں فارسی کی مٹھاس اور حلاوت اُن کے اسالیبِ بیان کا وصفِ خاص ہے۔ زبان و بیان کی اسی روایت میں حجاب کے ہاں جو نکھار دیکھنے کو ملتا ہے، اس کا باعث غربت کا بتدریج کم ہونا تھا، جو فکر پی کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی۔ آگے چل کر یہ اسلوبیاتی روایت قرۃ العین حیدر کے ہاں ایک معیار میں ڈھل گئی۔

۱۹۰۸ء تک آتے آتے علی گڑھ تحریک کی ادراک پسندی اور ڈپٹی

نذیر احمد کی مقصدیت کے باعث ادغام کی صورت پریم چند، سلطان حیدر جوش اور سدرشن کے افسانوں میں ظاہر ہوئی۔ یہ روزمرہ کے حوالے سے صاف اور سادہ زبان تھی جسے پریم چند کے ہاں جذبۂ قومیت نے قدرے جذباتی بنا دیا اور سلطان حیدر جوش کے ہاں طنز کی کاٹ دیکھنے کو ملی۔ بعد ازاں علی عباس حسینی نے بھی یہی زبان برتی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پریم چند اور سدرشن کے ہاں ہندی لفظیات کی کثرت ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اکثریت کو مینی فیسٹو کی پابندی کے باعث یہی اسلوب اظہار مناسب معلوم ہوا، البتہ ہندی الفاظ کا استعمال رفتہ رفتہ گھٹتا چلا گیا۔ اسی اسلوب اظہار کے فوری پھیلاؤ کی مثال ملک راج آنند اور جگل کشور شکلا کے ہاں مل جاتی ہیں۔ بعد ازاں ابراہیم جلیس نے بھی یہی زبان برتی۔

یاد رہے کہ پریم چند کے شاہکار افسانہ "کفن" کی تخلیق سے تین برس قبل ۱۹۳۲ء میں محمد مجیب کے افسانوی مجموعہ "کیمیا گر" اور "انگارے" مرتبہ: احمد علی میں سگمنڈ فرائڈ اور ڈی ایچ لارنس کے ملے جلے اثرات کے تحت متنوع نفسی کیفیتوں سے مطابقت کے تحت تکنیک کا تنوع اظہار بیان کے نئے اسالیب بھی متعارف کروا گیا جن کا ورثہ ترقی پسند تحریک کے ہنگام کے سبب تادیر دوبارہ دیکھنے کو نہ ملا۔

"انگارے" گروپ کے افسانہ نگاروں میں سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے ہاں منجھی ہوئی زبان میں عوامی روزمرہ طنز کی کاٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے اس اسلوب بیان کی نمایاں خوبی اختصار نگاری کا قرینہ بھی ہے جو اس سے قبل بہت کم دیکھنے کو ملا۔

احمد علی کے ہاں یادوں کے دھارے سے مطابقت رکھنے والی ترسیلنک تدبیرکاری اور آزادانۂ تلازمۂ خیال سے جنم لینے والے ڈرامائی مونولوگ سے مخصوص ماحول نے ایک منفرد اسلوب کا باعث بنی۔

اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سے ایک چودھری محمد علی ردولوی نے داستانوی بیان کو قدرے مختلف انداز سے برت کر ایک نیا لہجہ تراشا۔ یہ نیا پن اُن کے ہاں قلم کے شوخ و شنگ strokes اور مزاح کے بانکپن سے پیدا ہوا نیز اُنھوں نے متناقص خیالی (Paradoxes) سے داستان کی نثری روایت میں اضافے کیے:

"راستے میں چھوٹا بھول بھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چھو گیا۔" ("کشکول محمد شاہ فقیر" سے اقتباس)

محمد علی ردولوی کے بعد زبان کے وتیرے کی اس روایت میں قاضی عبدالستار کا نام ابھر کر سامنے آیا اور اس خصوص میں جملہ امکانات مکمل کر گیا۔ قاضی عبدالستار کا "پیتل کا گھنٹہ" اس اسلوب کا عروج ہے۔

پریم چند کے اولین افسانوی مجموعے "سوز وطن" میں شامل داستانوی اسلوب کے حامل افسانوں کے بعد عزیز احمد نے حقیقت واقعہ کو افسانے کا جوہر اور توانائی کا مرکز خیال کرتے ہوئے "زریں تاج"، "شعلہ زار الفت"، "میرا دشمن میرا بھائی"، "مدن سینا اور صدیاں" نیز "آب حیات" جیسے تاریخ سے متعلق افسانے لکھتے ہوئے داستانوی اسلوب برتا یا "تصور شیخ" قلم بند کرتے ہوئے ملفوظاتی پیرایۂ اظہار اختیار کیا۔ بعد ازاں انتظار حسین نے اسی روایت میں "آخری آدمی" اور "زرد کتا" جیسے افسانے لکھے لیکن داستانوی اور ملفوظاتی اسالیب اظہار کا چلن اردو کے مختصر افسانے میں عام نہ ہو سکا۔

البتہ ایک بھرپور اسلوبیاتی روایت چیخوف اور مارس میٹرلنک کے ہمہ گیر اثرات کے تحت اردو افسانے میں جنم لیا اور خوب پھلی پھولی۔ یہ زبان کے تخلیقی امکانات اور بیان میں علامتی ابعاد پیدا کرنے کی روایت ہے جس میں راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور سید فیاض محمود نے افسانے لکھے اور یہ اسلوب اظہار ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کے تخلیقی عمل کی ضرورت ٹھہرا۔ زبان کی یہ باس اور ہندوستانی اساطیر کی اٹوٹ سپلائی لائن اس میں بیدی کی منفرد روایت ہے جس کی بہترین مثال افسانہ "گرہن" کا اختتامیہ ہے۔ غلام عباس اور سید فیاض محمود کے ہاں اس اسلوب اظہار کی نرم و لطیف نوعی ہوئی اور آپس میں باہم الجھی ہوئی رنجشیاں نوک کے لحن کو جنم دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ اور بعد کے چند افسانہ نگاروں نے اسی روایت میں اپنے لیے یکسر منفرد اسالیب اظہار وضع کیے۔ یہاں تک کہ یکا یک ان سا تھا تحریر کے جیسے ہی ہوا۔ اس کی ابتدائی مثال بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں جیسے منٹو کا "پھندنے"، کرشن چندر کے "تالاب"، "مردہ سمندر"، "ہاتھ کی چوری"، "گڑھا"، "بت جاگتے ہیں"، "اکلا درخت" اور "جنگل کی کونپلیں"، مرزا ادیب کے "دل یاقوت" اور "دروں تیرگی"، حیات اللہ انصاری کا "چچا جان"، اختر حسین رائے پوری کا "قبر کے اندر"، خواجہ احمد عباس کا "تین موتی"، سراج الدین ظفر کا "تازہ"، قرۃ العین حیدر کا "آدھ دوست" اور اختر اورینوی کا "کیلیاں اور بال جبریل" اس خصوص میں یادگار افسانے ہیں۔

یاد رہے کہ اردو افسانے کے ابتدائی دور ہی میں دہلی کی ٹکسالی زبان میں آدرش، حقیقت نگاری اور رومانی لحن کی آمیزش سے خواجہ حسن نظامی نے فصیح اور مستند زبان لکھنے کا تجربہ کیا تھا۔ موضوع کی سطح پر مغلیہ زوال سے مناسبت کے حوالے سے یہ تسلیم و رضا کی زبان تھی۔ اشرف صبوحی دہلوی آشنا نی اور الطاف فاطمہ نے اسی زبان کو برتا۔

دہلی سے مخصوص ٹکسالی کی اس اسلوبیاتی روایت کے علاوہ بے عیب زبان لکھنے کے علاوہ بے عیب زبان لکھنے کے حوالے سے چند دیگر افسانہ نگار بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں جیسے عزیز ملک، آغا بابر اور اعجاز حسین بٹالوی کے افسانوں

سے مخصوص ہوشیارپور اور بٹالہ کی لوک ایمائیت سے بھرپور زبان یا انتظار حسین
کے افسانوں میں میرٹھ کے نواحی علاقہ جات سے مخصوص لفظیات کی شمولیت
کے باوجود ایک شہری زبان اور اقبال مجید کا لکھنوی انگ۔ لیکن اردو افسانے
میں زبان و بیان کی سطح پر جو اسلوب بیانیہ میں سب سے زیادہ کامیابی سے برتا گیا
وہ عوامی روزمرہ سے متعلق ہے۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نے اس میں
شعریت اور شستگی کے اضافہ جات کے ساتھ اسے اپنایا۔

کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس اسی اسلوب اظہار کے سبب
جذبات کی sublime صورتوں پر قادر تھے۔ کرشن چندر کی بے پناہ مقبولیت
کے سبب اس اسلوبیاتی روایت میں بیانیہ افسانہ لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ
دکھائی دیتی ہے لیکن اُن میں سے جو نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان میں
اے حمید، غیاث احمد گدی، احمد شریف، ضمیر الدین احمد اور بلراج کومل نمایاں
ہیں۔

جب کہ زبان و بیان کے حوالے سے ایک ملی جلی اسلوبیاتی روایت
کو ترویج ملی سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی اور عصمت چغتائی کے افسانوں سے۔
اس اسلوبیاتی روایت کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر ایک کی بنیاد علاقائی زبانیں اور
عوامی بولیاں ہیں۔ ہر ایک صورت میں شہری لہجہ ابھر آتا ہے اور انتشار اس کی
نمایاں خوبی۔ مثال کے طور پر پنجابی کی آمیزش کے ساتھ جس اسلوبیاتی روایت
نے منٹو اور ممتاز مفتی کے افسانوں سے ترویج پائی تھی، بعد ازاں اشفاق احمد،
رحمان مذنب، اکرام اللہ، منشا یاد، جوگندر پال اور احمد داؤد نے برتا۔

اس نوع کے بیان میں ایسی تشبیہات جن میں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو،
قابل توجہ نہیں رہتیں لیکن ان افسانہ نگاروں کے ہاں تخیل نے موزوں ترین
مماثلتیں اور شباہتیں تلاش کر کے تشبیہ کو متنوع اور تعبیر کے لیے تجربے کی گہرائی
فراہم کر دی نیز ان کے افسانوں میں محاورے اور واقعات اس قدر دلچسپ ہیں کہ زبان و
بیان کی اگر خامیاں ہیں بھی تو قاری کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔

زبان و بیان کی اسی روایت میں راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ دو
ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں سنسکرت کی اساسوں کی مناسبت سے پنجابی اور ہندی
الفاظ کی شمولیت کا باقاعدہ تخلیقی جواز دکھائی دیا۔ اُن کے اسلوب بیان پر ناک
بھوں چڑھانے والے شاید زبان کے تخلیقی ہونا رہے کی اہمیت سے واقف ہی
نہیں۔

اس خصوص میں ابوالفضل صدیقی کے ہاں روہیلکھنڈ کی ثقافت
سے مخصوص زبان اور خان فضل الرحمٰن کے ہاں سنسکرت کی لفظیات کا ورود انھیں
نئے اسالیب بیان کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ جب کہ اسی روایت میں
دیوندر ستیارتھی کے ہاں ہندوستان کے قریہ قریہ سے سمیٹے گئے گیتوں کی خوشبو اور
واجدہ تبسم کے حیدرآبادی انگ کا الگ ذائقہ ہے۔

برصغیر کو "Society of diglossia" بھی کہا جاتا
ہے۔ اس ملی جلی لسانی سوسائٹی کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے فرگوسن نے برصغیر کو
زبانوں کا جنگل قرار دیا تھا۔ یہاں بڑی زبانوں کے علاوہ دراوڑی، آریائی اور
قبائلی زبانوں کے کئی سلسلے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں سے مخصوص
لفظیات کے اردو میں در آنے کے علاوہ کلکتہ، بمبئی اور کراچی کی بندرگاہوں اور
بڑے شہروں میں جنم لینے والا عامی اور غیر مہذب لب و لہجہ دل زبان پر اثر انداز
ہو رہا ہے۔ خاص طور پر بھارت میں کچھ عرصہ قبل ہندی کو عوامی بول چال بنانے
کے حوالے سے جو کچھ اردو سے ہندی نے مستعار لیا تھا، اب ہندی وہی کچھ
قدرے بگڑے ہوئے تلفظ اور غلط املا کے ساتھ اردو کو لوٹا رہی ہے۔ یہ ایک نئی
افتاد ہے جو نئے بھارتی افسانہ نگاروں کی زبان و بیان پر پڑی۔ خود ہمارے ہاں
پاکستان میں پنجابی، بلوچی، سندھی، سرائیکی، پوٹھوہاری، ہندکو اور پشتو لفظیات کو
تن آسان افسانہ نگار بلا کسی تخلیقی جواز کے بے دریغ برت رہے ہیں۔

جب کہ اس نوع کی زبان اور لب و لہجہ کا ورتارا کردار نگاری سے
مطابقت کے حوالے سے مکالماتی سطح پر تو جائز ہے جیسا کہ بمبئی کے ساجد رشید
کے ہاں دکھائی دیتا ہے لیکن اگر افسانہ نگار کا بیانیہ بھی اس عامی لفظیات اور لب و
لہجے سے آلودہ ہونے لگے تو یہ ایک لمحہ فکریہ ضرور ہے۔

میں یہ بات بمبئی، کلکتہ، کراچی، بہار، علاقہ سرحد، بلوچستان اور
سرائیکی بیلٹ سے متعلق بہت سے افسانہ نگاروں کا نام لیے بغیر کر رہا ہوں۔

دیکھیے، یہ جو کہا جاتا ہے کہ قدیم فکشن ماضی کے اس انسان کی آئینہ
داری تھی جس کی حیثیت محض ٹائپ کی ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ انسان کا یہ قدیمی
ٹائپ کردار جنگل کے اس اکیلے درخت کی مانند تھا جو اپنی انفرادیت جنگل میں
ضم کر دیتا ہے۔ لیکن وہ دنیا ہوا کل تھا اور آج عہد حاضر کے تضادات کچھ اس
نوعیت کے ہیں کہ جنھیں اس طرح share نہیں کیا جا سکتا۔ اب افسانہ نگار کو
محض اپنے اوپر وارد شدہ یکسر جداگانہ روحانی اور جذباتی واردات ہی رقم نہیں
کرنا بلکہ اپنے عہد کی بے رنگی کو بھی سمیٹنا ہے۔ اس جوکھم کا سامنا ساٹھ کے
دہے میں سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج مینرا اور خالدہ حسین نے بھی کیا اور ستر
کے دہے میں میرے ساتھی افسانہ نگاروں نے بھی۔ یوں ساٹھ اور ستر کے دہوں
کے جدید افسانہ نگاروں کا اسلوبیاتی تنوع آج نئے افسانہ نگار کی توجہ کا طالب
ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانے یقین اور رجائیت کی انتہائی زیریں
لہروں سے تشکیل پاتے ہیں اور اُن میں ماورائیت کا احساس مخصوص تہذیبی اور
تاریخی شعور کا پیدا کردہ ہے۔ یہ اُن کے اسلوب بیان کی خوبی ہے کہ وہ تہذیبی اور
تاریخی شعور امیجری اور آوازوں کے distort ہو جانے پر بھی اس خاص نوع
کی ماورائی کیفیت کو برقرار رکھتا ہے۔ انور سجاد اور بلراج مینرا نے برسوں تک

ہوئے شعر کی چہرہ نمائی اُس فرق کے ساتھ کی جو sublimation اور elevation کا فرق ہے۔ انور سجاد کے لہجے کی کرختگی اوس بورن کے "Look Back in Anger" سے ملتی جلتی ہے۔ بیان کی تیز ابیت اور زبان کا ایمائی بار اُنہیں کوٹتے پر اکسائے رہتے ہیں اور کمال اُبھر رہی ہو۔ جب کہ بلراج مین را کے ہاں ایک خاص نوع کی کومل جذباتی کی ethereal کردار نگاری سے مطابقت رکھتی ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں پایا جانے والا احساس عدم تحفظ اُن کے مخصوص اسلوب بیان کے سبب خوف، نفرت، توہمات اور تشکیک کی چہرہ نمائی کرتا ہے اور یوں خالدہ حسین کے ہاں جانے پہچانے کردار تجریدی اور ماورائی فضا میں سانس لیتے ہوئے زندگی کے وسیع تر تناظر میں سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔

رشید امجد نے سادہ بیانیہ کی گردن مروڑ کر پیکر تراشی کرتے ہوئے شعر اور نثر کی حد بندیاں توڑ دینے والا ایسا رنگ تشبیہاتی اور علامتی اسلوب وضع کیا جو نثر کے دبستان میں حد درجہ مقبول ہوا اور رشید امجد کے زیر اثر بھی اسلوب مثلاً ڈاکٹر اعجاز راہی، احمد داؤد اور حمید سہروردی کے ابتدائی افسانوں میں اپنی پہچان کرواتا ہے۔ البتہ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے مثلاً دور احمد داؤد کے ہاں تجرید کی جگہ علامت اور تجرید کی جگہ ٹھوس واقعیت نے لے لی۔

اسد محمد خاں کے ہاں نفسیاتی الجھاووں اور کربناک معروضی صورت حالات کا علامتی اظہار کہیں تو شدید طنز اور درشت لب و لہجے کا طالب ہوا اور کہیں اسلوبیاتی سطح پر تجرید کی تجسیم اور تجسیم کو تجرید میں ڈھالنے کی صورتیں دکھائی دیں۔

پھر احمد جاوید اور منشا یاد ہیں جنہوں نے معاصر صورت حال کا مطالعہ تاریخ کے تناظر میں کرتے ہوئے تمثیل نگاری کی۔ ایسے میں قدیم داستانوں سے کشید کردہ لہجہ اور احمد جاوید کے بیانیہ میں علامات تراشتے ہوئے بات کو دوہرانے کا عمل دو الگ الگ اسالیب بیان کا باعث بنا۔ جب کہ قمر احسن، سلام بن رزاق، ذکاء الرحمن، انور قمر، علی امام اور انور خان رائے نے اُلجھی ہوئی نفسی کیفیتوں سے متعلق علامت نگاری کرتے ہوئے کہیں تو حجاب اور سرگوشی سے کام لیا اور کہیں بیانیہ کو شعور کی رَو کے تحت اپنے اپنے طور پر برت کر ایک دوسرے سے یکسر الگ اسالیب تراشے۔

لیکن یہ سارا کام سادہ بیانیہ کو ترک کر کے ہی کیا گیا، جس سے ہُوا یہ کہ گزشتہ چار دہائیوں کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے بے چہرہ انسان کی ذہنی پژمردگی اور احساساتی تجزیہ کو افسانوی بیان میں جگہ ملی۔ لیکن ترسیل کی سطح پر تین آسان نگاری کی اپنی مشکلات تھیں۔

جب ایک تسلسل میں یہ کام کیا جا رہا تھا تو محسوس طور پر قاری کی تربیت بھی ہوتی چلی گئی۔ سب ٹھیک جا رہا تھا کہ ۸۰ء کے اواخر میں چند ہوئے

ناقدین نے افسانے سے روایتی کہانی پن کے اخراج کا رونا کچھ اس شدومد سے رویا کہ نئے افسانہ نگاروں کی راہ کھوٹی کر گیا۔

بعد میں سامنے آنے والے افسانہ نگاروں کی ایک مشکل تو یہ تھی وہ ان نثر کے قریبی اور تحرک ساحر پن سے کیا الگ راہ نکالیں۔ کسی کا Camp Follower بننا بھی انہیں منظور نہ تھا اور کوئی نئی راہ بھی نہیں سوجھتی تھی۔ لے دے کر ایک ہی راستہ انہیں سجھائی دیا کہ سادہ بیانیہ کی طرف لوٹ چلیں۔ جس کی ساٹھ اور ستر کے دہے میں تیج کر کے نزول کا کام کیا گیا تھا۔ یوں اسی دور سے کئی دو دہائیوں پر مشتمل بیس سالہ دورانیے میں صرف دو تین چار پانچ اہم نام ہی دکھائی دیتے ہیں محمد منشا یاد، مسعود اشعر، سید محمد اشرف، غضنفر، مظہر الزماں خان، طارق چھتاری اور بیگ احساس یا پھر ان کے بعد اگر ستر کے دہے والی لاٹ دکھائی دی ہے تو خالد جاوید کے ہاں۔

اگر یہ انحطاط ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ انحطاط پر تعجب، حیرت اور غصہ بھی انحطاط ہی کی ایک قسم ہے جس کے تحت منسوب تو انحطاط سے خوشگوار تعلقات استوار کرنا ہے اور اگر نئے افسانہ نگار سے ایسا کچھ ممکن ہے تو اُسے طرز احساس کی تبدیلیاں محسوس کرنا ہوں گی نیز موجود اسلوبیاتی روایت سے کامل آگہی اس لیے ضروری ہے کہ یہ دقت اور احتیاط والا نازک کام ہے۔ اسی سے اسالیب بیان کی زندہ روایت میں پھیلاؤ کی گنجائش نکلتی ہے۔

ہمیں ذہنی طور پر پسماندہ قاری اور بودے نقاد کی آہ و واہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ پیش منظر بہت دھندلا ہے اور اس دھند میں موجود ہو کا ترجمہ منافق اور آبرو باختہ انسانی کردار سوالیہ نشان بنے کھڑا ہے۔ اس از حد تیز ہے کردار کے نفسی بحران اور چال چلن کو روایتی بیانیہ میں سمیٹنا کسی طور ممکن نہیں۔ لہٰذا افسانے کی فارم اور زبان کے برتاؤ کی سطح پر تبدیلیوں کا جتن کرنا ہوگا۔ نئے لسانی پیرایۂ اظہار وضع کرنا اس لیے بھی ضروری ہیں کہ آج حیات کی حدود لامحدود ہیں۔ اب اول درجے کی عصری اور سائنسی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ اس میں مشکل صورت حال وہاں درپیش ہو گی جب بصارت اور سماعت کا تجربہ لامسہ اور ذائقہ کی حدود میں داخل ہو رہا ہو اور ہمیں اس کا اظہار کرنا پڑ جائے تو کیا کریں گے؟ بے شک استعارہ اور علامت کی معرفت ہم جہت معنوی تلازموں کی جستجو کریں۔ پر کچھ تو کرنا ہوگا مستقبل کے افسانہ نگار کے ہاں نئے اسالیب بیان کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

اس ضمن میں نئے افسانہ نگار کا کوئی واہمہ ہو تو ہو...... میں نہیں سمجھتا کہ اس راہ میں کوئی بھاری پتھر دکھائی دیتا ہے۔

☆ (سارک افسانہ کانفرنس علی گڑھ (بھارت) مارچ 2005ء میں پڑھا گیا)

# براہِ راست

*ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اردو افسانے میں منفرد نظر اور بے پناہ توانائی سے لکھنے والوں کی صف میں اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جس کی تقلید و پیروی نے صرف اُن کا سحر کر رکھا ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں اُن کی شناخت گہری اور کارآمد ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ تعارف کا حق نہایت خوبی سے استعمال کیجئے مگر "قرطاس ابلاغ" کے ہر ہر لفظ اور حرف کے مطالعے کے بعد!!*

**گلزار جاوید**

☆ بچپن، لڑکپن، نوجوانی اور جوانی کے ایام کا مختصر احوال اس طرح بیان فرمائیے کہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جائے؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب! میرا آبائی وطن علاقہ چھچھ موضع گمالہ تحصیل حضرو ضلع کیمبل پور (حال: اٹک) ہے۔ عہدِ اکبری کے صوبیدار اٹک بنارس مرزا احمد بیگ (میرے جدِ اعلیٰ) کی جاگیر کا بچا کھچا قدرے غیر آباد علاقہ، جس میں میری طرح کے بہت سے مرم اور گوار بستے ہیں لیکن میرا بچپن اور لڑکپن سندھ میں گزرا۔ میری پیدائش مسلم چند بلڈنگ کے ایک فلیٹ، علاقہ صدر کراچی کی ہے۔ وہ یوں کہ میرے والد محترم محمد اکرم بیگ نے جب کیمبل پور سے 1934ء میں میٹرک پاس کر لیا تو انگریزوں سے جاگیر اور خطاب یافتہ سر محمد خان، رئیس شمس آباد، علاقہ چھچھ نے پنجاب کی انگریز عملداری میں اُن پر سرکاری ملازمت کے تمام دروازے بند کروا دیئے اور وہ مسلسل بے روزگاری سے تنگ آ کر سندھ پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ میرا نام رکھتے ہوئے یہ احتیاط برتی گئی کہ "مرزا" اور "بیگ" کے سابقوں اور لاحقوں سے پاک کر دیا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ سر محمد خان کی اولاد میرے لیے بھی مشکلات پیدا کرے۔

میری اولین یادیں قصبہ محرزئی محبت، ضلع دادو، اندرون سندھ کی ہیں۔ دور تک آموں کے باغات کا ایک سلسلہ تھا اور میری دوپہریں گھماؤ غلیلوں سے ہریل طوطوں کو اڑانے میں گزر رہی تھیں۔ اُن دنوں اندرون سندھ ریڈیو کی نشریات بجلی یا بیٹری سے چلنے والے ریڈیو سے سنی جانے لگیں۔ اُن دنوں دلیپ کمار کی فلم "اُڑن کھٹولہ" ریلیز ہوئی تھی، جس کے گیت ہم گراموفون پر سنتے تھے۔ 1955ء میں وہاں سے تبدیل ہو کر میہڑ گئے جہاں سینما میں پہلی فلم "آبِ حیات" (پریم ناتھ، مدھوبالا) دیکھی۔ اس کے بعد بالترتیب دادو، ٹالٹی، حیدرآباد، ڈہرکی، میرپور خاص، نواب شاہ اور سکھر میں رہے۔ بچپن میں والدہ سے پنجابی میں "جنگ نامہ زیتون" اور "جنگ امیر حمزہ" سنتا رہا جو انہیں زبانی یاد تھے۔ اندرون سندھ کے گنجان جنگلات میں ڈاکوؤں کے جتھے اور پولیس مقابلے میں مارے جاتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن نواحی آبادیوں میں ڈاکہ پڑتا اور والد صاحب کئی کئی دن ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے، کبھی کامیاب اور کبھی ناکام واپس آتے تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ ہر چار چھ ماہ بعد نیا شہر ہوتا اور نئے لوگ۔ میرے دوست پیچھے رہ جاتے اور میں خود کو تنہا محسوس کرتا۔ آسودہ حال تھے، اردلی، باڈی گارڈ سب کچھ تھا صرف دوست نہیں تھے۔ دیگر بہن بھائی چھوٹے تھے اس لیے میں موسمِ گرما کی طویل دوپہروں میں چھت پر پتنگ اُڑاتا یا مصوری کرتا۔ مصوری میں میرے پہلے استاد شہر دادو کے ماسٹر وِسل تھے۔ اُن کی راہنمائی میں 1961ء ہی میں، میں نے ویسٹ پاکستان ڈرائنگ ایگزیمینیشن پاس کر لیا۔ یہ اس زمانے کے سندھی اخبارات کی ایک خبر بنی کہ بارہ برس کے لڑکے نے یہ امتحان پاس کیا۔

اُن دنوں ہر شام اردلی کے ساتھ تانگے پر فلم دیکھنے چلا جاتا۔ یوں کہیے کہ پولیس افسر کے اکلوتے تنہا اور آوارہ گرد لڑکے کی تربیت اس دور کی رومانی اور آرٹ کے پروڈکشن کی انقلابی فلموں نے کی۔

☆ تعلیمی درسگاہوں، ہم جماعتوں اور اساتذہ کی خوشگوار یادوں اور اپنی شخصیت پر اُن کے اثرات کا ذکر بھی ضروری ہے؟

☆☆ گورنمنٹ ہائی اسکول میرپور خاص میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، جب وہاں کے دو گلوکار بھائیوں مسعود رانا اور جاوید رانا اور پرانی منزل چاکی پاڑہ کے رہائشی محمد یوسف جو ہم جماعت بھی تھے، سے قربت رہی اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ سے قبل اُن کے ساتھ مل کر میں نے بیسیوں فلمیں دیکھیں۔ سندھ مسلم آرٹس کالج، کراچی کے زمانۂ طالب علمی (1966-67ء) میں نذیر بیگ (اداکار ندیم) اور انور بیگ (ندیم کے چھوٹے بھائی) جو مصور تھے اور اسٹیج کے اداکار محمد ایوب کا ساتھ رہا۔ ندیم اُن دنوں بطور گلوکار فلمی دنیا میں قدم جمانا چاہتے تھے لیکن جب فلم میں آئے تو بطور اداکار اُن کی پہلی فلم "چکوری" پلاٹینم جوبلی کر گئی جب کہ محمد ایوب، جو ہم سب میں نمایاں تھے، ساری زندگی ٹیلی ویژن پر چھوٹے چھوٹے رول ہی کرتے رہے۔ اس زمانے میں میں نے ایک میوزک اکیڈمی جوائن کی ہوئی تھی، جہاں سے پیانو اور بینجو بجانا سیکھا۔ اس کے بعد آرٹس کونسل کراچی کی مصوری کی کلاسز میں حاضری دی۔ میری، انور بیگ اور علی لطیف کی تصویروں پر مشتمل نمائش (1966ء) بہ اہتمام ہر ماشل کا افتتاح فیض احمد فیض مرحوم نے کیا تھا۔ 1968ء میں اسلامیہ کالج سکھر کی شام کی کلاسوں میں ممتاز احمد خان میرے ہم جماعت تھے جنہوں نے بعد میں اردو ناول کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند فضیلت حاصل کی۔ 8 جنوری 1969ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے استقبال کے بعد اُن پر اٹک کرپشن کا جھوٹا مقدمہ بنانے کی سزا کے طور پر جب ڈی آئی جی سندھ نے میرے والد کی جواب طلبی کی تو انہوں نے ملازمت پر لعنت بھیجی اور بطور ڈی ایس پی قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر بہ عمر پچپن برس اپنے آبائی علاقے میں پلٹ آئے۔ میں نے جب گورنمنٹ کالج کیمبل پور سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی

اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا تو تخلیقی امکانات سے پُر بہت سے لوگ ملے
شاعر شبیر شاہد، افسانہ نگار احمد جاوید، ڈرامہ نگار یونس جاوید اور ناصر بلوچ۔ لاہور
ہی میں خالد اقبال یاسر سے پہلی ملاقات ہوئی وہ ایک شاعر ہیں جو ڈھاکہ سے
آئے ہوئے تھے۔ پھر زوالِ ڈھاکہ کے بعد اُدھر کا ایک نوجوان شاعر راج منیر
بھی لاہور آ نکلا۔ ہم سب لوگوں نے حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں اپنی ابتدائی
چیزیں پڑھیں۔ 1972ء میں اورینٹل کالج لاہور کے چار دیگر بے روزگار
نوجوانوں امجد نیازی، حسن رضوی، جون سلطان اور انوار الحق نیازی کی طرح
میں نے بھی فلمی دنیا میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر قسمت آزمائی کی۔ لاہور میں
سجاد باقر رضوی جیسے محقق استاد سے ملاقات ہوئی جنہوں نے جینے کا قرینہ سکھایا۔

☆ اُردو ادب بالخصوص افسانے سے آپ کی محبت کے اسباب بھی
ہمارے لیے اشتیاق کا باعث ہوں گے؟

☆☆ افسانہ لکھنے کی طرف مجھے ایک سابق بیوروکریٹ سندھی ادیب
لائے۔ 1966ء میں ہم لوگ نواب شاہ میں تھے اور میں میٹرک کا طالب علم۔
اسکول کے قریب پارک میں تھا نورداس چندانی صاحب سے ملاقات ہوئی اُس
وقت میں کرشن چندر کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ چندانی صاحب نے پوچھا ٹیگور کو
پڑھا ہے؟ تو میں چکرا گیا۔ اس وقت تک میں نے پریم چند، راجندر سنگھ بیدی،
کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار اور اے
حمید کو پڑھ رکھا تھا۔ آنہ لائبریری سے نسیم حجازی، ایم اسلم اور دت بھارتی کے
ناول بھی پڑھ رکھے تھے پر ٹیگور کا نام میرے لیے نیا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے: ٹیگور کو پڑھو۔ کل تمہارے لیے
ٹیگور کی ایک کتاب لاؤں گا۔ انگریزی میں ہے لیکن اُسے انگریزی ہی میں پڑھو
گے تو مزا آئے گا۔ اگلے روز انہوں نے مجھے "The hungry
stones" لادی۔ میں انگریزی کے مضمون میں کمزور تھا پر کوشش کر کے چند
افسانے پڑھے اور ٹیگور کے رومانی افسانوں کی طرز پر "دل کا زخم" کے عنوان
سے ایک افسانہ لکھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی تنہائی کو افسانوں کی صورت لکھنا
شروع کر دیا۔

☆ آپ کے افسانے کس سکول سے وابستہ ہیں اور کس حد تک اس کی
پیروی کے قائل ہیں؟

☆☆ میں فرانسیسی زوال پذیر تخلیق کاروں سے بہت متاثر ہوں۔ یوں
محسوس ہوتا ہے جیسے Huysman نے اپنے ایک تخلیق کردہ افسانوی کردار
اِنتی کے ساتھ بٹھا کر میری تربیت کی ہے پھر یہ کہ مجھی پر بعث کو داد دے تخلیق
کھلا جس کی ایک ادا ہے: اپنی ماں کو اس وقت بیچ جب وہ جوان ہو۔

☆ تخلیق کار بالخصوص افسانہ نگار کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور ذاتی
تجربات کا ہونا اور کس تناسب سے ہونا ضروری خیال کرتے ہیں؟

☆☆ صرف افسانہ ہی کیا کوئی بھی کام کیا ہو جیسے جوتے گانٹھنا تو دیکھنا
یہ ہوگا کہ ہم سے پہلے کس کس نے اور کیسے جوتا گانٹھا۔ یوں ذہن کے کام کا
جائزہ ہی لینا پڑے گا اور سٹریا کے کام کا بھی۔ پھر معاصرین کا کام دیکھنا پڑے
گا اور غور کرنا پڑے گا کہ اگر ہم اُن جیسا ہی کام کرنے پر قادر ہیں تو وہ ہمارے
کرنے کا کام نہیں۔ اور اگر اس سے ذرا بہتر کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے کوشش کر
دیکھیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ کو تو میں رکھتا ہوں اس ذیل میں۔ باقی رہ گیا ذاتی
تجربہ تو وہ ہے ہمارا خاص مسئلہ۔ مطالعہ ہمیں اچھے اور خراب کام میں تمیز کرنا
سکھاتا ہے مثال کے طور پر پریم چند کا شاہکار افسانہ "کفن" پڑھ لینے سے ہم
پورے پریم چند تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس کے لیے ہمیں پورا پریم چند پڑھنا پڑے
گا تب اُن کے بہت سے خراب کام میں سے "گلی ڈنڈا" جیسے لاجواب افسانے
بھی ہمیں پڑھنے کو مل جائیں گے۔ مشاہدہ کی دو صورتیں ہیں ایک اجتماعی دوسرا
شخصی۔ پہلی صورت تو یہ ہوئی کہ جیسا کچھ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی یا راجندر سنگھ
بیدی نے ہمیں اپنے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر دکھانے کا اہتمام کیا۔ اس
کام کے مطالعے کے دوران ہمیں مشاہدے کا اشتراک دکھائی دے گا۔ کم و بیش
ویسا کچھ ہم نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہو گا لیکن کچھ کونے کھدرے ایسے بھی تو ہوں
گے جہاں تک ہماری رسائی اُن کے ذریعے ممکن ہوئی۔ اسی طرح ہمیں محسوس ہو
گا کہ کچھ مقامات اُن سے اَن دیکھے رہ گئے۔ ایسے ہی نادیافت گوشوں تک
رسائی ہم سے مخصوص رہے گی۔

☆ اگر آپ کے بارے میں اس رائے کو درست تصور کر لیا جائے کہ
تکنیک کے ذریعے آپ ادب میں داخل ہوئے ہیں تو ہم آپ کی تکنیک اور اس کے
ماخذ کی بابت ضرور جاننا چاہیں گے؟

☆☆ بے شک، افسانہ "زمین جاگتی ہے"، "ایک نیا نگار مخطوط" اور
"تار پر چلنے والی" موضوع کی نہیں تکنیک کی عطا ہیں۔ سجاد باقر رضوی صاحب
نے "گم شدہ کلمات" میں شامل افسانے پڑھ کر یہ رائے قائم کی تھی۔ اس سے قبل
وہ انتظار حسین کی کتاب "آخری آدمی" کا دیباچہ لکھ چکے تھے۔ یہ بات اُنہوں
نے انتظار حسین کے بارے میں نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ داستان اور صوفیانہ
ملفوظات سے اخذ کردہ تکنیک تو معلوم تکنیک تھی جس کے بہترین نمونے "باغ و
بہار"، "توتا کہانی"، "آرائشِ محفل"، "قصہ گل و صنوبر"، "مذہبِ عشق" اور
"فسانۂ عجائب" میں بکھرے پڑے تھے البتہ انتظار حسین کے ہاں ایک اضافی
چیز تھی اُن کے افسانوں کا علامتی نظام۔ جبکہ "گم شدہ کلمات" میں شامل مُغل
تہذیبی پس منظر کے حامل افسانوں میں سن ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں
بالخصوص سُریندر پرکاش، بلراج مینرا، انور سجاد، خالدہ اصغر اور بلراج کومل کے
باہم متناسب تکنیکی تجربات کے ساتھ ساتھ میری سینمائی اور مصوری کے دیرینہ
تجربے کے ساتھ فلم میکنگ کا عملی تجربہ بھی شامل تھا۔ میرے افسانوں میں یہ ایک

طرح سے ردِعمل تھا اُس بندھے ٹکے فارمولا افسانے کا جو ہم سے پہلے لکھا گیا اور اُس افسانے کی تاریخ میں اُردو تنقید کے شمس نقاد رطب اللسان رہے۔ اِس ضمن میں مزید وضاحت کے لیے یہی کہہ سکتا ہوں کہ راجندر سنگھ بیدی کے دو افسانے: "جوگیا" اور "متھنا" کے انجام سے اتنی طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم کاغذ پر قلم سے رنگ بکھیر کر پینٹنگ بنا سکتے ہیں اور بیدی ہی کے دو افسانے: "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "ایک رات قلم چورستے کے پاس کیا ہوا" کے انجام سے "نقشِ چغتائی" از عبدالرحمٰن چغتائی کی نگر کی تصویر بنائی جا سکتی ہیں۔ جدید میں نے افسانے لکھتے ہوئے قدیم و جدید حقیقت پسند اور تجریدکار پینٹرز کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھا اور کیمرہ کی آنکھ کو بھی استعمال کیا۔

☆ آپ کے افسانوں کی بابت realistic کا تاثر کہاں تک دُرست ہے کیا آپ حقیقی زندگی کے واقعات کو افسانہ بناتے ہیں؟

☆☆ میرے افسانوں میں آپ کو حقیقت پسندانہ اپروچ بھی ملے گی جیسے افسانہ: "کاتک کا اُدھار"، "سید زنوں"، "بابیٹو رگھو کا آخری گیت"، "جاگیرداری کی حرمتی" اور "لالہ جسونت کی حویلی" میں بلکہ کہیں کہیں ایسا بھی ہوگا کہ حقیقت ہی ایک تجربہ میں داخل گئی جیسے "تھدایاں لانی" اور "نیند میں چلنے والا لڑکا" یا "منطقی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا" میں پھر کچھ افسانے تجریدی بھی ہیں جیسے "دھوپ کا چہرہ" اور کچھ علامتی بھی جیسے "زمین جاگتی ہے" یا "گناہ کی مزدوری" کے بیشتر افسانے۔

☆ آپ پر ناسٹلجیا کا شکار ہونے کا الزام کس حد تک دُرست ہے؟ کیونکہ آپ کی کہانیوں میں گزرے زمانوں کا ذکر شدت سے پایا جاتا ہے

☆☆ یہ دُرست ہے کہ میرے افسانوں میں ناسٹلجیا موجود ہے اور وہ میرے تخلیقی عمل میں پیش قدمی کرتے ہوئے لشکر کے پیچھے یا مہمیز کے طور پر آگے بڑھتا ہے لیکن میرے تخلیق کردہ کرداروں کے دُکھ بہت حد تک یا مکمل میرا نہیں میرے بزرگوں کا ہے جس کا جنم میرے اجتماعی لاشعور سے ہوا۔ میرے افسانوں میں موجود ناسٹلجیا کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے محض ایک ہجرت کے تجربے تک محدود نہیں۔ میں اپنے پیچھے رہ گئے گلی محلے یا بزرگوں کے مدفن یاد نہیں کرتا میرے افسانوں کا ناسٹلجیا تہہ در تہہ کئی بیتے زمانوں سے متعلق ہے۔ شاید ماورا النہر سے متعلق بھی جبکہ ملک ترکستان اور حالیہ ازبکستان کا وہ علاقہ میں نے تا حال نہیں دیکھا، جو میرے بزرگوں کا وطن تھا۔

☆ آپ کے ہاں ٹھٹھہ اِس قدر Dominate کیوں ہے؟

☆☆ علاقہ ٹھٹھہ میرے جدِ امجد مرزا احمد بیگ کو ہندوستان میں دربارِ اکبری سے عطا ہونے والی جاگیر کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو انگریز عملداری کی لوٹ کھسوٹ اور بعد ازاں اُن کے دلالوں میں کی جانے والی بندر بانٹ سے بچ گیا۔ اسی چھوٹے سے تہذیبی منظر کو میں قدیم وقتوں میں آباد دیکھتا ہوں، جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا لیکن اُس علاقے میں کوئی تھا جو آج بھی میرے خون اور اجتماعی لاشعور میں بولتا ہے۔ میں اپنے افسانوں میں اُسے ڈھونڈنے نہیں نکلتا نہ اُسے یاد کرتا ہوں لیکن وہ آ جاتا ہے میرے حال میں میرے ماضی کو شامل کرنے کے لیے۔ یوں میں اپنے افسانوں میں اُس کے گناہ اور ثواب own کرتا ہوں۔

☆ آپ کے ہاں جاگیردارانہ نظام سے لڑائی اِس شدت سے لڑی جا رہی ہے کہ اُس پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے؟

☆☆ اپنے آبائی علاقہ ٹھٹھہ اور اندرون سندھ میں جاگیردارانہ نظام کا میں نے بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے جاہل اور نام نہاد مرشد کے حضور پیری مریدی کے سلسلوں میں مرید کے عجز اور بے بسی کا مشاہدہ بھی کیا۔ میرے ددھیال میں راہ چلتے مسافروں کو اجازت نہ تھی کہ وہ مثل حویلی کے قریب سے گزرتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گزر جائیں۔ یہ میں بیسویں صدی کے نصفِ اول کی بات کر رہا ہوں۔ ہالہ کے نواح میں ایک چاردیواری ایسی بھی دیکھی جس میں بڑے بڑے جنگلی کتوں کو محض اس لیے رکھے گئے تھے کہ نافرمان ہاری کو بطور سزا اُس چار دیواری میں دھکا دیا جائے اور جنگلی کتے اُسے اپنی نکیلی داڑھوں کے ساتھ اُدھیڑ کر رکھ دیں۔ میں نے ایسے کئی علاقے دیکھے جہاں نکاح کے بعد لڑکی پہلی رات جاگیردار کی حویلی میں گزارتی تھی اور اگلے دن معمولی سے تحفے تحائف کے ساتھ اُس کی رخصتی ہوتی تھی۔ اندرون سندھ میں یہ بھی دیکھا کہ پیر آف پگارا کے حکم کے تحت فجا ہنجبرو جیسے بڑے بڑے لاکھوں نے حُر ہونے کے ناطے خود کو گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے کر دیا کہ پیر سائیں راضی رہیں۔

☆ آپ شہزادہ دارا شکوہ کے اتنے مداح کیوں ہیں؟

☆☆ شہزادہ دارا شکوہ متوازن مذہبی فکر اور تنگ نظری کے مقابل آزاد خیالی اور علم کا استعارہ ہے۔ بابر سے شاہجہاں تک مغل فرمانرواؤں نے بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستان میں جو بھائی چارے کی فضا قائم کی تھی اُس کا تسلسل دارا شکوہ ہی قائم رکھ سکتا تھا۔ اِس خطے کی یہی ضرورت تھی جسے ہم آج محسوس کر سکتے ہیں۔ اِسی لیے میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ دارا شکوہ کے نام کیا۔

☆ آپ کے بارے میں روایت سے انحراف کا تاثر کب اور کیوں کر قائم ہوا اور آپ نے کن کن روایات سے کن اسباب کی بنا پر انحراف کیا؟

☆☆ 1972ء میں ہی منیر نیازی صاحب نے یہ بات حلقۂ اربابِ ذوق (دہلی) کے ایک اجلاس میں میرا ایک افسانہ: "افسانہ و افسوں کی وحشی رات" سُن کر کہی تھی۔ میرے خیال میں لفظوں کو اُن کے مروجہ معنی میں برتنے جیسا احمقانہ فعل اور کوئی نہیں۔ کہانی پن کی آرزو میں حقیقت پن کی پیروی کرنا اور اپنی داخلی نفسی کیفیات کو دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں میں تعبیر کرنا گھاٹے

پن کے سوا کچھ نہیں۔

☆ کیا طویل جملے آپ شعوری طور پر تراشتے ہیں اور اُن سے کیا تاثر دینے کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ زبان دانی کا معیار کیا ہے؟ اور وہ کسوٹی کیا ہوگی جس پر کس کر یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ کون شخص زبان داں ہے اور کون نہیں؟ اس ضمن میں جانچ پرکھ کے کئی ایک معیارات ہیں۔ شاعری میں الگ اور نثر میں الگ۔ جن میں سے ایک معیار یہ بھی ہے کہ کون ہے جو جملہ اسلوبیاتی روایت سے آگاہ ہے اور تو اتر زبان کی نزاکتوں پر نظر رکھتے ہوئے اپنے افکار کو مختلف اور کئی انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق و مزاولت بہم پہنچاتا ہے۔ اس حوالے سے بڑا نثر نگار وہی شمار کیا جائے گا جو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے پر قادر ہو لیکن "اور"، "اگر"، "لیکن" وغیرہ کا کرنہیں۔ ہمارے ہاں "چھوٹے چھوٹے" اور "رواں جملوں" کی تحسین بے جانے بڑے بڑے نثر نگار پیدا نہیں ہونے دیے جبکہ عالمی ادب میں اسی خوبی کے پیشِ نظر فرانسیسی ناول نگار ستاں دال کے ناول "The Scarlet and Black" کے بارے میں ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ اس ناول کی نثر کا مرتبہ شاعری سے بلند ہے۔ بالخصوص طویل جملہ تراشنے کے ضمن میں ستاں دال سے بھی بہتر امثال ہمیں گستاؤ فلابیئر کے ناول "Madam Bovary" میں مل جاتی ہیں۔ اُردو ادب میں اس نوع کا کام کرنے والوں کا شمار ایک ہاتھ کی انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں پہلا نام تو میں اپنے دادا استاد محمد حسن عسکری کا لوں گا۔ اُن سے پہلے محمد علی ردولوی نے یہ کام کیا۔ اس خصوص میں قاضی عبدالستار کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہ تو ہوئے اُردو فکشن کے گریٹ ماسٹرز۔ اس فقیر کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ ایسا ہی اپنے معاصرین سے الگ کر کے دکھائے۔ یہ کام آپ جیسے اہلِ نظر کے لیے ہے۔

☆ اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے کہ آپ کی کہانی موضوع کی بجائے بکھرے ہوئے امیجز کا مجموعہ ہے؟

☆☆ مجھ پر یہ الزام الحمدللہ نہیں خوش رکھے ڈاکٹر سید محمد عقیل کا لگایا ہوا ہے جنھوں نے "لالہ جسونت کی حویلی"، "جا گیا بابا کی عرضی"، "کالی زبان"، "کا تک کا اُدھار"، "نیند میں چلنے والا لڑکا" غرضیکہ میرے بہت سے افسانے نہیں پڑھے۔ میرے ہاں جہاں امیجز کا استعمال ہوا ہے جیسے افسانہ "زلزلے کے موسم"، "دھوپ کا چہرا" اور "سونے کی مہر" تو ڈاکٹر صاحب نے یا تو اُن افسانوں کو سرسری لیا۔ پھر یہ کہ ان افسانوں کا زمانۂ تحریر 1974ء سے قبل کا ہے جب اس نوع کے افسانے کوئی لکھتا نہیں تھا۔ سریندر پرکاش نے البتہ اسی دور میں افسانہ "کالی ہوتی لڑکیاں" لکھا تھا اور ہمارے ناقدین نے اس افسانے کو بھی بکھرے ہوئے امیجز کا افسانہ قرار دیا تھا۔

☆ آپ کے ہاں ماضی اور حال کی نسبت مستقبل سے بے اعتنائی کیوں برتی جا رہی ہے؟

☆☆ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ فقیر بیک وقت اپنے ماضی اور حال میں زندہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کہ میرے حال پر ماضی سایہ فگن ہے چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ کام لکھنے والے سے نہیں بھی ہوتے۔ براہِ راست بات کرنا اور آج کی خبر سے افسانہ گھڑ لینا میں نہیں کہتا کہ آسان کام ہے لیکن اگر وہ مشکل کام بھی ہے تو میں اُس کام کے کرنے سے معذور ہوں۔ سعادت حسن منٹو نے یہ کام مسلسل اور نہایت خوش اسلوبی سے کیا لیکن منٹو اور بیدی کے مابین ہونے والا وہ مکالمہ تو آپ نے سن ہی رکھا ہوگا۔ جب منٹو نے بیدی سے یہ کہا تھا کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے وقت سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے رہتے ہو تو بیدی نے اس کے جواب میں یہی کہا تھا کہ تسلیم لیکن تم نہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، نہ لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد سوچتے ہو کہ کیا لکھ دیا؟ آج کو لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لانگ فکشن میں یہ کام بڑوں بڑے گریٹ ماسٹرز نے کیا ہے۔ مجھ میں اتنا دم نہیں۔ ایک ناول مارچ 1987ء سے لکھنے کا جتن کر رہا ہوں کئی سو صفحات لکھ کر کاٹ چکا ہوں۔ جو بچا ہے صرف سو صفحات کا مواد ہے جس کا نصف حصہ "مکالمہ" کراچی میں "کارکی گلی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس ناول میں آج کو لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مستقبل اُس میں سے بھی غائب ہے۔ اللہ بڑا تخلیق کار ہے۔ مستقبل لکھنے پر وہی قادر ہے۔ مجھ ایسے کیا بیچتے ہیں صاحب۔

☆ آپ کے اوپر ابہام اور مشکل پسندی کے الزامات کن لوگوں کی جانب سے لگائے گئے اور کیوں لگائے گئے؟

☆☆ یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ میں مشکل پسند ہوں اور ابتدا ہی سے تربیت یافتہ قاری کے لیے لکھتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سادہ بیانیہ کا عادی قاری میرے لکھے کو مبہم قرار دیتا ہے۔ اس میں قصور اُس معصوم قاری کا نہیں، ہمارے ناقدین کا ہے جنھوں نے قاری کی تربیت کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ ہمارے ہاں محمد حسن عسکری صاحب کے بعد گنے چنے ناقدین ہی ایسے ہیں جنھوں نے شارح کا فریضہ بھی ادا کیا جیسے شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، وارث علوی اور مہدی جعفر۔ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا کیا وہ کم ہے۔ وہ زیادہ کام کر سکتے تھے، جو نہیں کیا۔ سلیم احمد اور شمیم احمد نے ایک آدھ افسانہ نگار کے علاوہ افسانہ پڑھا ہی نہیں۔ وزیر آغا نے سب سے زیادہ نئے پرانے افسانہ نگاروں کو پڑھا لیکن کلیہ سازی کرتے ہوئے اُس کا اطلاق کم لوگوں پر کیا۔ ریاض احمد زیادہ تر کوششیں رہے چنانچہ اتنا کام کر سکتے تھے نہیں کیا۔ یہی صورت جمیل جالبی کی رہی۔ مظفر علی سید اس خصوص میں سب سے زیادہ کام کر سکتے لیکن مجلسی تنقید زیادہ کی اور لکھا کم۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معصوم قاری محض سادہ

علامتی افسانے نے جو ادبا اس کے لیے مرزا حامد بیگ ہی کیا اُس سے پہلے کی نسل کے چیدہ افسانہ نگار جیسے سریندر پرکاش بلراج مینرا اور انور سجاد بھی شمار کیے گئے۔

☆ آپ اپنے اس خیال کی وضاحت فرمائیے کہ افسانہ کا نیا منظر اسلوب کے حوالے سے اپنے عصر کی روایتوں کی نمائندگی نہیں کرتا؟

☆☆ اس حوالے سے میں آپ کی خدمت میں الگ سے ایک مضمون ارسال کر رہا ہوں۔

☆ ایک اختلافی رائے آپ کی بابت یہ بھی ہے کہ آپ کو جدید اردو افسانے سے چڑ ہے؟

☆☆ دیکھیے ہر بیس برس بعد لکھنے والوں کی فصل تیار ہوتی ہے۔ اُن میں سے کچھ باقی رہ جاتے ہیں اور زیادہ تر معدوم ہو جاتے ہیں۔ یوں جو لوگ "جدید" کہلاتے ہیں وہ صرف بیس برس بعد ہی "قدیم" شمار ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ "نیا" اور "جدید تر" کا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس نوع کی تخصیص غلط ہے۔ گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی میں "جدید تر" کی اصطلاح بھی چلنے لگی۔ اقبال ساجد، جنہیں فوت ہوئے بھی ایک زمانہ ہوا، نے سوال اٹھایا تھا: عہد جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟ صاف ظاہر ہے اُن کا اشارہ اپنی جانب تھا۔ وہ خود کو عہد جدید تر کا نمائندہ شمار کرتے تھے اور اس نوع کے اشعار اُن سے سرزد ہوتے تھے:

کیا ملا اقبال ساجد جدت فن بیچ کر
اب گزر اوقات کر داغوں کا تخم بیچ کر

جب کہ اردو ادب میں جدیدیت ایک طاقتور تحریک رہی ہے اور اس کے لٹریری آرگن "شب خون" الٰہ آباد اور "اوراق" لاہور تھے۔ جدیدیت کی طاقت اور غلغلے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے ناشاعر اور نا افسانہ طراز جدیدیت کی بارات میں دھما چوکڑی مچانے کا باعث بنے۔ میں کہتا ہوں انہوں نے افسانہ کہاں؟ یہ سب کچھ کیا ہوگا صرف افسانہ نہیں لکھا۔ یہ بے بصری کا باعث۔

☆ اردو افسانے کی بابت ایک رائے یہ ہے کہ شاعری کی نسبت افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا ہے جب کہ دوسری رائے یہ ہے کہ آج کا افسانہ زوال کا شکار ہے بلکہ بعض لوگ تو اردو کے کچھ شاہکار افسانوں کو چربے سے بھی تعبیر کرتے ہیں؟

☆☆ عالمی معیار سے واقف لوگ ہی کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا ہے۔ میں نے عالمی معیار کے افسانوں کی انتھالوجیز دیکھی ہی نہیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں سے چند افسانوں کو اُردو دنیا سے متعارف بھی کروایا ہے یہ سوچ کر کہ لوگوں کو پتا چلے کہ عالمی معیار ہوتا کیا ہے۔ ایک افسانے کا ترجمہ تو مظفر علی سید مرحوم کے اسی پراجیکٹ کے لیے کیا تھا جسے "افکار" کراچی کے خاص نمبر کی صورت شائع ہوا تھا۔ وہ افسانہ تھا ایبے کوبل کا "زندگی حسین ہے" اور افسانہ نگار کا تعلق سیرالیون سے۔ اتنے چھوٹے سے پسماندہ ملک کا انتہائی افسانہ نگار۔ دوسرا افسانہ تھا عالم شاہ خان کا، جسے ہندی سے خود اُن کی مدد کے ساتھ ترجمہ کیا۔ عنوان تھا: "کرائے کی کوکھ"۔ ان دو افسانوں کو پڑھ کر کون کہے کہ ہم اُن جیسا افسانہ لکھ لیتے ہیں۔ اردو افسانہ زوال کا شکار ہے یا نہیں تو اس ضمن میں عرض ہے کہ 1940ء تا 1960ء کی دو دہائی کی مدت بے شک اردو افسانے کے سنہری دن تھے جب راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، غلام عباس، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی نے شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ اُن سنہری دنوں کا مقابلہ صرف 1960ء تا 1980ء کی دو دہائی کی مدت سے کیا جا سکتا ہے جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، منشا یاد، اسد محمد خاں، سلام بن رزاق، احمد جاوید، مسعود احمد داؤد، قمر احسن، علی تنہا، شوکت حیات اور ساجد رشید نے شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ 1980ء تا 2006ء کی دو دہائی کی مدت میں سامنے آنے والوں کے کام سے مجھ سے زیادہ آپ واقف ہیں۔ رہی مغرب سے چربہ اتارنے کی بات تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا اشارہ کس کی جانب ہے۔ غلام عباس کے افسانے "آنندی" مطبوعہ: "ادب لطیف" لاہور سالنامہ 1942 کو ڈاکٹر احسن فاروقی نے چیخوف کے ایک افسانے کا چربہ قرار دیا تھا اور یہ بات میں نے ثابت کی کہ ایسا نہیں تھا۔ دیگر افسانوں کی نشان دہی ہو تو اس پر بات ہو سکتی ہے۔

☆ اردو تنقید بالخصوص افسانے کی بابت آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ 1980ء کے بعد لکھا جانے والا افسانہ قارئین کی توجہ سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ گزشتہ دو دہائیوں میں سامنے آنے والے افسانہ نگاروں کی ناتوانی ہے۔ بہت محتاط ہو کر بھی بات کریں تب بھی یہ کہنا پڑے گا کہ نئے آنے والے ساٹھ اور ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں سے کچھ الگ کام کرنے میں ناکام رہے۔ حق میں لکھا جائے یا خلاف، زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔ اب نہ حق میں لکھا جا رہا ہے نہ خلاف۔ ہم لوگوں نے تو ستر کے دہے میں خوب گالیاں کھائیں۔ بہت کچھ لکھا گیا ہمارے خلاف اوراق میں۔ ہمیں برا بھلا کہنے والوں میں اُردو کے شمس فاروقی بھی تھے اور ممتاز مفتی، عصمت چغتائی اور اشفاق احمد جیسے نمایاں افسانہ نگار بھی۔ ممتاز مفتی نے پنڈی گروپ کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ٹکڑے جوڑ کر ایک افسانہ تیار کیا اور ہم لوگوں کی موجودگی میں حلقۂ ارباب ذوق، اسلام آباد میں ہم سب کا مضحکہ اڑانے کی خاطر پڑھا بھی۔ عصمت چغتائی نے ہمارا مضحکہ ایک مضمون "سانپ کے کوے" لکھ کر اڑایا۔ اشفاق احمد نے یہ کہہ کر افسانہ نگاری ترک کر دی کہ یہ لوگ جو لکھ رہے ہیں، اب کیا لکھیں۔ نئے لوگ کچھ نیا کر کے دکھائیں گے تو زیر بحث بھی آئیں

گے۔ استاد اختر انصاری اکبرآبادی نے "نئی قدریں" کے خاص نمبر کے لیے مصطفیٰ زیدی مرحوم سے نیا کام طلب کیا تو جواب میں زیدی مرحوم نے لکھا "بھائی ہمارا تو پُرانا ہو گیا۔" اب یہ نئے لوگوں کا مسئلہ ہے کہ "نئی قدریں" کو کس طور اپنے کام کی جانب متوجہ کرواتے ہیں۔

☆ آپ کا اکثر انڈیا جانے کا اتفاق رہتا ہے۔ اگر آپ سے دونوں ملکوں کے تخلیقی ادب کی بابت رائے دریافت کی جائے تو آپ کس علاقے اور صنف کو اولیت دینا پسند کریں گے؟

☆☆ پاکستان اور بھارت، دونوں اطراف میں نمایاں کام کے حامل سینئرز لگتا ہے کہ بہت کم رہ گئے۔ جو رہ گئے انھوں نے افسانہ لکھنا چھوڑ دیا جیسے پاکستان کے احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی، اے حمید، احمد شریف، انور سجاد اور بھارت کے قرۃ العین حیدر، جوگندر پال اور قاضی عبدالستار ایک مدت سے خاموش ہیں۔ متحرک افسانہ نگاروں میں پاکستان کے انتظار حسین، حسن منظر، مسعود اشعر، خالدہ حسین، اسد محمد خاں، رشید امجد، منشا یاد، احمد جاوید اور علی تنہا ہیں۔ اُدھر بھارت میں اقبال مجید، سلام بن رزاق، نیّر مسعود، حسین الحق، شوکت حیات، ساجد رشید، غضنفر، سید محمد اشرف اور خالد جاوید متحرک ہیں۔ یوں افسانہ کی سطح پر تو دونوں اطراف کے پلڑے برابر دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کی صنف میں قرۃ العین حیدر کا جواب نہ پاکستان میں پہلے تھا، نہ اب ہے۔ اُن کا موازنہ تو خود بھارت ہی کے عالمی شہرت یافتہ ناول نگاروں وکرم سیٹھ اور اروندھتی رائے سے بھی نہیں بنتا۔ آخر الذکر دونوں اُن کے جوڑ کے نہیں...... بھارت کے قاضی عبدالستار کا تاریخی ناول لکھا گیا۔ کاش! وہ "شب گزیدہ" ہی کی لائن پر آگے بڑھتے لیکن تاریخ سے پہلو بچا گئے۔ باقی بھارت اور پاکستان کے ناول نگار ایک ہی سطح کے ہیں۔ تنقید کے میدان میں بھارت کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔ اُدھر اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، وارث علوی، شمیم حنفی، مہدی جعفر اور قاضی افضال حسین کا کام اہمیت کا حامل ہے جب کہ پاکستان میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، مظفر علی سید اور شمیم احمد کے بعد تنقید کے میدان میں بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ تحقیق کی سطح پر بھارت میں قاضی عبدالودود، مالک رام اور امتیاز علی عرشی کے بعد بھی بہت سے لوگ موجود ہیں اور اُن کا کام اہمیت کا حامل ہے جیسے تنویر احمد علوی، گیان چند، رشید حسن خاں اور خلیق انجم جبکہ ہمارے ہاں بہ شمول مشفق خواجہ مرحوم وہ سطح دکھائی نہیں دیتی۔ غزل اور نظم کی دو اصناف ایسی ہیں جن میں پاکستان بلاشبہ بھارت سے بہت آگے ہے۔ پاکستان کے احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، منیر نیازی، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شہزاد احمد، نذیر قیصر، انور شعور، صابر ظفر، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، شاہدہ حسن، ابرار احمد، علی محمد فرشی، لیاقت علی عاصم، اجمل سراج، خواجہ رضی حیدر، اختر عثمان، افتخار جاوید، اکبر معصوم، احمد نوید، قمر رضا شہزاد، رفیق سندیلوی اور گیت نگاری میں ناصر شہزاد کا جوڑ بھارت میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ اُدھر شہریار، محمد علوی اور بشیر بدر کے بعد عرفان صدیقی جیسا صرف ایک اہم شاعر پیدا ہوا اور وہ بھی اُٹھ گیا۔ آپ بیتی کی صنف کا انحصار لکھنے والے کی شخصیت کی اہمیت پر ہوتا ہے۔ بھارت میں ان دنوں گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتی زیر بحث ہے تو اِدھر احمد بشیر اور ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتیاں۔ یہ الگ قصہ ہے کہ احمد بشیر نے "دل بھٹکے گا" کو بطور ناول پیش کیا۔ باقی رہ گئیں سفرنامہ، ناٹک، ماہیا وغیرہ اصناف تو ان میں بطور ادبی صنف کے دونوں اطراف میں نہ امکانات پہلے تھے، نہ اب ہیں۔

☆ دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان محبت اور دوستی کی جو لہر آئی ہوئی ہے، اُس کے زیر اثر اردو زبان دانوں کی بہتری کے لیے دونوں ممالک کے اہلِ قلم کس طرح کا مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں؟

☆☆ دونوں ہمسایہ ممالک کے بیچ دشمنی کے طویل سلسلے کو جس طرح اہلِ قلم دوستی میں تبدیل کر سکتے ہیں، اُس طرح دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کر کے اور لکھے ہوئے لفظ کے ذریعے کتب کا تبادلہ اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

☆ سمندر پار کے اہلِ قلم سے مستقبل میں کس طرح کی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ نیز یہ کہ عالمی منظر نامہ میں اردو زبان و ادب کا مستقبل آپ کے خیال میں کس نوعیت کا ہے؟

☆☆ سمندر پار کے اہلِ قلم دو طرح کے ہیں۔ پہلی قسم چند مستند لکھنے والوں کی ہے جیسے احمد مشتاق (امریکہ)، نجم الحسن رضوی (دوبئی)، گیان چند (امریکہ)، تقی عابدی، جتیندر بلو، ساقی فاروقی اور یاسمین گل۔ دوسری قسم نئے لوگوں کی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی اپنی شناخت بنانی ہے لیکن یہ طے ہے کہ ادب تخلیق کا کام ہے اور اس کے لیے متعلقہ فضا کا ہونا ضروری ہے۔ جب کہ ان کی فضا صرف ادبی جرائد کے صفحات پر شائع شدہ لفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ سمندر پار بسنے والوں نے اپنی پہچان کا ایک ذریعہ یہ بھی خیال کیا ہے کہ پاکستان یا بھارت سے جو دو نمبر شعراء کے مشکوک گروپ اُدھر جاتے ہیں، اُن کی باج گزاری کی جائے۔ یہ تاثر اب عام ہو چلا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ان مشکوک گروپس کی اپنی ادبی حیثیت مشکوک ہے اور ان کا ادبی دنیا میں تادیر رہنا ممکن نہیں تو وہ اپنے سمندر پار معتقدین کو کیا دیں گے؟

☆ آپ کے تخلیقی سفر کی بابت آپ کے احساسات کیا ہیں نیز مستقبل کی آرزوئیں، ارادے اور خواہشات کیا رُخ لیے ہوئے ہیں؟

☆☆ فراق گورکھپوری کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

تجھ سے اے دریائے محبت! پار کوئی بھی پا نہ سکا
کیسے کیسے ڈوب گئے گو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے

# افسانے کا نیا افق

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

ماضی کے تین بڑوں منٹو، بیدی اور غلام عباس کے ہاں واقعات، کردار اور اُن کے اعمال و افعال ترتیب میں منطقی طور پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ کا عمل اور ردِ عمل عمومی حالتوں کے مطابق متعین ہوتا ہے اس طرح ہر واقعہ دوسرے واقعے کے ساتھ مربوط ہو کر ایک اکائی کی شکل مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ واقعات و اعمال کی ترتیب اتنی صاف اور منطقی ہوتی ہے کہ ان پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تمام معروضات اپنے مقررہ مقامات پر متمکن نظر آتے ہیں اس لیے ذہن نہایت پھرتی سے تمام اعمال و اشکال کو قبول کرتا اور محفوظ کرتا چلا جاتا ہے۔

منٹو، بیدی اور غلام عباس کی تمام تر توانائی کہانی کہنے کے فن میں صرف ہوتی ہے۔ یہ وہ سیاست بخوبی جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنی توجہ کہانی سے ہٹا دی تو اُن کے فن کا سارا ڈھانچہ ہی اکھڑ جائے گا۔ ان افسانہ نگاروں نے اسی پیرائے میں لازوال فن پارے تخلیق کیے ہیں البتہ منٹو نے روایتی افسانے کی توڑ پھوڑ بھی خوب کی۔ اس نے خاص طور پر روایتی زبان کو افسانے سے نکال باہر کیا اور افسانے کے لیے ایک غیر روایتی زبان کا باطن تلاش کر کے ایک نئی لسانی دنیا کی بنیاد رکھی۔ افسانے کی زبان مخصوص لسانی حرمتوں سے نجات پا گئی۔

اس کے بعد کہانی ایک سطح پر آ کر رک گئی اور یوں نئی کہانی کے وجود کی تلاش شروع ہوئی۔ اس سخت کٹھن تلاش میں دو رویے خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انتظار حسین نے اسے داستان کی نئی صورت دیتے ہوئے علامتی رنگ دیا۔ اس کا منبع پرانی داستانوں کا ماحول تھا۔ دوسری طرف انور سجاد نے اپنے عہد کا پُرآشوب کرائسس کو استعاراتی پیرائے میں پیش کیا۔ یہاں کہانی میں معروضات، بے ترتیب، بے اصول، بے رنگ ہو کر نمایاں ہوتے ہیں اور معروضات کی ترتیب اور واقعات کا تعین خود قاری کو کرنا پڑتا ہے۔

مرزا حامد بیگ اور اس کی نسل کے افسانہ نگار کہانی کے اسی پس منظر سے طلوع ہوئے ہیں۔ انھوں نے داستان اور افسانے کو Gestalt کی صورت دے کر اسے استعاراتی اور علامتی رنگ میں پیش کر کے افسانے کے ایک نئے افق کا تعین کیا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں ان نوجوان افسانہ نگاروں کے ہاں تنوع زیادہ ہے اور نئے تجربات انھی سے نئی افسانوی روایت متعین ہوتی ہے۔

روایتی کہانی کا ٹریٹ منٹ ایک فولڈر ٹریٹ منٹ تھا۔ جس میں کہانی کی پوری وحدت کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے جو واضح، شفاف حوالوں سے سامنے آتی ہے جب کہ مرزا کی کہانی میں بنیادی طور پر "ان فولڈر ٹریٹ منٹ" ہے جس میں داخل ہونے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ہر شے واضح اور شفاف دکھی جا سکے۔ اس لیے قاری کو خود مشقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ کہانی کے پورے تانے بانے، پھیلاؤ اور سمٹنے کے تخلیقی عمل پر گہری نظر رکھنا پڑتی ہے۔ ایک ایک منظر، ایک ایک امیج اور ایک ایک علامت اپنے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ہر امیج جب آئندہ نمودار ہو تو اس کا پس منظر سامنے رہے۔ پھر مرزا حامد بیگ کی کہانی کی ساخت یوں ہوتی ہے کہ اس میں مختلف امیجز بنتے چلے جاتے ہیں، جن میں صورتِ حال کی توسیع موجود ہوتی ہے۔ ہر امیج دوسرے امیج میں گم ہونے میں مصروف ہوتا ہے اور بالآخر یہ سارے امیجز مل کر کہانی پیدا کرتے ہوئے ایک اکائی میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہ "ان فولڈر ٹریٹ منٹ" ہے جس میں کہانی کا قاری کو مشقت کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اگر قاری مشقت کے لیے تیار ہے تو پھر کہانی کا تانا بانا آہستہ آہستہ دھندلاہٹوں سے نکل کر ایک مجموعی منظر سامنے لائے گا۔ بصورتِ دیگر مرزا حامد بیگ کی کہانی بکھرے ہوئے امیجز کا مجموعہ ہے ایک ایسا مجموعہ جو عام قاری کو سوائے تحیر اور پریشانی کے اور کچھ نہ دے سکے گا۔ اس کا ان فولڈر ٹریٹ منٹ یا یوں کہیے کہ غیر روایتی طریق کار قاری کے لیے صدمات کا موقع فراہم کرتا ہے وہ متحیر ہوتا ہے کہ یہ کس آب و ہوا کی کہانیاں ہیں، ان کے اشخاص، مقامات اور اعمال کی بے ترتیبی آخر کیوں ہے؟ ان سے واضح اور شفاف اشکال کیوں نہیں بنتیں؟ منٹو اور غلام عباس کی کہانی تو صاف تھی، کھلی کتاب تھی۔ لہٰذا مرزا حامد بیگ کی کہانیوں کا رخ کرنے کی سکت وہی قاری کر سکے گا جو ان نئی کہانیوں کے ٹریٹ منٹ سے روشناس اور مانوس ہو گا اور ذہنی مشقت کے عمل کے لیے مکمل طور پر تیار ہو گا۔

میں خود نئی کہانی کا ادنیٰ طالب علم ہوں اور ان کہانیوں تک میری رسائی میری ذہنی مشقت کے عمل کے ذریعے ہی ممکن ہو سکی ہے۔ پہلے پہل میں خود ان کہانیوں کی دہلیز پر کھڑا رہا۔ ان کے ٹریٹ منٹ سے واقف ہونے پر از خود ان کے دروازے کھل گئے اور کہانیوں کی پوری شکلیں، دھندلاہٹوں سے نکل کر کھلے منظر میں میرے سامنے آتی چلی گئیں۔

مرزا کے ہاں "گمشدہ کلمات" کی بعض کہانیوں میں حقیقت اور فینٹسی ایک دوسرے سے گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ حقیقت کی تصویریں ایک دم فینٹسی میں بدل جاتی ہیں۔ ایک حقیقی صورتِ حال ہے، کردار اپنے اعمال کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اُن کا عمل اور ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے جو وہ ایک خاص سمت میں سفر کرتے ہیں جو حقیقی دنیا کا سفر ہے۔ اس میں حقیقی معروضیات کا حقیقی ماحول ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کی ساخت حقیقت کے معلوم شدہ رستوں پر

چل رہی ہے اور کہانی اپنی اٹھان میں اسی راستے پر چل کر کسی انجام کے کنارے جا لگے گی۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ حقیقی معروضیات کی ٹھوس دنیا سے کہانی اچانک اپنا سفر تبدیل کر لیتی ہے اور ایک لمحے میں اس کا رخ فینٹسی کی سمت مڑ جاتا ہے۔ یوں کہانی میں فینٹسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر ایک فینٹسی ہی کی حالت میں کہانی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔

حقیقت سے فینٹسی کا یہ سفر اتنا تیز ہوتا ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ایک نامعلوم سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور معروضات اور کردار خواب وخیال کی دھند میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ تمام شکلیں خواب آلود ہو جاتی ہیں اور خاموشی وسکون کی کیفیت مسلط ہو جاتی ہے۔ مثلاً "مغل سرائے" جس کے حقیقی منظر میں شام کے گہرے سایوں میں دو انسانی سائے حرکت کر رہے ہیں۔ یہ ایک نوجوان جوڑا ہے۔ پس منظر میں فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار ہے جس سے ہوا کی سرسراہٹ بہتی ہوئی آ رہی ہے۔ ان کے گرد کھلنڈرے نوجوانوں کی ایک ٹولی ہے۔ یہ نوجوان جوڑا بھاری سفری تھیلے اٹھائے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نظر آتا ہے۔ یہاں تک تو کہانی میں حقیقت کی دنیا تھی جب کہ اس کے فوراً بعد فینٹسی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دو گھوڑوں والی بگھی، چمکتے بھالوں کو سنبھالے قزلباش آنیوں کا مغل جیسا دروازہ، استقبالیہ کی نیم روشن محراب، سرخ دھبوں والی راہداری، تختے کے ڈھیر تک چلے تختے اور تنگ غلام گردشیں.... حتیٰ کہ کہانی کی لڑکی حقیقت سے فینٹسی میں اتر جاتی ہے۔

مرزا کی کہانیوں میں ایک شعری رویہ بھی ہے، جو اس کی کہانیوں میں تاثر کے پھیلاؤ کو تیز کرتا ہے۔ اس عمل میں وہ لفظوں کی ٹولیاں بنا کر تمثالیں تخلیق کرتا ہے، جو تمثالیں کہانی کے مجموعی عمل میں نہایت موثر تصویری منظر بناتی ہیں۔ ان تصویری چوکھٹوں سے جو اشکال ابھرتی ہیں وہ فسانے کے فریم میں محض بناوٹ، سجاوٹ یا کشیدہ کاری کے طور پر نہیں بنائی گئیں۔ ان کا مقصد زیب و سجاوٹ نہیں ہے بلکہ یہ تمثالیں تو کہانی کے اساسی حصے معلوم ہوتی ہیں جنہیں الگ کرنے سے کہانی کی اساسی ساخت ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ ان تمثالوں کو ہم کہانی کے دروبست میں خون کی طرح محسوس کرتے ہیں جو رگوں میں تیرتی چلی جاتی ہیں اور ہر ہر قدم پر اپنی قدروقیمت کا احساس دلاتی ہیں۔ ان تمثالوں کا مطالعہ کہانی کے طریقہ کار میں دیکھیے:۔

"وہ دونوں تلچھٹ اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔" (مغل سرائے)

"کمرے کی کھڑکی میں شام جھکی ہوئی تھی۔" (دھوپ کا چہرہ)

"ناریل کے پیڑ جھکے اور چاند خوشبو کی گاڑھی دھند سے اوپر اٹھا۔"
(سرسوتی اور راج ہنس)

"خوشبو کی گاڑھی دھند میں وہ بے حس وحرکت، چاند کو اوپر اٹھتا دیکھتی رہی۔" (سرسوتی اور راج ہنس)

"گمشدہ کلمات" کی بیشتر کہانیوں میں جنس ایک بنیادی استعارے کے طور پر ابھرتی ہے۔ "کہانی کا بڑھاپا" میں ننھے مرزا کی پندرھویں سالگرہ ہے اور وہ ادا کی چھوٹی سوتی لڑکی ننھے مرزا کی خواہش ہے۔

"نیند میں چلنے والا لڑکا" کا المیہ یہ ہے کہ: "خوبرو مغلوں کی عورتیں گھروں سے باہر قدم نہیں دھرتیں" اور پھر کہانی کے کردار مغلوں کے گھر آنے والی بارات پر بڑے مرزا کے حکم سے باز کی طرح جھپٹ جاتے ہیں، بارات کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ اس کہانی میں بڑی سفاکیوں کے حوالے سے مغلوں کی جعلی حرمت کے خلاف احتجاج بھی ہے۔

"مو سے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ خود تو شہزادی بیوی سمیت چار چار گھروں میں ڈال رکھیں، مجرے کرائیں، کوٹھوں پر جائیں اور بیٹیاں جوان ہوں تو ان کے زر زیور دے کر بلوا کرا کے چھوڑیں۔"

ان جعلی حرمتوں کے باعث کہانی کی دلہن سرخ انگارہ بنی رہ جاتی ہے۔

فسانہ "گمشدہ کلمات" میں نیرکا اور اس کی ماں فرسودہ جاگیردارانہ روایت کے اسیر ہیں۔ عیش باغ کی ایک گمنام راہداری میں بڑے مرزا مغل بہادر نے نیرکا کی ماں کو اکیلے دیکھ کر دوسری انگڑائی نہیں لینے دی۔ وہ ان راہداریوں سے نکل کر رات کی تاریکیوں میں ان حویلیوں اور سپاہیوں کی کوٹھریوں تک جا پہنچی۔ نیرکا انہی تاریکیوں سے برآمد ہوا تھا اور ساری عمر انہی میں بھٹکا رہا۔ اس کہانی کا دوسرا رخ وہ ہے جہاں نیرکا ایک سرد رات میں مغل بیگمات میں سے ایک بیگم کی کھڑکی میں روشنی کا گولا گرتا جاتا ہے اور دوسرے لمحے مدھم زرد روشنی میں بھاگ نکلتا ہے اور اسی کھڑکی میں ایک دوسرے شخص کو پھینک جاتا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں جنسی حرمتوں کی یہ ایک داستان ہے، جس کا راوی خود نیرکا ہے۔

جنس کے یہ سارے رویے ایک زوال یافتہ تہذیب کے کرداروں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں ماضی بھی ہے مگر ماضی المیہ نہیں بنتا۔ مرزا حامد بیگ کے کردار ماضی وحال میں یکساں طور پر گھومتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ماضی و حال اور وقت ومقام "اوورلیپ" ہوتے رہتے ہیں۔ تخیلہ مسلسل ماضی میں کھنچا ہے مگر فسانہ نگار ماضی کا اسیر نہیں۔ وقت اور مقام اس کی مٹھی میں بند رہتے ہیں اور وہ ان دونوں زمانوں کو لٹو کی طرح گھماتا رہتا ہے۔

"گمشدہ کلمات" میں شامل بعض کہانیوں کی ساخت مکمل طور پر علامتی ہے۔ "مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا" اسی نوع کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں سرخ دھبوں والا کمرہ، چار مشکی گھوڑوں والی بگھی اور اٹھے ہوئے کالروں میں اکڑی ہوئی گردن ایسی علامتیں ہیں جو استحصالی طبقات کی نمائندگی کرتی ہیں

جب کہ گلیر سے اترنے والا انسانی بچہ مظلوم طبقے کی علامت ہے۔ استحصال کرنے والے طبقات علامتی طور پر کسی فرد کو پکڑ کر یا غی چوڑ قرار دے دیتے ہیں اور پھر اس پر الزام عائد کر کے اُسے گلیر پر چڑھا دیتے ہیں۔ کہانی میں ایک بوڑھی ماں کا بیٹا گلیر پر دکھایا گیا ہے اس کہانی کی دوسری علامتیں ایک نئی سمت کا بھی تعین کرتی ہیں جیسے بوڑھی عورت کے ہاتھ میں ایک گڑوی ہے جس میں گڑ ہے یہ گڑوی ایک نئی سمت کی علامت بن جاتی ہے اس علامت کے حوالے سے آج کے انسان کا آشوب تحریر کیا گیا ہے جو جبر وتشدد کے استمراری شکنجوں میں کسا ہوا ہے یہاں اس استمراری شکنجے سے نکلنے کی بشارت موجود ہے یہ بشارت مستقبل سے وابستہ نہیں ہے بلکہ حال کے کرائسس سے متعلق بشارت ہے جس میں آج کا نیا انسان طلوع ہو رہا ہے یہ نئے انسان کی علامت اس کہانی میں اس وقت مکمل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جب نیا انسان ریشم کی ڈوری کے سہارے اپنی سرزمینوں پر اترتا ہوا دکھایا گیا ہے

"چوراستے کے بیچوں بیچ ایستادہ گلیر کے پیچھے ڈوبتی گہرے نیلے آسمان میں سرخ رنگ گل ہو رہا تھا۔ اور رات کے کسی پہر گلیر کے اوپر کے سرے سے دھیرے دھیرے ریشم کی ڈوری تھامے بے قابو بڑیوں کا پنجر نیچے مخمل کی گھاس کے تختوں کی جانب اتر رہا تھا" (مٹی کی کٹوروں والی گلی کا پھیرا)

ان کہانیوں کی ساخت میں روایت سے انحراف کے متعدد پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً مرزا نے کہانی کے بیان میں واقعات، کردار اور اعمال سے جو اشکال بنائی ہیں اُن کی ساخت روایتی کہانی سے بالکل مختلف ہے کردار اور واقعات بتدریج ارتقا کی طرف نہیں بڑھتے۔ کہانی کا روایتی طریق یہی ہے جس میں یہ عناصر باہمی طور پر مل کر کہانی مرتب کرتے ہیں۔ جب کہ مرزا کی کہانیوں میں طریقہ واردات تبدیل ہو گیا ہے یہاں واقعات، کردار اور اعمال کا روایتی ارتقا نہیں ہے کہانی کی پوری ساخت بالعموم ایک منظرنامے پر ہے "ایکنت.....یا نگار مخفوظ" ایک ایسی ہی کہانی ہے جو تمام کی تمام منظرنامے پر مشتمل ہے کہانی کار کی نظر منظرنامے کی جزئیات پر پڑتی ہے اور وہ تمام جزئیات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے یہ منظرنامے اور جزئیات کا بیان ہی کہانی کی ساخت کا اُس کے تیور متعین کرتا ہے اس کہانی میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کردار اور واقعات ہیں جو سرسری سے وقوعے پذیر ہوتے ہیں لیکن کہانی کی بُنت میں ہم اُن کے ایک منظرنامے کی شکل ہی دیکھتے ہیں۔ کہانی کار کی نظر ایک بڑے لینڈ سکیپ پر ہے جس میں بے شمار معروضات ہیں وہ کہانی سے متعلق معروضات کا انتخاب کر کے انھیں منظرنامے میں شامل کرتا چلا جاتا ہے اس صورت سے کہانی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے لیکن یہاں روایتی کہانی کی طرح واقعات کا ارتقا نہیں ہوتا، بلکہ منظرنامہ تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے جس سے کہانی کے افق میں مسلسل توسیع ہوتی رہتی ہے مرزا کی کہانیوں کا انجام روایتی کہانیوں کے منطقی انجام سے انحراف کرتا ہے انجام کی اس منزل پر وہ واقعات، کردار یا اعمال کو نہیں سمیٹتا جس سے پرانی کہانی روایتی انجام کو پہنچتی تھی۔ بلکہ انجام کے پر وارد ہوتے وہ منظرنامے کے معروضی مناظر پر انحصار کر کے اپنی بات کہتا ہے اور یوں وہ کہانی کا پورا تاثر اس منظرنامے میں سمیٹ لیتا ہے اُس کے اس طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے دو ایک افسانوں کے اختتامیے ملاحظہ ہوں:

"ادھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دو سنری تھیلے دھرے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اونچی صراحی جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے سے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جن کے توڑ قریبے سے سجے رکھے تھے" (مخمل سرائے)

"اس وقت اس عورت کے سامنے پالکی کا ٹوٹا ہوا جنگلہ دنیا کی سمت جھول رہا ہے جہاں سے نیچے نہیں دیکھا جاتا۔ بہت نیچے نوکدار چٹانیں اور گہری کھائیاں ہیں اس جگہ دنیا کا پاٹ کم چوڑا ہے اس لیے پانی بہت تیز چلتا ہے" (ایکنت یا نگار مخفوظ)

"نیچے تنگ گھاٹیوں میں گھپ اندھیرا گہرے سانس لے رہا تھا۔ ہریالی کے تخت پر وہ شیروں کی چھال والا اب تک اسی طرح سو رہا تھا اُس کے دھیا گرنے کو نزم ہوا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی اور وہ ایک ہی کنج میں کروٹ لیے دنیا جہان سے بے پروا تھا" (نیند میں چلنے والا لڑکا)

اب آیئے ذرا ان اختتامیوں کا زمانہ دیکھتے چلیں۔ "مخمل سرائے" اور "نیند میں چلنے والا لڑکا" دونوں میں ماضی ہے لیکن ان میں نہ ختم ہونے والی ایک استمراری کیفیت موجود ہے جب کہ "ایکنت یا نگار مخفوظ" میں زمانہ حال ہے مگر اس زمانہ حال میں بھی استمراری صورت حال ہے

مرزا کے ہاں زمانہ کا تصور استمراری ہے وقت اُس کی کہانیوں میں پانی کی لہروں کی طرح بہتا ہے یہ لہریں ماضی سے حال کی طرف اور حال سے ماضی کی طرف لوٹتی رہتی ہیں۔ مستقبل اس کے ہاں نامعلوم ہے اور وقت کے سارے کرائسس انہی دو زمانوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ان کرائسس کو منطقی انجام کے سپرد کرنے کا عادی نہیں ہے وقت کی لہریں یہ کرائسس پیدا کرتی ہیں اور مرزا اُن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کرائسس کے جتنے حصے کا وہ خود مشاہدہ کرتا ہے اُس کی شہادت لفظوں میں منتقل کر دیتا ہے وہ کرائسس کو ختم ہوتے ہوئے نہیں بلکہ اس کو آگے بڑھتا ہوا دیکھتا ہے یوں اس کی کہانی کے اختتامیے ایک لامتناہی یا استمراری زمانے کی طرف بہتے چلے جاتے ہیں جیسا کہ زندگی بہتی چلی جاتی ہے

میرے خیال میں یہ اختتامیے زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں کہ زندگی کے بہاؤ کو پیش کرتے ہیں اور اس بہاؤ کی کوئی منزل نہیں ہے ابد کی طرف بڑھتا ہوا ایک سفر ہے جس پر سارے کردار رواں دواں ہیں اور مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے یہ کردار بھی ابدیت کی منزلوں کے مسافر ہیں اور ان کی واردات نہ ختم ہونے والی ہے

# گم شدہ کلمات

جیلانی کامران

مرزا حامد بیگ کے افسانوں کے مجموعے "گم شدہ کلمات" نے کہانی
کے ضمن میں ایک غور طلب پہلو کی نشاندہی کی ہے۔ کہانی خواہ رات کو کہی جائے
خواہ دن کو اس کا کہانی ہونا زائل نہیں ہوتا۔ کہانی کہانی ہوتی ہے۔ کہنے والا کہانی
کہتا ہے سننے والا سنتا ہے۔ اور کچھ عرصے سے ہم بھی ناولوں، مختصر کہانیوں اور
افسانوں کے ذریعے کہانی سن رہے ہیں۔ اور جب خوش ہوتے ہیں تو پرانی
کہانیوں کے اختتام پر کہا ہوا فقرہ تو شاید نہیں دہراتے کہ جیسے شہزادہ اور شہزادی
کے دن پھرے یوں ہم سب کے دن بھی پھریں، بلکہ یہ مشہور جملہ ادا کرتے ہیں
کہ کہانی کہنے والے نے اپنے عہد کی کہانی بیان کی ہے اور ہم نے بھی اپنے عہد
کی کہانی سنی ہے۔ البتہ یہ ضرور اتنا عام ہوا ہے کہ ہم ہر شے میں اپنے عہد کو تلاش
کرتے ہیں اور یوں ادب اور عہد کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا۔ ادب عہد اور
عہد ادب بن گیا ہے جو دل زمانے کے اندر دھڑکتا ہے وہی کہانی کے اندر دھڑکتا ہے
کہانی کہنے والا کوئی نئی بات، کسی نئی دنیا، کسی بہتر شے اور کسی بہتر دنیا کا ذکر نہیں
کرتا۔ وہ ہمیں سنی سنائی، جانی پہچانی، افسردہ افسردہ کہانی سناتا ہے۔ عہد کی
ترجمانی کرتا ہے۔ ظلم کی بات کرتا ہے۔ جبر و استحصال کی بات کرتا ہے اور سننے
والا جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہہ اٹھتا ہے۔ یہ سب مجھے پہلے سے معلوم ہے؟ تم نے
کون سی نئی بات کی ہے

اس موقع پر کہانی کہنے والا چپ نہیں رہ سکتا۔ فوراً جواب دیتا ہے
کہ اس نے علامتی کہانی لکھی ہے۔ انسان کو فطرت کے لازوال منظر کے قریب تر
کیا ہے۔ علامتوں اور زبان کی مدد سے فضا تیار کی ہے یعنی ایک نئی دنیا تخلیق کی
ہے۔ کہانی کہنے والا تکنیک کا ذکر کرتا ہے۔ کہانی سننے والا کہانی کی طلب کرتا ہے
اور جب زمانہ اور عہد دونوں کے درمیان مشترک ہو جاتے ہیں تو صرف تکنیک
باقی رہ جاتی ہے۔ علامتیں، زبان، طرز بیان، آغاز، اختتام ہوتے والا شاید یہی
وجہ ہے کہ کہانی کا سامع زیادہ تر خاموش رہتا ہے، ساری گفتگو افسانہ نگار کرتا
ہے

اگر اس انداز میں مرزا حامد بیگ کی کہانی کو دیکھا جائے تو زیادہ
سے زیادہ تعریف صرف یہی کی جا سکتی ہے کہ مرزا حامد بیگ کی کہانی تجرباتی ہے
اور تکنیک کے مسئلے سے تعلق رکھتی ہے اور اگر ہم ساخت و بافت کے حوالے
سے اس کی دنیا میں داخل ہونا چاہیں تو علامتوں کو آپس میں جوڑ کر پیدا کر سکتے
ہیں۔ اور اس محنت سے تھکن بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ تکنیک کے ذریعے ادب
میں داخل ہونا کسی طور جمالیاتی تاثر کی ضمانت نہیں دیتا کیونکہ تکنیک ادب نہیں
ہے اور ادب اپنے پیغام کے بغیر نامکمل ہے۔ مرزا حامد بیگ کی کہانی کیا کہتی
ہے؟ اس آواز کو سننے کی آرزو شاید تکنیک کے ذریعہ مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی....

مرزا حامد بیگ کے افسانوں کے مجموعے سے جو کہانی پیدا ہوتی
ہے وہ یادوں اور یادداشتوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسے انسانی حافظے کی کہانی ہے
جس پر گزرے ہوئے وقتوں کی یادیں لکھی ہوتی ہیں۔ ایک خاص افسانے میں یہ
یادداشتیں قدیم ترین ہیں اور سرسوتی اور دراوڑ نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ افسانہ
ایک ایسا رشتہ ہے جو یادوں کے زندہ اور قائم ہونے کی تصدیق کرتا ہے اور اس
طرح کہانی کے اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے
کہ اس مجموعے کی کہانی انسانی حافظے کے ساتھ وابستہ ہے اور یادوں کے ساتھ
متعلق ہے تو انسانی حافظے کی پیدائش اور یادوں کی قدر و قیمت سے اُن افسانوں
کی پہچان ممکن ہو سکتی ہے جو ان افسانوں کو آباد کرتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں
زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یادداشتیں زیادہ دور جا کر ٹوٹ جاتی ہیں
اور حافظہ کمزور پڑ جاتا ہے اور جو باتیں یاد کے پردے پر آتی اور گزرتی ہیں ان
میں ظلم، افواہ، غرور، نخوت، پرستی اور قبائلی عصبیت کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔
اور جب یہ صورتیں گم ہوتی ہیں تو ایک حویلی، ایک گاؤں اور ایک گھرانہ سامنے آتا
ہے اور ہم ایک مغل حویلی، مغل سرائے اور مغل یادداشت کو اپنے روبرو دیکھتے
ہیں۔ شاید اسی لیے افسانہ نگار نے اپنی کہانی کو مغلوں کے گم شدہ کلمات کی کہانی
کے لیے استعمال کیا ہے

ان افسانوں میں مغلوں اور مغل گھرانے کی یادداشتوں پر اتنی
شدت سے اصرار ہے کہ ہم یہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ افسانہ نگار
مغلوں کے ذریعے ہم تک کوئی بات پہنچانا چاہتا ہے مگر یہ بات اس نوعیت کی نہیں
جیسی خواجہ حسن نظامی کی کتابوں میں اور خاص کر "غدر کی ماری شہزادیاں" میں
دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات تاہم الگ ہے کہ ان افسانوں میں شہزادوں اور
شہزادیوں کے الفاظ بھی بے دریغ استعمال ہوئے ہیں۔ مغل گھرانے کی یادداشتوں
کے ساتھ ساتھ ان لفظوں کا استعمال یادداشتوں کو تقویت دیتا ہے مگر جیسے ہی یہ لفظ
یادداشتوں میں ابھرتے ہیں ان سے ظلم، بیٹیوں کو کنوارہ رکھنے کی رسم، رعایا کی کم
سن بچیوں کو وقت بسری کے لیے بلانے کا شوق اور شریکوں اور حلیفوں کو قتل
کرنے کی روایت اور مجبور مگر قبول صورت لڑکیوں کے لیے ناجائز اولادوں کا
بوجھ برداشت کرنے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جو مغل گھرانہ مرزا حامد بیگ کی
کہانی میں نمایاں ہوتا ہے وہ اپنی یادداشتوں کے سفر میں ایسے ہی مقامات سے
گزرتا ہے اور ان مقامات کے علاوہ اس کی یادداشت میں کوئی روشن مقام دکھائی
نہیں دیتا۔

...... ہم اپنی فکری تنقید میں اس کیفیت کو جاگیردارانہ نظام کی
زوال کیفیت کا نام دیتے ہیں۔ اس مغل گھرانے کی یادداشت میں سفر کرتے

ہوئے ہم اُس مزاج تک ضرور پہنچتے ہیں جو حاکمانہ مزاج ہے اور اپنے گروہی شعور میں ثابت قدم ہے۔ مگر اس کے پرے اس مزاج کو کسی طرح محسوس نہیں کر سکتے جو افسانوں کے اس مجموعے کے سرورق پر حمید بابری سے تعلق رکھتا ہے اور جو دارا شکوہ کے نام انتساب سے بھی واضح ہے۔ جس انداز سے سرورق کی تصویر اور دارا شکوہ کے ساتھ انتساب کو مجموعے سے متعلق کیا گیا ہے اس سے کہانی کے مغل گھرانے اور مغل دور کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا رشتہ ضرور پیدا ہوتا ہے اور یہ رشتہ تاریخ اور گھریلو یادداشتوں کا رشتہ ہے۔ اور اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کس طرح گھرانے تاریخ سے کٹ سکتے ہیں اور تاریخ سے کٹ جانے کے بعد ان کی کیا صورت ہو جاتی ہے۔ بابر سے دارا شکوہ اور اورنگزیب تک مغلوں کا جو انسانی تصور ابھر کر آمد ہوتا ہے اس میں بادشاہت نہ صرف ایک حاکمانہ منصب ہے بلکہ بادشاہت اپنے کاروبار مملکت کے ذریعے اپنے زمانے میں قیادت کا فرض بھی انجام دیتی ہے۔ جس مغل گھرانے کی صورت گری مرزا حامد بیگ نے کی ہے اس میں وہ مغل یادداشت سرے ہی سے مفقود ہے جو انسانی قیادت کے گرد قائم ہے اور جس کے لیے مغل بادشاہ مشہور ہیں۔ مگر کیا ہر مغل اس یادداشت کا حصہ ہے جو بابر اور دارا شکوہ اور اورنگزیب کی زندگیوں سے مرتب ہوتی ہے؟ اور اگر ایسا ہونا درست نہیں ہے تو پھر مغل ہونے میں فخر کی کون سی بات ہے؟ اور اگر مغل ہونے میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے تو پھر اپنے آپ کو مغل کہنا اور مغل کہلوانا کیوں ضروری ہے؟ انسان نام سے نہیں پہچانا جاتا ہے اور اس کہانی کا مغل گھرانہ یادداشتوں کے سفر میں اس کام سے بے بہرہ کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کے لیے مغل اپنے زمانے میں مشہور تھے!

مرزا حامد بیگ نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے اس سے بادی النظر میں صرف ایک گھرانہ سامنے آتا ہے مگر حقیقت میں برادری کا تصور ابھرتا ہے۔ وہ گھرانہ مغل برادری کا گھرانہ ہے اور کوہ صغیر میں بسے ہوئے بے شمار مغلوں کی اور ان کے گھرانوں کی نمائندگی نہیں کرتا تاہم اپنی پہچان کے لیے مغل ہونے اور نسل کے اعتبار سے مغلیٔ ہونے کو نمایاں طور پر قبول کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نسلی دائرے سے انسان اپنی پہچان کے لیے بائیولوجی کا استعمال کرتا ہے۔ خون اور نسل اور انسانی بائیولوجی کا جغرافیہ اس مغل حویلی کے باشندوں کو اپنی شناخت فراہم کرتا ہے۔ پرانی اور دیہات کی مروجہ زبان میں اس شناخت کو برادری کہا جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے موضوع کے انتخاب کے ساتھ کہانی کے لیے جو نیا دروازہ کھولا ہے وہ برادری کے ذہن اور مزاج کے اندر سفر کرنے کی ابتداء کرتا ہے۔ تاہم افسانہ نگار نے برادری کے صرف ایک محدود دائرے کی نقاب کشائی کی ہے۔ صرف ایک حویلی، ایک مقام اور ایک گھرانے کی اور جس شے کو برآمد کیا ہے وہ یہ ہے کہ مغل ہونا بے معنی ہے اور نسلی طور پر مغل ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لفظوں کو قبول کر کے لفظوں کے مطابق جینا اور شے ہے یادداشتوں سے کٹ کر لفظ صرف ظلم ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ لفظ خواہ اس سے برادری مراد ہو یا قوم یا تہذیب مراد ہو یادداشتوں سے لفظ بنتا ہے۔ اور زندہ یادداشت وہی ہے جو انسان کو اس کے مقام سے آگے بڑھنے کا ارادہ دیتی ہے اور انسان کو نئے انسان میں بدلتی ہے۔

تاہم اگر اس موضوع کو سنجیدگی سے قبول کیا جائے اور اسے کہانی میں استعمال کرنے کی ابتدا کی جائے تو اُردو کہانی ایک عمرانی عمل کی پہچان میں یقیناً کامیاب ہوگی۔ ہمارے ادب نے ادب کی پرانی تعریفوں کا سہارا لے کر جس حقیقت نگاری کو آج تک پیش کیا ہے، اس سے ماحول کی ستم رانی ہی ظاہر ہوئی ہے اور معلوم ہوا ہے جیسے انسان معصوم ہے۔ سارا ظلم ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ ماحول ہی اصل میں ظالم ہے اور جابر ہے۔ لیکن ہمارے ادب نے آج تک یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ انسان کہاں ہے اور کہاں رہتا ہے اور جو ماحول ہے وہ کس شے کا بنا ہوا ہے۔ شاید ہم آج تک اپنے انسان کو دریافت کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کا انسان برادریوں کا باشندہ ہے۔ اور برادری کا علاقہ اسے پہچان فراہم کرتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ نے جس ادبی رویے اور فکشن کے طریق کار کو اپنایا ہے اور جس موضوع کو چھیڑنے کی ابتدا کی ہے اگر اسے برادریوں کے عمرانی عمل کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا جائے تو ہمیں اپنے انسان کی پہچان کا درست علم ہو سکے گا۔ ہم کیوں الف ب اور جیم ہیں؟ کیا محض علاقے اور نسل کی چھاپ ہی نے ہمیں الف ب اور جیم بنایا ہے یا یہ کہ ہم اچھی یادداشتوں کے امانت دار ہیں اور الف ب اور جیم کی صورتوں میں ان امانتوں کو نسل در نسل انسانوں کے درمیان واپس لاتے ہیں۔ یا ہم مغل حویلی کے مکینوں کی طرح صرف اندھیروں ہی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اور اپنی بائیولوجی ہی کو اپنی اولادوں میں منتقل کرتے ہیں۔ اردو کہانی کے لیے مرزا حامد بیگ نے جس موضوع کو اختیار کیا ہے اسے اختیار کرنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے باطن میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ کیا اس باطن میں ہنوز انسان باقی ہے؟ اور اگر انسان ہی نابید ہے تو انسانوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب انسان گم نام ہو جاتا ہے تو انسانوں کا جنگل ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک جنگل کی طرف مرزا حامد بیگ نے اشارہ کیا ہے۔ مگر کیا صرف جنگل ہی کی خبر دینا کہانی کا کام ہے؟ انسانوں کے اعتبار سے گم ہو جانے کا خطرہ جیسا مرزا حامد بیگ کی کہانی کے مغلوں کو درپیش ہے ویسا ہی خطرہ ہم سب کو ہے کہ کہیں ہم انسان کے طور پر باقی نہ رہیں۔ اور ان اچھی یادداشتوں سے بے خبر ہو جائیں جو آدمی کو زمان و مکان میں زندہ رہنا سکھاتی ہیں۔ اور زمین پر ایک اچھی دنیا کو پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ مرزا حامد بیگ نے عمرانی عمل کو کہانی کے لیے بطور موضوع استعمال کر کے ہمارے لیے سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک نیا زاویہ قائم کیا ہے۔

# مرزا حامد بیگ کے افسانے

علی تنہا

اُردو افسانے کے معاصر منظرنامے میں سوقی مال بہت ہے۔ نری واقعیت پسندی، ذوقی نارسی یا سطحی رومانیت کے گھڑے گھڑائے فارمولے نے افسانے کی روایت میں کوئی کمال نہیں دکھایا۔ علامت اور تجرید کو بھی بیشتر مقامات پر نئی حسیت اور تخلیقی استعمال کے باب میں نہیں برتا گیا کیا ہمارے تہذیبی اور عمرانی شعور کو اپنے اندر پچانے والے ایک ہمہ گیر تجربہ بنانے کی ہمت یا توہم میں نہیں یا شہرت کی چڑیا اُڑ جانے کے خوف سے اسے گہرا تخلیقی تجربہ نہیں بنایا جا سکا۔

انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے بعد اب کہیں جا کر مروجہ اسالیبِ فن کے برخلاف کہیں کہیں نفسی، انسانی کی نئی واردات کی مثالیں قمر احسن اور مرزا حامد بیگ کے ہاں ملنے لگی ہیں۔

مرزا حامد بیگ اُردو کا وہی ذہین افسانہ نویس ہے، جس نے بیشتر مقامات پر حقیقت نگاری کی جہتوں کو استعمال کر کے علامت کی ساخت معاصر سماجی انتشار سے وضع کی ہے اور ایک مسخ سوسائٹی کے خدوخال کو اسی تباہی کے عالم میں دکھایا ہے جس کی وہ متقاضی تھی۔ اس نے تکنیک، پلاٹ، کردار اور لسانی حوالوں کو مربوط کر کے اس کے آہنگ کو منظم کیا ہے۔ یہ تنظیم جس پیچ پیرے اور تہرے اس کے ہاں بعض افسانوں میں ہویدا ہوتی ہے وہ اس کے craftmanship کی واضح دلیلیں ہیں۔ اسالیب کی ساخت جس یکجائیت، رومانویت یا کرختگی زبان کے بجائے اس نے بیانیہ کی داستانوی طرز سے کام لیا ہے اور ہیئت و موضوع کے تقاضے کے مطابق مختصر فقروں، آزمودہ اور برتے ہوئے structure میں زبان سے نئی روح پھونکی ہے اور بصارت کے راستے سے افسانے کے طرزِ احساس میں بصیرت پیدا کی ہے۔ اس لئے انسانی وجود پر زخموں کے صد ہا برسوں کے نشانات، اس کی تخلیقی تراش میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی مثالیں 'انتظار گاہ'، 'گناہ کی مزدوری'، 'سانڈنی سوار' اور 'راجہ کی سواری' میں نمایاں ہیں۔ ان افسانوں میں داستانوی اسلوب کے شعار سے کام لے کر جس غیر جذباتی، نظم اور تخلیقی فعالیت سے ایک منطقی وحدت پیدا کی گئی ہے یہ اس انفرادیت کی بہتر مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں انتظار حسین کی طرح محض ناسٹلجیا کے گرد ہی اس کا سفر نہیں رہا بلکہ بدلی ہوئی سیاسی و عمرانی فضا کی تعبیر میں قصص و حکایات کے بجائے تمثیل سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں معنویت کے اُن ذولیدہ رخوں کی نفی کرتا ہے جس کی مثال بطراز میں راشد امجد اور سمیع آہوجہ رہے ہیں۔

حامد بیگ نے اپنے کرداروں کی سائیکی، عمرانیات اور تہذیبی شخصیت کو سمجھا ہے اور اسی لئے افسانوی اخلاقیات کے کلیشے کو توڑا ہے کیونکہ اس کا متحرک اور حساس تجربات کو کشادگی سے قبول کرنے والا ذہن اس امر سے آگاہ ہے کہ کسی تجربے کو آخری تجربہ سمجھنا آرٹ میں گناہ جانا گیا ہے سو اس نے افسانے کے عقب میں کمال ہنرمندی سے غیر ضروری تفاصیل اور Decorated نثر سے انحراف کر کے اختصار اور معروضیت کو تحصیل اور داخلیت کی سیڑھی بنا دیا ہے گو اس نے تکنیک میں افسانوی Norms کی پابندی کی ہے اور حقیقت کے التباس میں سماجی حقیقت نگاری کا شوق بھی پورا کیا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ حامد بیگ کے ہاں یہ مثالیں قلیل ترین ہیں۔ اس کے فن کے تفصیلی مطالعے کے باب میں شبیر شاہ نے 'گناہ کی مزدوری' میں بیشتر اساسی پہلوؤں پر preface میں تفصیل کے ساتھ بحث کر دی ہے اور مرزا کے ہاں آواز کو مرکب کر کے پالنے کے جاتک کو اکسانے کی بھرپور کوشش کی ہے اس لئے میں نے تا حد مقدور سعی کی ہے کہ ان باتوں کو نہ دہراؤں مگر مشکل یہ ہے کہ بعض بنیادی نکات بہر کیف ہر ناقد کو اپنے زاویۂ نظر کے مطابق بیان کرنا ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ شبیر شاہ کون ہے مگر اس کی جانکاری کے باوصف بھی مرزا حامد بیگ کی مٹی سے نسل در نسل وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کے Locale اور

روحانی واردات سے علاوہ وقف ہوں۔ اس کے فن کے مرکزی دھارے ہونے کی
تاثیر کو میں نے جہاں بھی گہرائی میں اترتا محسوس کیا ہے وہاں میں جذباتی بھی ہو
گیا ہوں کیونکہ مجھ کو بہ ستائی ملاتے ہیں تاریخی اور سماجی تجربے کی اندوہ ناکی کا
میں شاہد رہا ہوں۔

تجربہ۔ حامد بیگ کے افسانوں کو جن لوگوں نے بغائر پڑھا ہے وہ
جانتے ہیں کہ انہوں نے نئی لفظی تشکیلات میں جو تہذیبی عمل دکھایا ہے' اس کے
پیچھے اس کا مضبوط تہذیبی شعور اور ادبی روایت کا گہرا شعور کارفرما ہے۔ اُسے
افسانے کے کئی secrets کا علم ہے۔ یہ secrets کیا ہیں؟ یہ جاننے
کے لئے ہمیں' حامد بیگ کے خیال کی طاقت سے تجربہ اور حقیقت کی جس مارے
گزرنا ہے' اس سے عصری روح کی لرزش پوری طاقت سے محسوس کی جا سکتی ہے
جس سے زندگی کے فعالیا کو نئے سرے سے مرتب ہونے کا ذائقہ ہمارے ذہنی
تجربے کا حصہ بنتا ہے اس ضمن میں اس کے افسانوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر
سکتے ہیں۔ ایک حصے میں وہ افسانے جن میں داستان کو کہتا ہے سے آغاز ہو کر وہ
آہستہ رو ہماری اجتماعی نفسیات اور مابعد الطبیعیاتی شعور کے رموز سے قاری کے
سامنے آتے ہیں۔ افسانوں کا یہ پورشن نہایت نازک حتی خیز بلکہ میں یہاں تک
کہنے کو تیار ہوں کہ مثالی اعمال کی یہ جھلکیاں ہماری تہذیبی زندگی کا
panorama ہیں۔ اس کے لئے بے پناہ ریاضت اور انکار سے کام لیا گیا
ہے اور اسی فنی شعور نے اسے اسلوب کی تازہ کاری' کفایت لفظی اور بیان کو تکنیکی
سطح پر زندہ رکھنے کا secret بتلایا ہے۔ مرزا کے ہاں تہہ داری اور ارتقائی عمل سے
اس کے اسلوب میں یہ قدرت آگئی ہے کہ وہ معنی سماجی کے capsool کو
توڑ سکے۔ وہ لفظوں کی نئی پرت سے فن کی ان تاروں کو چھا سکے' جس کی روایت
میں بڑے ناموں کی فہرست ہے۔ وہ اس فہرست سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر
رکا نہیں' بلکہ وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ پلاٹ اور کردار کی شخصیت کے مطابق جس
وسیع تر کینوس پر افسانہ پھیلاتا ہے' اسے دیکھ کر اس کی منزل کا تعین ہو رہا ہے

اس کے افسانوں کا دوسرا حصہ پہلی سطح پر realism کی روایت
میں ہے۔ مگر اس کی پچھلی سطح میں علامات کا وہ کثیر الجہات جہان ہے' جس سے
ہمارے بیشتر لکھنے والے بوجوہ واقف نہیں ہیں۔ گویا اس کا یہ دوسرا روپ اپنے
بہت سے بے معنی اور لغو لکھنے والوں کے برخلاف فنی معیاروں پر ترازو کی طرح
تُلا ہوا' نکھرا اور ستھرا ہے۔ اس ضمن میں 'دستک' اور چند دوسرے افسانوں کی
بابت میں عرض نہیں کر رہا۔ 'دستک' کا موضوع پرانا اور treatment بھی
کوئی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر دوسرے اہم لکھنے والوں کی طرح بلونت
سنگھ جیسے نیچرل اور بیدی کے بے ساختہ فن کا دکھ کمال ہمارے سامنے ہے۔ بلونت
سنگھ کے بعد اس موضوع پر گزشتہ سالوں میں بہت لکھا گیا ہے۔ مگر سچی بات یہ
ہے کہ بلونت سنگھ کی چھپی ہوئی گنڈیریوں کو بڑے بڑوں نے دن بھری کہہ کر بیچا
ہے۔ اس لئے میرا منصب بطور خاص realistic school کے بارے
میں شدید تر رہا ہے۔ مگر بلونت سنگھ کے بعد حامد بیگ کا یہ افسانہ پڑھ کر مجھ پر تو لیکن
حیرت چھا گئی۔ یہ افسانہ مجھ کو پیچ اور امروہوی زمین کی لپک میں بار کی
سے بنا گیا ہے۔ اس ضمن میں وضع آفرینی کے اعتبار سے حقیقت نگاری کی کسی
حد تک یاد دلانے والے افسانوں میں 'مہابلی'، 'آوازیں'، 'اندھی گلی'، 'جسم جوگ'
اور 'کار شوال' نمایاں ہیں۔

اسی اسلوب میں ان کا ایک افسانہ 'کرفیو میں بند آوازیں' بڑی خوبی
اور اپنے اختصار میں کمال وسیع تر مضمون کی سطوح لئے ہوئے ہے۔ مرزا حامد
بیگ کے realistic school کے اسلوب میں یہ افسانے غلام عباس کی
کفایت لفظی اور اپنے فنی نقطے کو چھا کر افسانے کی وحدت کو زندہ کرنے کی یاد
دلاتے ہیں۔ مگر یہ اپنے فکری تار و پود اور تکنیکی خوبیوں کے علاوہ مشاہدے کے
ایک نئے ابعاد کی طرف جاتے ہیں' جو غلام عباس سے صریحاً ایک الگ راستہ اور
تجربے کی نئی چھوٹ ہے۔ اسی لئے اس نے لسانی تشکیلات کے عمل میں معمول
عام علامات سے ہٹ کر اپنے باطن سے رعایتی علامتوں اور تلازموں سے کام لیا
ہے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانوں سٹرکچر میں علامات کے عمل دخل کی
نشست پر مجھ کو علامتے نے جس طرح پگھل کر پورے فنائی سبق کو محیط کیا
ہے' اس سے کہانی کی روح کا انکشاف محسوس طور پر ہم اپنے خون میں دوڑتا ہوا
محسوس کرتے ہیں۔ شاید اس لئے اس کے بعض کردار زندہ جاوید بننے کی
صلاحیت سے متصف ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کرداروں کی پرداخت
میں واردات کی روح شامل ہے اور یوں ان کی پوری سمت کہانی میں تحرک
کرتی کہانی کے سینار یو کو ہر دو سے میں آگے بڑھتی ہے

بیشتر دوسرے سطحی حقیقت نگاروں' افسانہ نگاروں سے ہٹ کر یہ
کردار' مسائل اور خود ساختہ معلوم نہیں پڑتے گویا اس کے یہ کردار خارجی اور داخلی
دھوپ میں تپے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی گرمی میں عصری ناہمواریوں اور
تاریخی اندوہ کی کہانی نئے اردو افسانے کی ٹھنڈک ہے۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ
مرزا حامد بیگ نے افسانہ دلچسپ اور چونکا دینے والے واقعے کی خاطر نہیں لکھا
اس واسطے اس کا افسانہ نئے اردو افسانوی منظرنامے میں ایک یادگار واقعہ ہے۔

# تار پر چلنے والی......ڈاکٹر توصیف تبسم

"تار پر چلنے والی" مرزا حامد بیگ کی چوتھی تصنیف ہے۔ اس سے قبل اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ "گم شدہ کلمات" کے نام سے چھپ چکا ہے جو اپنے متخیل حوالوں اور خصوصاً اردو افسانہ کے ساتھ مصنف کی نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر ادبی حلقوں میں توجہ کا مرکز بنا رہا ہے.... "تار پر چلنے والی" اس نوع کی موضوعی یکسانیت کی حامل کتاب نہیں ہے لیکن اس میں افسانہ نگار نے تکنیک کے تنوع سے جو کام لینے کی کوشش کی ہے اس نے اس تصنیف کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں شامل افسانے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۲ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ یہ وہ افسانے ہیں جن میں مرزا حامد بیگ نے اپنی تکنیکی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ شاید یہ مجموعہ اس لیے بھی اہم ہے.... کہ مرزا حامد بیگ نے افسانہ کی تنقید میں جس طرح روایتی اسلوب و موضوعات سے انحراف اور نئی روایت کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نظریہ پیش کیا تھا ہم افسانہ نگاری کی تخلیقی سطح پر بھی اس نوع کی توقعات اُن سے رکھتے تھے۔ آج کے افسانہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ روایتی افسانے نے ابھی دم نہیں توڑا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیم روایتی اور جدید تر افسانہ اس کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہے۔ ان تینوں طرز کے افسانوں کے محاسن کا جائزہ پیش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ آج اگر سیّد وقار عظیم کی تصنیف "داستان سے افسانے تک" تدریسی اور خالص ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت منوا رہی ہے تو ممتاز شیریں کی کتاب "معیار" کے افسانوی ادب سے متعلق مضامین بھی نیم روایتی افسانے کا دفاع بڑے بھرپور انداز میں کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں خصوصی طور پر اُن کی منٹو سے متعلق تنقید کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف جدید افسانہ (اس اصطلاح سے مرزا حامد بیگ کو چڑ رہی ہے) بھی اپنا مضبوط دفاع پیش کر رہا ہے، جس میں خود مرزا حامد بیگ کی تصانیف "افسانے کا منظر نامہ" اور "تیسری دنیا کا افسانہ" ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

"تار پر چلنے والی" میں مرزا حامد بیگ نے اپنی لکھی ہوئی تنقید کا عملی دفاع کرنے کی سعی کی ہے اور یوں وہ ہمارے اُن قلم کاروں میں شامل ہو گیا ہے جنہوں نے اپنے تخلیقی کام کا بھرپور جواز بھی فراہم کیا ہے۔ مجھے اس موقع پر اُن کا مضمون مشمولہ "افسانے کا منظر نامہ" بعنوان "اُردو افسانے میں زبان کا ذائقہ" یاد آ رہا ہے، جس میں انہوں نے پہلی دفعہ اُردو افسانے میں مروج اسلوبیاتی نظام پر بات کی تھی اور افسانے کے منظر نامے کو اسلوبیاتی سطح پر اس مشکل سے دوچار قرار دیا تھا کہ کوئی اسلوبیاتی کروٹ اپنی بھرپور روایت قائم کرنے میں ناکام دکھائی دیتی ہیں۔ "تار پر چلنے والی" میں انہوں نے اپنے طور پر اسلوبیاتی سطح پر ایک نئی کروٹ کی پیش گوئی ہی نہیں کی بلکہ اپنے ناولٹ "تار پر چلنے والی" میں اس کا ایک عملی مظاہرہ بھی کیا ہے۔ یہ ناولٹ بیشتر مکالموں پر مبنی ہے۔ اس میں ہیئت سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ اُردو کے افسانوی ادب میں یہ اس نوع کی اولین کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں شامل بیشتر افسانے افسانہ نگار کے روزنامچوں سے جنم لیتے ہیں۔ خاص طور پر Teenagers کی نفسیات کا مطالعہ خصوصی توجہ چاہتا ہے جس کی ایک مثال کتاب کا پہلا افسانہ "صید زبوں" ہے جو کتاب میں شامل آخری تحریر یعنی ناولٹ ہے۔ مرزا کے ان افسانوں میں اُسے پرانی اور نئی نسل کا باہمی جدل بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا موضوع زمان و مکاں کا تنازعہ ہے۔ مرزا کے بیشتر کردار کسی ایک زمانے میں نہیں جیتے۔ وہ حال سے ماضی اور ماضی سے مستقبل تک تینوں جہات سے ہوتے ہوئے اپنے منطقی انجام کو پہنچتے ہیں۔ اس کی ایک خوبصورت مثال اُن کا افسانہ "کو روئی سنگ چلا" ہے جس میں زمانہ حال، ماضی اور مستقبل میں کچھ ایسی زنجیریں بھرتا ہے کہ اس کا تار و پود بکھرنے کی بجائے اور زیادہ مجتمع ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا افسانہ نگار زمان و مکاں کے تنازعہ کو شرقی حوالوں کے ساتھ حل کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے اور اس میں سب سے وقیع حوالہ شرقی تصوف سے فراہم کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل افسانہ "ایک خاکی کا معراج نامہ" اس کی ایک مثال ہے جس میں صوفیانہ رویّہ معراج کے اس واقعہ کو ساتھ لے کر چلتا ہے جو پیغمبری کی سطح پر پیش آیا اور وہ صرف روحانی سفر نہیں تھا بلکہ جسمانی سفر بھی تھا۔ "ایک خاکی کا معراج نامہ" میں روح و بدن کا بندہ اپنی جس معراج کو پہنچتا ہے وہ بندے کی سطح پر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پیغمبر نہیں لیکن اپنے روحانی تجربے اور وقت کے جھگڑے کے باعث ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتا ہے جو ایک بندہ کی سطح پر یوں تو محال ہے لیکن ناممکنات میں سے نہیں..... ایک اقتباس دیکھیے:

"تار کے پھندے میں اُس منیر پر جہاں سے ابھی کچھ دیر پہلے وہ اُٹھ کر چلا آیا تھا، مطمئن اور مسرور لوگوں نے اُسے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا..... وہ جسے فرعون کی رتھ کی گھوڑیوں میں سے ایک کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی جس کے گال مسلسل زلفوں میں خوش نما تھے اور گردن دولڑوں کے ہاروں میں۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچی تھی۔"

مرزا حامد بیگ کے موضوعی حوالوں کا فکری محور زندگی کا وہ چلن ہے جس کی مثالوں میں آخری مثال شہزادہ دارا شکوہ مقتول کی شخصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں زندگی کا وہ رویّہ اس طرح عام نہیں ہو سکا جیسا کہ اورنگ زیب عالمگیر کا فکری اور دینی نظام تھا۔ لیکن آج اگر مرزا حامد بیگ اُس کھوئے ہوئے فکری نظام کو یاد کرتا ہے تو اُس کی کچھ وجوہات تو ضرور ہی ہوں گی۔

کتاب میں شامل افسانہ "پروڈکشن نمبر ۳" اپنے تکنیکی نظام کے باعث اس لیے یاد رکھے کے لائق ہے کہ ہمارے افسانوی ادب میں پہلی بار فلم میکنگ کی تکنیک کو من و عن برتا گیا ہے۔ اس افسانہ میں مرزا حامد بیگ کا قلم سے

متعلق تجربہ ہوتا ہے۔ موضوعی سطح پر یہ افسانہ زوالِ ڈھاکہ کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بہار سے متعلق ہے جسے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد تیسری ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس افسانے میں اُس مہاجر اور مقامی ذہنیت کے فکری رویوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

افسانہ "پارس پتھر" ہماری مشرقی دانش کا ایک اہم استعارہ ہے جس میں انسان قدیم وقتوں سے کیمیاگری کے ایک سہانے خواب کا اسیر چلا آرہا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بھی اپنی ساری زندگی کے تجربات کو سمیٹے ہوئے اس افسانے میں مسلسل مسافرت میں ہے لیکن اس کے ساتھ ہوا یہ ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو چکنے کے باوجود خالصتاً انسانی سطح پر بھول چوک کا شکار ہو کر ایک بڑے المیے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے گلے میں لٹکا ہوا لوہے کا لاکٹ خالص سونے میں تبدیل ہو چکا ہے لیکن وہ پارس پتھر کو نہ جانے پیچھے بہت پیچھے عام پتھروں کے ساتھ پھینک آیا ہے۔ سوچا جائے تو یہ افسانہ معنوی سطح پر شہزادہ دارا شکوہ کے اُس فکری نظام کے کھو جانے پر تاسف کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اب کچھ بات کتاب میں برتی گئی زبان کے متعلق.... مرزا حامد بیگ نے اس کتاب میں شامل افسانوں میں شعوری کوشش کر کے طویل جملے تراشنے کی سعی بھی کی ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ ہمارے یہاں جیسا کہ محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ رتن ناتھ سرشار کے بعد طویل جملے لکھنے کی طرف ہمارا افسانہ نگار آیا ہی نہیں، یہی وجہ تھی کہ ستاں دال اور فلابیئر کو اُردو میں ترجمہ کرتے وقت محمد حسن عسکری کو "سرخ و سیاہ" اور "مادام بواری" کے اسلوبیاتی نظام کو گرفت میں لانا مشکل دکھائی دیا۔ یہ یقیناً مرزا حامد بیگ کا ایک مستحسن عمل ہے اور ان خطوط پر سوچنے کی ضرورت کا خیال مستقبل میں آنے والوں کو بھی رکھنا پڑے گا۔ اس ضمن میں "لندر یونی سنگ پچلا"، "رات کا جادو" اور "نیند کے ماتے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعی لحاظ سے زیرِ نظر کتاب، مرزا حامد بیگ کو انتظار حسین، خالدہ حسین اور سریندر پرکاش جیسے لکھنے والوں کے ساتھ رکھ کر تقابلی جائزہ لینے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں لیکن اسے ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک بات اور بھی کہنی ضروری ہے کہ جدید تر افسانہ نگاروں نے زبان اور اُردو کے اسلوبیاتی نظام کو جس طرح پسِ پشت ڈالنے کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی ہے اس کا سدِّباب کرنے میں شاید مرزا حامد بیگ تنہا دکھائی دیتا ہے اور شاید اب انتظار حسین کو یہ گلہ نہ رہے کہ پنجاب کا لکھنے والا اُردو زبان کے ساتھ ہمیشہ روا سلوک جائز رکھتا ہے۔ چلتے چلتے یہ بات یوں بھی یاد آ گئی کہ انتظار حسین تو ابھی تک راجندر سنگھ بیدی کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کاش ہمارے اُردو کے ان نقادوں کو بھی یہ کتاب پڑھنے اور پرکھنے کی توفیق ملے جو اپنے لکھے ہوئے کو ٹی ایس ایلیٹ اور ڈی ایچ لارنس کی تحریروں سے کم نہیں سمجھتے۔

# جانکی بائی کی عرضی

مرزا حامد بیگ

کے۔ ایل۔ دلیارام ریٹائرڈ سیکرٹری بہادر میونسپل کمیٹی لاہور، آج پھر رات گئے اپنی سٹڈی میں پرانے اخباری تراشوں، بیانات اور نجی یادداشتوں پرمبنی فائل لیے بیٹھے تھے۔ یہ ایک ایسی دستاویز تھی جسے انہوں نے اپنے گھر میں بھی ہمیشہ لاک اینڈ کی رکھا۔

آج انہیں سانس کی تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی، ڈاکٹر کے مطابق ان کا بلڈ پریشر نارمل تھا اور شوگر ٹیسٹ کی رپورٹ اے ون۔

گزشتہ کئی برسوں میں تو ایسا کم کم ہی ہوا، لیکن جب کبھی ایسا ہوتا اس روز وہ رات کا کھانا وقت سے پہلے کھا لیتے اور بیڈروم کا رخ کرتے۔ پھر تا دیر کروٹ لیے بستر پر پڑے رہتے۔ جب بیگم گھر کا کام کاج نمٹاتے ہوئے ملازمہ کو آخری ہدایات دے کر کمرے میں آتیں تو ہمیشہ دھیرج سے صرف ایک ہی سوال پوچھتیں: "کیا سو گئے؟"

جواب میں وہ چپ چاپ پڑے رہتے اور جب وہ گہری نیند سو جاتیں تو اٹھتے اور اپنی سٹڈی کا رخ کرتے۔

آج بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ جب جانکی بائی کی یاد چہار جانب سے اُمڈی پڑتی تھی اور انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اس وقت کہاں ہو گی وہ؟ کن حالات سے گزر رہی ہو گی؟؟ انہوں نے سوچا۔

سٹڈی کی میز پر اُن کے سامنے جھکے ہوئے ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی میں برس ہا برس پرانے اخباری تراشوں، بیانات اور نجی یادداشتوں پرمبنی فائل دھری تھی۔ وہ تا دیر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ربن کھولا۔ فائل کے شروع میں مختلف پرانے اخبارات کے تراشے تھے، جن میں انجمن اصلاح بدکاراں لاہور کی جانب سے جاری کردہ بیانات کے علاوہ شراب فروش الٰہی بخش گجر کے خلاف لالہ کرم چند چوپڑی کے مشہور مقدمہ ۱۹۱۵ء کی تفصیل موجود تھی۔ ۱۹۲۱ء کے روزنامہ "سیاست" کا اداری نوٹ کچھ یوں تھا:

"صد افسوس کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے ۱۹۱۳ء میں قرارداد نمبر ۲۷۲ کے ذریعے ہیرا منڈی کو ممنوعہ علاقہ قرار دے کر کوچہ شہباز خاں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ شہر لاہور کی تمام طوائفیں کوچہ شہباز خاں اور اس کے نواحی علاقہ جات میں پھیل گئیں۔ اب کیا ہی اچھا ہو کہ کوچہ شہباز خاں اور اس کے نواح کو بھی اس گندگی سے پاک کر دیا جائے۔"

ریٹائرڈ صاحب بہادر نے اس اداری نوٹ کو پڑھنے کے بعد سوچا، کیا ہنگامہ خیز زمانہ تھا ۱۹۲۱ء کا، جب محمد علی جوہر کی خلافت تحریک زوروں پر تھی، گاندھی جی نے تحریک کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا تھا، مسلمانوں نے گویا سے ہاتھ روک لیا تھا، خالق دینا ہال کراچی میں جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلا تھا اور انہیں دو سال قید سخت ہو گئی تھی۔ لیکن اس ہنگامے کے اندر ایک اور ہنگامہ بپا رہا تھا، لاہور شہر کے بازار حسن کی ایک کلاسیکی داستان۔ لیکن ہوا سب کچھ آناً فاناً ہی۔

اُن دنوں میونسپل کمیٹی لاہور کے حکام بالا کے نام ایک محضر نامہ موصول ہوا۔ ہندو، مسلمان اور سکھوں کے سینکڑوں دستخطوں پر مشتمل اس درخواست میں استدعا کی گئی تھی کہ لاہور کی مختلف آبادیوں میں قائم شدہ چکلے ختم کیے جائیں اور پیشہ ور عورتوں کو شریف آبادیوں سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے بعد تو کمیٹی کے نام اس نوع کے محضر ناموں کا تانتا بندھ گیا۔ تب بھی کمیٹی ان درخواستوں کا نوٹس نہ لیتی پر ایک مصیبت آن پڑی۔ انجمن اصلاح بدکاراں کے رضاکاروں نے پیشہ ور عورتوں کے کوٹھوں کے سامنے کھڑے ہو کر بدکاری کے خلاف تقاریر شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں کوٹھوں پر سے تقریر کرنے والوں پر کوڑا کرکٹ پھینکا جانے لگا۔ انجمن اصلاح بدکاراں کے متحرک کارکن پہلوان امیر بخش کے ساتھ دوران تقریر جب ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تو اُن کے ساتھیوں اور کوٹھے کے تماش بینوں کے بیچ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ معاملہ بڑھا تو نقص امن کے خطرے کے پیش نظر میونسپل کمیٹی لاہور کی جنرل باڈی میٹنگ منعقدہ نومبر ۱۹۲۱ء میں زیر دفعہ ۲۱۸ میونسپل ایکٹ ۳ بابت ۱۹۱۱ء کے تحت ٹانکی (عقب کمرشل بلڈنگ)، دھوبی منڈی (عقب پرانی ٹانکی)، دہلی دروازہ، لوہاری منڈی، چوک بازار، سرائے سلطان، شاہ عالم روڈ، فورٹ روڈ اور موتی بازار کو عام پیشہ ور رنڈیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ جات قرار دے دیا گیا۔ اگلے روز میکلیگن پریس سے شائع کردہ یہ اہم فیصلہ عوامی اشتہار کی صورت شہر لاہور کی دیواروں پر چسپاں ہو چکا تھا۔

اس اشتہار کے اجراء کے چند روز بعد جملہ طوائفوں اور کوٹھی خانوں کے مالکان کو فرداً فرداً نوٹس ملنے شروع ہو گئے۔ اس سلسلہ کے ایک نوٹس کی کاربن کاپی فائل میں موجود تھی۔

"فارم نمبر ا

از سر رشتہ سیکرٹری میونسپل کمیٹی لاہور

بنام بانو بنت نامعلوم ساکن لاہور محلہ دھوبی منڈی نمبر ۱۰۷ چونکہ میونسپل کمیٹی لاہور نے اس رقبہ کو جہاں تمہاری رہائش ہے زیر دفعہ ۱۵۰ میونسپل ایکٹ نمبر ۳ بابت ۱۹۱۱ء کوٹھی خانہ یا چکلہ رکھنے یا عام پیشہ رنڈی کی رہائش کے لیے ممنوع قرار دیا ہے۔ پس آپ کو بذریعہ اطلاع نامہ ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ عرصہ ایک ہفتہ میں شکایت مذکورہ دور کر دیویں یعنی مذکورہ بالا رقبہ ممنوعہ

میں سے اپنی رہائش چھوڑ دو۔ ورنہ آپ کے خلاف کارروائی کی جاوے گی۔

مرقوم ____ ماہ ____ ۱۹۲۱ء

<u>نوٹ</u>

اگر آپ کو کوئی اعتراض نسبت نہ دور کرنے شکایت مذکورہ ہو تو ہمارے پاس علیحدہ تحریری جواب بھیج دو یں۔ پشت نوٹس پر مع تحریر کیا ہوا عذر قابل غور نہ ہوگا۔"

صاحب بہادر کو اچھی طرح یاد تھا کہ کمیٹی کے اس اقدام کے خلاف سب سے پہلے دھوبی منڈی عقب پرانی انارکلی کی طوائفوں نے چارہ جوئی کی تھی اور میونسپل کمیٹی کے علاوہ ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر پنجاب کو درخواستیں گزاری تھیں۔ کاغذات کو الٹتے پلٹتے ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو لال محمد وال وکیل کی معرفت لکھی گئی ایک عرضداشت سامنے آ گئی۔ جس میں لکھا تھا:

"ہم برسوں سے اس محلے میں رہ رہی ہیں اور یہاں کے لوگوں کو ہم سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یہ محلہ گھرانوں سے بہت دور ہے اور سکھوں کے عہد سے طوائفوں کے لیے مخصوص چلا آ رہا ہے۔ آج سے چھ سات برس پہلے شراب فروش الٰہی بخش گجر کے خلاف لالہ کرم چند چوہدری کے دائر کردہ مقدمے میں ڈپٹی کمشنر نے ذاتی معائنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ چکلہ اور شراب خانہ جہاں ہیں وہیں رہنے چاہئیں۔ لیکن یہاں کوئی پانچ چھ آدمی ایسے ہیں جو ذاتی وجوہ کی بنا پر ہمیں پریشان کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ اس محلے کے رہنے والے بھی نہیں ہیں۔ یہ لوگ بڑے معمولی قسم کے ہیں اور تحریک خلافت کے کارکن ہیں۔ انہوں نے درخواست گزاروں سے خلافت کمیٹی کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے میونسپل کمیٹی کو ہمارے خلاف درخواستیں دینا شروع کر دی ہیں اور ان لوگوں کی غلط رہنمائی میں کمیٹی نے ہمیں محلہ خالی کرنے کے نوٹس جاری کر دیے ہیں۔ لیکن کوئی متبادل جگہ تجویز نہیں کی ہے۔

.......... آپ کی یہ ناچیز درخواست گزار عمر کے اس مقام پر جا پہنچی ہیں کہ طویل عرصہ تک یہ پیشہ کرنے کے بعد اب کوئی ان سے بیاہ کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی انہیں کسی گھر میں ملازمت مل سکتی ہے۔ عمر رسیدگی کی وجہ سے وہ اب کوئی اور دنیا کا کام بھی نہیں کر سکتیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر انہیں کسی دوسری جگہ کرایہ پر مکان بھی نہیں مل سکے۔

ان سب وجوہ اور واقعات و کوائف کے باوجود ہم اس تنگ اور مایوسیوں کی زخم خوردہ زندگی میں بزرگوں اور نا توانوں کے لیے امید اور طمانیت کی شمع جلائے بیٹھی ہیں۔

ہم جو بہت غریب ہیں اور آئے دن کے ظلم ناقوں نے ہمیں افلاس کی آخری حدوں تک پہنچا دیا ہے۔ آپ سے رحم کی درخواست کرتی ہیں۔



لیکن ہوا کیا تھا۔ دھوبی منڈی عقب پرانی انارکلی کی جسم فروش اور منیجہ وزیرو، جیوں، کرم نشاں، افضلاں، سردارو، بدرو، ہاجرہ، تیجو، بالو، زینب، راکھی، عزیزو اور دروار پٹھانی وغیرہ کی یہ درخواست سارنگی کے ٹوٹے ہوئے تار سے بھی زیادہ بے اثر ثابت ہوئی اور انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔ یہی حال لوہاری منڈی، دہلی دروازہ، گنڈا بازار، نا سرائے سلطان، شاہ عالم روڈ، گورنٹ روڈ اور موتی بازار کی طوائفوں کا ہوا۔

جسم فروشی کے الزام کی بنیاد پر کمیٹی کی جانب سے نوٹس کردہ طوائفوں کی صحیح تعداد تو ریکارڈ صاحب بہادر کو یاد نہ تھی اور نہ فائل میں کہیں مذکور تھا۔ البتہ اتنا یاد تھا کہ چھ سو طوائفیں ایسی تھیں جن پر نوٹس کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں مقدمات چلائے گئے اور انہیں پانچ روپے سے لے کر پچاس روپے تک کے جرمانے کی سزا ہوئی۔

فائل میں اگلے صفحے پر صاحب بہادر کی اپنی ہاتھ سے لکھی یادداشتیں درج تھیں۔ روز بروز مدھم پڑتی ہوئی نیلی روشنائی سے انہوں نے کبھی کچھ وقتوں میں لکھا تھا: "میونسپل کمیٹی کے ایک کونسلر محمد گھسیٹا نے رائے ظاہر کی ہے کہ موتی بازار اور دوسری جگہوں سے جو خانگیاں نکل کر گور شہباز خاں (اندرون ٹکسالی دروازہ) میں آباد ہو گئی ہیں انہیں وہاں سے نکال دیا جائے۔ اور یہاں پہلے سے رہنے والی مالک مکان طوائفوں سے کہا جائے کہ وہ کھڑکیوں کے سامنے پردے لگا دیا کریں۔ دھوبی منڈی کی بعض خانگیوں نے پان سگریٹ کی دکانیں کھول لی ہیں اور یہ دکانیں دلالی کے اڈے بن گئی ہیں۔ ان کا بھی کوئی انتظام کرنا ضروری ہے۔"

ایسے میں صاحب بہادر کو چیت رام روڈ کی جا نگی بائی کی کھڑکی کا جالی دار پردہ یاد آیا اور پان بیڑی سگریٹ کی دکان کے باہر کھڑا لال رومال والا دلال تھو دا گجر۔ وہ دیر تک سر نیہوڑھائے بیٹھے رہے۔ پھر جیسے پرانی یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو چل نکلا۔ انہیں یاد آیا کہ موسم سرما کی وہ ایک حسین شام تھی جب تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش میں کانپور سے لاہور آیا ہوا ایک نوجوان ریلوے اسٹیشن سے سامان کے تانگے میں بیٹھ کر بھاٹی دروازہ کے سامنے اترا تھا اور بھاٹی سے لوہاری تک کی چہل قدمی کرتے کرتے بے خیالی میں ٹکسالی گیٹ کی طرف نکل آیا تھا۔ پھر گھومتے گھامتے چیت رام روڈ تک آیا۔ اس وقت چیت رام روڈ کے لیمپ پوسٹ روشن ہو چکے تھے اور بازار حسن جو بن پر تھا۔ یوں ہی گھومتے گھامتے اس نے سارے پر تشد د کی بیٹھکوں کی بیٹھکیں، کھائیوں والی گلی اور دہلی دروازے کا بازار۔ ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے قریب ہی کی بیٹھک سے کسی مغنیہ نے تان لگائی: "تمہارے نیناں نے جادو کیا" طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی سنگت پر گھنگرو چھنکا اٹھے تو وہ جیسے قدم اٹھاتا "پوری محفل" کی طرف نکل

لیا۔

ابھی اس نے "چوری چھپے" کے پر یہ والے پان بیڑی فروش سے خوشبو والی چھالیہ والا پان بنوایا ہی تھا کہ گلے میں سرخ رومال اُڑسے ایک دلال نے اُسے آلیا۔

"بابو جی! کیا رکھا ہے یہاں۔ آیئے میرے ساتھ"

"لیکن کہاں؟ میں تو یونہی نکل آیا اس طرف سنا کچھ سوچ سمجھے۔"

"پہلی بار میں ایسا ہوتا ہے صاحب..... چلیے تو....."

"لیکن کہاں؟"

"جہاں میں آپ کو لے کر جاؤں۔ صاحب! ہیرا ہے ہیرا۔"

"نہیں بھائی۔ میں بہت معمولی آدمی ہوں اور فی الوقت جیب کا بہت ہلکا۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ آیئے تو سہی۔ دیکھ تو لیجیے فیصلہ بعد میں کیجیے گا۔"

سرخ رومال والا اسے "چوری چھپے" سے اُچک کر ایک بار پھر چیت رام روڈ پر لے آیا۔ پھر کا یک اس نے بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑتے ہوئے کہا:

"آیئے صاحب! آیئے۔" اس کے پیچھے ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نوجوان قدرے ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن سرخ رومال والا تو جیسے چھلاوہ تھا چھلاوہ۔ اس نے جھٹ پٹ بیرونی دروازہ کھول کر آواز لگائی:

"جانکی! او جانکی..... دیکھ تو تیرے ملنے والے آئے ہیں۔"

سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے نوجوان نے اندر نگاہ کی۔ سپید و سیاہ ٹائلوں والے صاف ستھرے دالان میں طاقچے پر لیمپ روشن تھا۔ دالان کی دائیں جانب دو حجروں کمرے تھے اور بائیں جانب ایک صاف ستھرا باورچی خانہ سامنے تو شرفا نے کے ساتھ ایک اُجلا غسل خانہ تھا، جس کے نیم وا دروازے میں سے ایک سانولی سی لڑکی نے نظر بھر کر باہر کی سمت جھانکا تو وہ دونوں دالان میں کھڑے تھے۔

"جانکی! تیرے ملنے والے۔" سرخ رومال والے نے دائیں کا کمرہ کھول دیا۔

"آیئے صاحب! آیئے آرام سے بیٹھیے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس علاقے میں تو دسے کچھڑ کی مرضی کے بغیر ہوا بھی نہیں چلتی۔ میں یہ گیا اور یہ آیا۔" سرخ رومال والے نے چٹکی بجاتے ہوئے مڑ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔

اب نوجوان نے کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دائیں ہاتھ دیوار سے جڑا سجے والا سرخ روغنی پلنگ، ایک چھوٹی سی تپائی کے ساتھ جوڑ کر رکھی ہوئی آرام کرسی، فرش پر بچھی ہوئی دری اور دیواروں پر اداکارہ ای۔ بلوریا کی فلموں کے متعدد پوسٹرز "پردیسی"، "بیر بہٹی زودا تھی"، "طوفان میل"..... ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کرسی پر بیٹھے یا پلنگ پر کہ پیچھے سے نکل کے لئے کروٹ تو کلا۔

"آپ بیٹھتے کیوں نہیں۔ تشریف رکھیے۔ میں ہوں جانکی۔ بس جیسی بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔"

نوجوان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جانکی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ اس وقت دالان کی سمت کھلنے والے دروازے میں قدرے جھک کر کھڑی تولیے سے جھٹک جھٹک کر اپنے سینے کے زنخیر پڑے ہوئے گیلے بال خشک کر رہی تھی۔

"رام جانے آپ کو کیسی لڑکی کی تلاش ہے۔ میں تو نہ گوری چٹی ہوں اور نہ بناؤ سنگھار ہی آتا ہے مجھے۔ بس ایسی ہی ہوں۔" جانکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"یہ موا گھرکون ہے؟"

"وہی، جو آپ کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اب اس نے پلٹ کر نہیں آنا۔"

"اے جانکی تیرا مہمان رات رہے گا یا ایک آدھ بار بیٹھ کو آیا؟" برابر والے کمرے سے چھالیہ کترتے ہوئے سروتے کی کھٹ کھٹ کے ساتھ کسی بزرگ خاتون کی آواز ابھری۔

جواب میں جانکی چپ رہی اور اسی طرح تولیے سے گیلے بال خشک کرتی رہی۔

"اے جانکی بولے کیوں نہیں؟"

تب بھی جواب میں جانکی چپ رہی۔

"رات رہوں گا میں۔" نوجوان نے شب بسری کا فیصلہ کرتے ہوئے اُونچی آواز میں جواب دیا۔

اس کے بعد کمرے میں چپ کی چادر پھیلتی گئی۔ نوجوان کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ جانکی کا رُخ دیوار میں جڑے آئینے کی طرف تھا اور وہ رُخ بدل بدل کر کنگھی کر رہی تھی۔

"جانکی! اس کوچے میں نیا آدمی ہوں۔ لاہور میں آج میری پہلی رات ہے۔ ایسی جگہ پر پہلے کبھی آیا گیا بھی نہیں اور جیب میں بہت زیادہ روپے بھی نہیں۔"

"روپیہ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے بابو جی۔ یہ بات تو کرو، ای۔ مجھے ای۔ بلوریا پسند ہے، اس لیے آپ بھی پسند ہیں۔ کوئی سنڈ وار دیکھا اس کا؟"

"پنجاب میل" میں ڈاکٹر بنا تھا۔"

"نہیں، ابھی تک نہیں۔ صرف نام سنا ہے اس کا، یا تصویر ہی دیکھی

ہیں ستارا کے باہر۔"

"آپ کا قد کاٹھ، چہرہ مہرہ........ مونچھیں تو بالکل بلوریا جیسی ہیں۔"

"شکریہ۔" نوجوان پہلی بار ہلکا سا مسکرایا۔

جانکی نے دروازہ بھیڑتے ہوئے کمرے میں روشن لالٹین گل کر دی۔ اس وقت گلی کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے چوڑے میں روشن لیمپ پوسٹ کی ہلکی زرد روشنی کے ساتھ خنک ہوا باریک جالی دار پردے سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

"تنکیں کو ہم ترسوئیں جو دو وقت نظر ملے۔"

برابر والی کسی بیٹھک سے ڈوبتی ابھرتی، کسی مغنیہ کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

"کیا ہے تمہارا گھر۔ مجھے نہیں دکھاؤ گی؟"

"میرا گھر؟" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "چلیں اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یوں ہی سہی، کسی نے روکا ہے آپ کو گھر دیکھنے سے۔ آئیں میرے ساتھ۔"

اور وہ جانکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ برابر والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ توشہ خانے میں ایک مریل سا طاقچی لالٹین کی مدھم روشنی میں اکڑوں بیٹھا جانے کیا کر رہا تھا۔ دالان سے لوہے کی گول سیڑھی سیدھی چھت کو نکل جاتی تھی۔ جس کے ذریعے وہ دونوں چھت پر چلے گئے۔ ہلکی پروائی میں ریلنگ کا سہارا لیے وہ بہت دیر تک عزیز تھیٹر سے اٹھنے والی آوازیں سنتے اور بادشاہی مسجد کے فلک بوس میناروں کا نظارہ کرتے رہے۔ جب چھت دام پر مجرہ کی بیٹھکیں اجڑ گئیں اور ہر طرف مکمل سکوت چھا گیا تو وہ نیچے اتر آئے۔

اب کمرے میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

"کھڑکی بند کر دوں یا کھلی رہنے دوں؟" جانکی نے پلنگ پر لیٹتے اور اپنے برابر میں اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک کھلی رہنے دو۔"

اگلے روز علی الصباح ان کے کمرے کا دروازہ ایک چھپاکے کے ساتھ کھلا اور ہنسی ٹھٹھہ کرتی نوجوان لڑکیوں کا ایک غول اندر اُمڈ آیا۔ انہوں نے آتے ہی ان دونوں پر سے ریشمی رضائی کھینچ کر دور پھینک دی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو ہو گئیں۔ جتنی دیر میں یہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے اور اپنے اوپر بستر کی چادر لی اتنی دیر میں وہ ساری کی ساری قہقہے لگاتی اور ایک دوجی کے کولہوں پر چٹکیاں کاٹتی، نیچے دری پر بیٹھ چکی تھیں۔

پھر ایک لڑکی کہیں سے ہارمونیم اٹھا لائی اور دوسری نے ڈھولک سنبھال لی۔ پھر وہ ساری کی ساری تالیاں بجا بجا کر شادی بیاہ کے گیت گانے لگیں۔ بہت دھاچوکڑی مچائی انہوں نے اور یہ دونوں اپنے اوپر چادر تانے بس مسکراتے رہے تا وقتیکہ منورا نگھر حلوہ پوری کا ناشتہ تھامے آدھمکا۔

ارے یہ کیا؟ یہ کمبخت راگ کرا اپنی اپنی تھتھ ہراتی پر۔ چلو بھاگو یہاں سے۔ کنگھیاں نہ ہوں تو" منورے نے لڑکیوں کو گھرکی دی تو وہ اٹھ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ منورے نگھر کو اپنے انعام سے غرض تھی جو اسے مل گیا اور وہ نکل لیا۔

ناشتہ کے بعد نوجوان نے بھی وہاں سے نکلنا تھا اور اس وقت تک خوب دن چڑھ آیا تھا۔ اس لیے جب وہ نہا دھو کر جانے کے لیے تیار ہوا تو اس نے تنگی کرتے ہوئے اپنا بٹوہ جانکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جا ہو تو سب کے سب رکھ لو۔"

"نہیں۔ آپ پردیسی ہیں اور بے روزگار بھی۔ آپ مجھے اچھے لگے۔ میری ایک عرضوی ہے کہ مجھ سے ملتے رہیے گا۔ جب افسر بن جائیں گے تو جو جی میں آئے دیجیے گا۔ یا میں خود مانگ لیا کروں گی لیکن آج کچھ نہیں لوں گی۔"

نوجوان نے بہت چاہا کہ جانکی اپنا منہ مانگا انعام لے لے لیکن وہ مسلسل انکار میں سر ہلاتی رہی۔ پھر وہ وہاں سے نکل آیا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ہفتے عشرے وہ جانکی سے ملنے جاتا رہا۔ اس سے شادی کے عہد و پیمان بھی کیے، جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی اور جانکی ہر بار اس کی آمد پر اپنے کانوں کو یہ کہہ کر کہاتی رہی کہ بار بار منت کے قابل نہیں۔

صاحب بہادر کو گئے وقتوں کی ایک چلبلاتی دوپہر اب تک یاد تھی۔ جب منورے کی معرفت ان کے بلوریا کا پیغام ملنے پر سفید چادر میں لپٹی لپٹائی جانکی بہانے سے لیڈی ولنگڈن ہسپتال چلی آئی تھی اور وہاں سے وہ دونوں تانگے پر نور جہاں کے مقبرے کی طرف نکل گئے تھے۔

اس روز شاہدرہ کے گاؤں کی کچی آبادی میں گھومتے پھرتے ان دونوں کو جس کسی نے بھی دیکھا میاں بیوی ہی سمجھا۔ اور اس آوارہ گردی کے دوران کتنی خوش لگی تھی دونوں کو..... اور ہاں وہ ٹھیک دل بڑھیا، جس نے لسی کے ساتھ بڑی رغبت سے ان کی تواضع کرتے ہوئے پوچھا تھا: "کے دن ہوئے شادی کو۔ کوئی بچی بچہ؟"

تب جانکی کس طور لجائی تھی۔ چادر کے پلو میں منہ چھپائے اور سر نیوڑھائے کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔

ایک طویل سلسلہ تھا یادوں کا، جس کا اور چھور کوئی نہ تھا۔ جیسے طوفان سیل دھوپ الٹی بیٹھی چنگھاڑتی چلی جا رہی تھی اور اس کی چھت پر ابھی بلوریا کے ہاتھ سے مس ملوپیا کا ہاتھ چھٹا جاتا تھا۔ حالات کچھ کے کچھ ہوتے چلے گئے۔ کچھ بس میں بھی تو نہیں تھا ان دنوں۔ انہوں نے سوچا۔ ابھی

ملازمت مل گئی میونسپل کمیٹی میں تو سفید پوشی آڑے آئی اور جاگی کی طرف جانا
یکسر چھوٹ گیا۔ یہ جانے بغیر کہ ملازمت مل گئی۔ کس کس سے منہ پوچھا ہوگا اس
نے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ دیر سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔ فائل کا اگلا صفحہ
پلٹا تو ان کے سامنے ان کے اپنے ہی ہاتھ کی لکھی ایک یادداشت آ گئی۔
"سب حالات ٹھیک جا رہے تھے کہ اچانک ۲۸ جنوری ۱۹۳۲ کی
صبح کونسلر لالہ دھنا ک رائے نے کمیٹی میں اک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے
میرے روبرو بتایا کہ اندرون ٹکسالی ایک ایسے مکان کی نشاندہی کی گئی ہے جو لینڈ
اینڈ (Land End) کے نام سے مشہور ہے اور جہاں باقاعدہ چکلہ قائم
ہے جب کہ اس سے قبل یہاں بظاہر ڈیرہ دارنیاں قیام پذیر تھیں۔ پھر لالہ جی
نے زور دے کر کہا کہ یہ مکان چونکہ ایک ایسے رستے پر ہے جہاں سے شریف
گھرانوں کی مستورات ڈیرہ صاحب کی زیارت اور دوسری پرستان کو جاتی ہیں
اس لیے اس مکان کو فوراً مشکوک چال چلن والی عورتوں سے خالی کروایا جائے۔
افسوس کہ کمیٹی نے ایک اور قرارداد کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ
اندرون ٹکسالی کے تمام بازار اور محلے کوچہ شہباز خاں سمیت طوائفوں سے خالی
کروا دیے جائیں۔ اس فیصلے کے تحت میں نے یہاں کی طوائفوں کو نوٹس جاری
کر دیے ہیں اور ایک "اطلاع عام" بھی جاری کر دی ہے جسے بازاروں میں
چسپاں کروا دیا گیا۔ دلیارام بقلم خود"

اس یادداشت کے ساتھ اطلاع نامہ عام کی کاپی منسلک تھی۔
"حسب ریزولیشن ۱۹۶ جنرل کمیٹی منعقدہ ۱۲ اگست ۱۹۳۲ء اطلاع
نامہ ہٰذا زیر دفعہ ۱۵۲ (۱) الف۔ ب۔ میونسپل ایکٹ ۱۹۱۱ء جاری کیا جاتا ہے کہ
میونسپل کمیٹی لاہور نے رقبہ جات مندرجہ ذیل میں عام پیشہ ور رنڈیوں اور پیشہ
کرنے والی عورتوں کے رہنے اور کوٹھی خانوں کے جاری رکھنے کی ممانعت کر دی
ہے۔ جو عام رنڈی یا پیشہ ور عورت اس علاقہ ممنوعہ میں رہائش رکھے گی یا جو شخص
اس علاقہ میں کوٹھی خانہ جاری کرے گا۔ اس کے ساتھ بموجب دفعہ (۲) ۱۵۲
قانونی سلوک کیا جاوے گا۔ ان رقبہ جات ممنوعہ میں ان مکانات میں عام
رنڈیوں کی رہائش و کوٹھی خانہ جاری رکھنا ممنوع ہے جو شارع عام پر واقع ہیں۔
رقبہ جات ممنوعہ (۱) از قبر نوگزہ ٹکسالی دروازہ (۲) از چھوری چھیکر
تا چوہٹہ بازار جج عبداللطیف و انوشی بازار (۳) از قبر نوگزہ بجانب تکیہ بحو
مکان موسومہ "لینڈ اینڈ۔"

۲۵ اگست ۱۹۳۲ء    دستخط

مسٹر کے ایل۔ دلیارام ایم ایل سی
سیکرٹری صاحب بہادر میونسپل کمیٹی لاہور

اس اطلاع نامہ کے نچلے کونے میں مدھم نیلی روشنائی کے ساتھ لکھا
تھا: "لیکن میں نے جاگی کو بے دخلی کا نوٹس جاری ہونے سے بچا لیا۔ دلیارام"
فائل میں میونسپل کمیٹی کی اس وسیع مہم سے متعلق اس وقت کے
مختلف اخبارات کے تبصروں کے ساتھ حبیب جالل پوری کے اخبار "سیاست" کا
اداریہ بعنوان "بلدیہ لاہور اور سیہ کاری" بھی منسلک تھا۔ جس پر صاحب بہادر
نے سرسری نظر ڈالی:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہیرا منڈی اور ٹبی لاہور کی بازاری اور
فاحشہ عورتیں اس سلوک کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والی ہیں....
اس میں شک نہیں کہ موجودہ انگریزی قانون کھلے بندوں حسن فروش عورتوں کے
بالاخانہ پر ایسے حیاسوز افعال کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہے جو فنائیت کے
لیے باعث ننگ و عار ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لاہور کے ہندوؤں، مسلمانوں،
سکھوں اور عیسائیوں کا مذہب اور حمیت و غیرت کا قانون انہیں اس امر کی
اجازت دیتا ہے.... آج سوراج اور خلافت کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے
لیے قوم کے ذمہ دار اور برآوردہ افراد کو ایک ایک پیسہ کی ضرورت ہے لیکن خدا
ہی جانتا ہے کہ رات کے آٹھ بجے سے دو بجے تک خاص لاہور میں ہر روز کتنے
ہزار روپیہ حسن کی ناپاک اور مخرب اخلاق قربان گاہ پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا
ہے.... آفرین ہے صد آفرین ان نوجوان رضاکاروں پر جو گمراہوں کو گمراہی
سے بچانے کے لیے شہر کے ان مقامات میں بلا معاوضہ چوکی پہرہ کا کام دیتے
ہیں اور اس طرح اپنے دین، اپنے ملک اور اپنی ملت کی حقیقی خدمت بجا لاتے
ہیں۔ باشندگان لاہور کو انجمن اصلاح بیکاراں کی خدمت کا سچے دل سے
اعتراف کرنا پڑے گا....."

یہ اخباری تراشہ دیکھ کر وہ یکلخت اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر کوئی
آہٹ پیدا کیے ننگے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف نکل گئے۔ یہ اطمینان کر لینے کو
کہ کہیں بیگم جاگ تو نہیں رہی۔ واپسی پر وہ کچن میں سے بھی ہوتے آئے محض
یہ سوچ کر کہ بعض اوقات سنک کی ٹونٹی ہلکی سی کھلی رہ جاتی ہے اور رہ رہ کر ٹپکنے والا
پانی کا قطرہ نیند میں خلل پیدا کرتا ہے۔
یوں ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد وہ ایک بار پھر سٹڈی میں آ
بیٹھے۔

ایسے میں صاحب بہادر کو یاد آیا کہ ستمبر ۱۹۳۲ء کے اواخر میں کوچہ
شہباز خاں، بازار شیخوپوریاں، ٹبی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں آباد
طوائفوں کو جب بے دخلی کے نوٹس موصول ہوئے تھے تو انہوں نے بھی انجمن
اصلاح بیکاراں کے جواب میں مقامی باشندوں کے دستخطوں پر مشتمل محضرنامے
کمیٹی کو بھجوائے تھے۔ ان محضرناموں کے دستخط کنندگان میں زیادہ تر دوکاندار
تھے۔ چند پروفیسروں، ایک امام مسجد اور ایک روزنامہ کے ایڈیٹر کے دستخط بھی نظر
سے گزرے۔

اندرون ٹکسالی کی طوائفوں نے کمیٹی کی جانب سے فرداً فرداً نوٹس موصول ہونے پر جو انفرادی جوابات بھجوائے ان کی بیسیوں نقول فائل میں موجود تھیں۔ ہر درخواست ایک داستانِ غم تھی، جس میں جسم فروش عورت کا مجبور دل دھڑک رہا تھا۔

بازار شیخوپوریاں مکان نمبر ۱۱۳ میں رہائش پذیر طوائف، صاحب جان نے ۱۷ جنوری ۱۹۲۳ کو سیکرٹری میونسپل کمیٹی کے نام جواب نوٹس میں لکھا تھا: "عالی جاہ! سائلہ پیشے سے پیشہ ور عورت نہیں۔ طوائف ہوں، گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اگر کسی رئیس کی نوکری ملی تو کر لی ورنہ خیر۔ اللہ تعالیٰ نے سائلہ کو ایک لڑکا دیا ہے جو دیال سنگھ سکول میں جماعت ہفتم میں پڑھتا ہے.... چونکہ سائلہ سن رسیدہ ہو گئی ہے اس لیے گانا بجانا اور نوکری بالکل ترک کر دی ہے.... سائلہ پر رحم کیا جائے۔"

اندرون ٹکسالی، بازار شیخوپوریاں کی عیدو نے جواب میں لکھا تھا: "میں نے کئی برس سے پیشہ اور گانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ سنگے زئی قوم کے ایک معزز سے نکاح پڑھا لیا تھا۔ مگر عرصہ تین برس سے سائلہ کو خون جاری ہو گیا۔ جس کی وجہ سے خاوند نے طلاق دے دی۔ سائلہ اب تک اس مرض میں مبتلا ہے۔

اگر حضور کو شک ہو تو سائلہ کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ بہتر ہوگا اگر حضور خود معائنہ کریں اور اس کے بعد میرے خلاف نوٹس واپس لیا جائے۔"

یہ پڑھ کر صاحب بہادر کو یاد آیا کہ موتی بازار کی ضعیف العمر طوائف دارو نے کمیٹی میں آ کر ان کے روبرو فریاد کی تھی کہ اُسے نقل مکانی میں کوئی عذر نہیں، لیکن موتی بازار سے اس کا سامان لادنے کے لیے کوئی تانگے ریڑھے والا تیار نہیں ہوتا۔ بچے اس پر آوازے کستے ہیں اور بڑے بوڑھے اسے دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔

فائل میں ایک درخواست کے ساتھ منسلک ایک یادداشت لگی بھی ملی، جس میں سیکرٹری بہادر کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا: "اندرون ٹکسالی کے مختلف محلوں کی طوائفوں نے کمیٹی کے اس اقدام کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی شروع کر رکھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جاگی کو بے دخلی کے نوٹس سے کب تک بچا پاؤں گا۔ عجب مشکل میں ہوں۔ دیا رام بقلم خود۔"

اندرون ٹکسالی گیٹ کی طوائفوں کی طرف سے میونسپل کمیٹی، ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر پنجاب کے سامنے گزاری گئی ایک درخواست کی نقل پر سرخ ٹیگ لگا تھا۔ صاحب بہادر نے اسے پڑھنا شروع کیا: "ہم لوگ یہاں دورِ مغلیہ سے رہ رہے ہیں اور اس طویل عرصے میں کسی بھی حکمران نے ہمیں پریشان نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ سکھوں کے عہدِ حکومت میں بھی ہم محفوظ رہے۔ سرکارِ انگلشیہ کا عہدِ حکومت تو وہ ہے جس میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہم لوگ شادی بیاہ کی تقریبات میں بلائے جاتے رہے۔ راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور مہاجنوں نے ہمیں اپنی خوشی کے موقعوں پر بلایا اور ہم نے وہاں گانے اور رقص سے محفل کی رنگینی کو دوچند کیا۔

حال ہی میں جنگ عظیم کے خاتمے پر جو جشن ہوا، اس میں بھی ہم لوگوں کو شرکت کی سعادت ملی۔ پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر ان کے سامنے دہلی میں ہم نے گانے اور رقص کا شاندار مظاہرہ کیا، جو ہمیشہ یاد رہے گا۔

ہم لوگ برطانوی راج میں بھی بداخلاق اور معاشرے کے لیے خطرناک تصور نہیں کیے گئے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے جب کہ تحریک خلافت، کانگریس کمیٹی اور اس طرح کی تحریکیں شروع ہوئی ہیں اور ہمیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں بڑے پرجوش گیت گائے جا رہے ہیں۔ ہمارے گیت سیاسی اور سرکار کی نافرمانی کا عکس نہیں ہیں۔ ہم صرف فنِ موسیقی کے پرستار اور اس کے رکھوالے ہیں۔

ہمارے مخالف، ممبران کمیٹی، کانگریس یا خلافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ یورپین افسروں پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی مرتب کریں، جو ہمارے حالات کا جائزہ لے۔ ہم سرکار کے وفادار اور پُرامن شہری ہیں، اس لیے ہمیں حسبِ سابق تمام تحفظات حاصل ہونے چاہئیں۔

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

اس درخواست پر متعدد طوائفوں کے دستخط اور انگوٹھوں کے نشان ثبت تھے اور سب سے آخر میں، درخواست کے نچلے کونے پر بالکل الگ کر کے ایک انگوٹھے کے نشان کے نیچے بریکٹ میں لکھا تھا، "جاگی بائی"

اس درخواست پر جاگی کا نام دیکھ کر دیا رام برس ہا برس سے سخت حیران تھے کہ اُسے تو بے دخلی کا نوٹس جاری ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے یہ دستخط کیوں کیے۔ صاحب بہادر نے سوچا۔ شاید حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ایسا کیا ہو؛ شاید اپنی ہم پیشہ برادری کو رعایت دلانے کی خاطر۔ اگر یہ دوسری بات تھی تو یقیناً اسے ایک مان تھا، پرانے تعلق کی بنا پر۔

دیا رام کو یاد آیا کہ جس روز یہ درخواست کمیٹی میں پہنچی تھی تو اسی روز چپراسی نے اطلاع دی کہ شاہی محلے سے نو دا کنجر شرفِ باریابی چاہتا ہے۔ دفتر میں طلب کرنے پر اس نے کہا تھا: "حضور! جیت رام بوڑا کی جاگی بائی کی ایک عرض ہے۔ مجھے تفصیل تو اس نے بتائی نہیں۔ بس اتنا کہا ہے کہ حضور کا اقبال بلند رہے، کئی برس پہلے ایک عرض گزاری تھی، اسی بابت یاد دلایا کہ حضور! اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ اگر نظرِ کرم کر سکیں تو آپ کے لیے، آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں کے لیے دعا گو رہوں گی۔ حضور وہ خود کمیٹی میں حاضر نہیں ہو سکتی۔ بیمار ہے۔"

مودے کی بات سن کر جواب میں رلیا رام نے ٹیبل پر رکھی درخواست پر سے نظریں اٹھائے بغیر ایک لمبی "ہوں" کی تھی اور بس۔ مودا کچھ دیر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور اس کے بعد فرشی سلام کرتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

جانکی کی اس ایک عرضی نے کہیں کا نہیں رکھا، رلیا رام۔ صاحب بہادر نے تاسف سے دونوں ہاتھ ملے۔ پھر انہوں نے فائل بند کر دی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ کمشنر لاہور کی عدالت میں بازار حسن کی اللہ جوائی اور بیگ علی نے جو اپیل ۷ اکتوبر ۱۹۲۳ کو دائر کی تھی اس کا فیصلہ ۲ دسمبر ۱۹۲۳ء میں ہوا، جس میں اپیل نامنظور کر دی گئی اور لنڈا بازار کی چھوٹی جان اور جانو وغیرہ کی اپیل ۱۹ جنوری ۱۹۲۳ کو کمشنر کی عدالت سے رد ہوئی۔ البتہ ہائی کورٹ میں دائر کردہ اپیل پر یہ فیصلہ ہوا کہ طوائفیں صرف کوچہ شہباز خاں اور بازار شیخو پوریاں میں رہ سکتی ہیں۔

یہ سب کچھ سوچتے کرتے آج اس روز بھی وہی کچھ ہوا جو برس ہا برس سے ہوتا آیا تھا۔ اس روز بھی ان کا جی چاہا کہ اُدھر جائیں، ہو ہی آئیں۔ شاید کوئی پتا نشانی مل ہی جائے۔ ایک موہوم سی امید تھی جو بیماریوں اچانک یقین میں ڈھلنے لگی کہ ہو نہ ہو اب جانکی کا کھوج مل ہی جائے گا۔ یہ خیال آتا تھا کہ رلیا رام کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سوچے بغیر کہ اب جوانی کا کس بل نہیں رہا اور دوسرے ہارٹ اٹیک کے بعد معالج نے اوور ایگزرشن سے بچنے کا مشورہ دیا ہے۔

بیڈ روم میں بیگم کو گہری نیند سوتا چھوڑ کر وہ واش روم تک گئے، کھونٹی پر جھولتی پتلون پہنی اور برآمدے میں سے اپنی چھڑی اٹھا کر گلی میں نکل آئے۔ آج خلاف معمول صرف یہی بات تھی کہ انہیں اپنی سٹڈی کی ٹیبل پر رکھی فائل الماری میں سنبھال کر رکھنا یاد نہ رہا۔

رات کا دوسرا پہر ہو گا جب انہوں نے بھاری آہنی گیٹ کی زنجیر احتیاط سے کھولی، مبادا بیگم جاگ جائے۔ پھر گھر سے باہر نکل کر بھاری چھپکے کے سہارے انہوں نے کسی طور مین گیٹ کو باہر سے بند بھی کر دیا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا اور اس بات کا یقین سا تھا کہ گھر سے نکلتے وقت سڑک تک آتے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

ٹیمپل روڈ کے پچھواڑے سے مال تک آتے آتے انہوں نے چھڑی کے سہارے اپنی چال کو ایک حد تک توازن بنا لیا تھا۔ اس وقت انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس وقت کے احساس سے بے خبر کوئی نجومی اس بڑے صبح کی سیر کو نکل کھڑا ہوا ہے۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے بلڈنگ کی بالائی منزل کی ایک ادھ کھلی کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی ایک اینگلو انڈین لڑکی نے دونوں بازو پیچھے کی سمت موڑتے ہوئے اپنے بریزیئر کا بٹن باندھا اور مال کی سمت جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ اس وقت وہ اپنی دھن میں تھے اور نیلا گنبد کو نکل جانے والا موڑ مڑ چکے تھے۔

لنڈا بازار تک آتے آتے میو ہسپتال کی جانب نکل جانے والی ایک تیز رفتار ایمبولنس گاڑی کے سوا ان کی توجہ کا مرکز کوئی اور شے نہیں رہی۔ ایمبولنس کے ہوٹر کی آواز سن کر وہ لحظہ بھر کو رک گئے تھے اور سرخ جلتی بجھتی لائٹ کو دور تاریکی میں معدوم ہوتے دیکھتے رہے تھے، پھر آگے بڑھ آئے۔ وہ گھومتے ہوئے لنڈا بازار کے ایک تھڑے پر جاگتے ہوئے چوکیداروں نے یوں ہی وقت گزاری کی خاطر چھڑی ٹیکتی آہٹ کی ٹپ ٹپ کو لحظہ بھر کے لیے روکا، اک نظر بھر کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں الجھ گئے۔

اُدھر وہ اپنے آپ میں مگن چلے جا رہے تھے۔ ٹک، ٹک، ٹک۔ دھرم شالے سے برآمد ہوتے ہوئے قدم کے ساتھ سڑک پر چھڑی ٹیکتے ہوئے پھر وہ شاہ عالم گیٹ کی طرف سیدھا نکلنے کی بجائے بائیں ہاتھ کی گلی کو ہو گئے۔ اب وہ دوسری طرح ہانپ گئے تھے اور "نیا ادارہ" کے بازو میں رکھے ہوئے سیمنٹ کے بنچ پر ذرا سستانے کی خاطر بیٹھتے ہوئے انہوں نے سانس ٹھیک کی تھی۔

سرکلر روڈ پر بھاٹی دروازے کے سامنے نیم تاریکی میں ہوٹل کے آگے اس وقت بھی تانگے والے کئی ایک کھڑے تھے اور کوچوان سواریوں کے لیے آواز لگا رہے تھے۔

"بھئی حد ہو گئی۔ کہاں سے ملے گی تمہیں اس وقت سواری۔ جاؤ بھئی اپنے گھر جاؤ۔ بہت رات ہو گئی۔" وہ بڑبڑائے۔

یہی جگہ تھی شاید۔ بلاشبہ یہی جگہ۔ لیکن یہاں یہ سیمنٹ کی بنچ نہیں تھی ان دنوں۔ کیا اچھا وقت تھا۔ کتنا بناؤ اور بگاڑ آیا اس زندگی میں۔ کیسے کیسے ہو گئے حالات۔ ملازمت اور ملازمت کے دوران ملنے والی ترقیاں۔ شادی، بچے، گھرداری کے الجھیڑے سے آزادی ہوئی تو اس کا ہنگام اور ریٹائرمنٹ۔ پتا ہی نہیں چلا یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔ کتنا طویل سفر تھا جو کٹ گیا۔ سب رفتہ گزشتہ ہوا۔ بس رہ گئی یہ ہوک، جو کہیں اندر سے اٹھتی ہے اور چلا آتا ہوں یہاں تک۔ ارے جانکی کو بتایا تو ہوتا کہ لگ گئی ملازمت۔ کہہ دیا ہوتا صاف صاف کہ اب میں عزت دار ہو گیا ہوں، نہیں آ سکتا تمہاری طرف...... پر یہ چیت رام تک چند قدم کی مسافت نہیں طے کر پایا میں۔ انہوں نے سوچا۔

"بزرگو! خیر تو ہے؟ کہاں جانا ہے آپ نے؟؟"

ایک راہگیر نے بھاٹی کی طرف جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"میں نے جانا تو تھا آگے لیکن آج بہت تھک گیا۔ سوچتا ہوں پھر کسی روز چلا جاؤں گا۔"

"بابا جی! جانا ہے تو جانا ہے۔ اس میں آج کل کیا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے بتایئے میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو۔"

"ہاں۔ پر نہیں جا پایا ان چالیس برسوں میں۔"

"کہیں باہر تھے آپ؟ کہیں جانا ہے؟"

"نہیں نہیں، لاہور ہی میں تھا۔ بس سوچتے کرتے رہ گیا۔ اب ہمت نہیں پڑ رہی۔"

"پر جانا کہاں ہے آپ نے؟"

"چیت رام روڈ تک۔"

"ارے وہ تو قریب ہی ہے اور ہمیں بھی سیدھے ہی جانا ہے۔ میں آپ کو چیت رام پہنچا کر نکل جاؤں گا بادشاہی مسجد کی طرف۔ یوں بھی میں فجر کی نماز اکثر وہیں پڑھ لیتا ہوں۔"

"اچھا تو چلو آج یہی چلو" وہ بینچ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تانگہ داتا صاحب کے سامنے سے نکل کر روڈ پر ہولیا۔ سڑک سنسان تھی اور دونوں اطراف میں گہری تاریکی۔ وہ ابھی چیت رام روڈ کا موڑ مڑے ہی تھے کہ صاحب بہادر نے پچھلی نشست سے ہاتھ بڑھا کر کوچوان کو کرایہ تھماتے ہوئے کہا: "تانگہ روک لو میاں۔ ہمیں یہیں اترنا ہے" تانگہ رکا تو وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

"پر بابا جی ابھی تاریکی ہے اور آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تانگے پر آگے تک چلے چلتے۔"

"نہیں۔ بس۔"

"اچھا فرمایئے کس سے ملنا ہے۔ میں معلوم کیے دیتا ہوں۔"

"کوئی تھا۔ کیا بتاؤں۔ بس یہیں کہیں ایک گلی تھی۔ بس اب آپ ہی آپ ڈھونڈ لوں گا میں۔"

"اندھیرے میں کہیں ٹھوکر لگ گئی تو......"

"نہیں میں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ رام جی خوش رکھے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئی تھیں۔ تانگہ بھاٹی کی طرف پلٹ گیا تھا اور وہ ٹھیک دل دہرا آگے بڑھ گیا تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ وہ سڑک پر چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ٹھٹک کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"ہاں، یہی گلی ہے۔ پہنچ گیا میں" وہ بڑبڑائے۔

چیت رام کی ایک تاریک گلی ان کے سامنے تھی۔ تاریک اور ویران۔ انہوں نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا۔ بے شک، یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ کبھی گئے وقتوں میں سرخ رومال والے لونڈے کی معیت میں چلے آئے تھے۔ سامنے وہی چوکھٹ تھی۔ سرخی مائل سیمنٹ کے چبوترے کے وسط میں سے اوپر کو اٹھتی ہوئی وہی سیڑھیاں۔ لیکن گھر کا دروازہ بند تھا اور بند دروازے پر ایک زنگ آلود قفل جھول رہا تھا۔ بہ ہمیں بھی دونوں جانب دروازوں پر تالے پڑے تھے۔

"کہاں گئے یہ سب لوگ۔ شاید بے دخل کر دیے گئے؟ اب کہاں ڈھونڈوں اُسے؟" وہ چکرا گئے۔

دور گلی کے دوسرے سرے پر جہاں کبھی ایک لیمپ پوسٹ روشن رہتا تھا، سٹریٹ لائٹ کا ایک زردی مائل بلب روشن تھا۔ جس کی مدھم روشنی اس سیمنٹ کی ٹوٹی پھوٹی چوکھٹ تک آنے سے پہلے دم توڑ رہی تھی۔ اس وقت اس سیمنٹ کے چبوترے کے وسط میں سے اوپر کو اٹھتی ہوئی خستہ سیڑھیوں کے علاوہ کوئی اور جگہ نہ تھی جہاں وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتے۔

انہوں نے گلی کے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ کوئی راہگیر، کوئی ذی نفس، کچھ بھی تو نہیں۔ یا شاید انہیں ایسا محسوس ہوا تھا۔ پھر وہ اُن سیڑھیوں پر بیٹھ گئے، بند دروازے سے ٹیک لگا کر۔ کچھ دیر گم سم بیٹھے رہے۔ تب یکا یک انہیں سینے کی بائیں پسلیوں کے نیچے درد کی اک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور ہونٹ بھنچ گئے۔

ایسے میں انہیں بس اتنا یاد تھا کہ اس بند دروازے کے پیچھے ایک کھلا دالان ہے، سپید و سیاہ شطرنجی ٹائلوں سے مزین۔ دالان کی دائیں جانب دو حجرے ہیں۔ بائیں ہاتھ ایک صاف ستھرا باورچی خانہ، توشہ خانہ اور ایک اُجلا غسل خانہ۔ جس کے کونے سے لوہے کی ایک گول سیڑھی اوپر چھت کو نکل جاتی ہے اور چھت پر جا کر کے ساتھ ٹینکی پہ واٹس ریلنگ کا سہارا لیے پُوری گھنگرو سے اٹھنے والی آوازیں بھی سنی جا سکتی ہیں اور بادشاہی مسجد کے جاہ و حشم کسی صحن کے دیکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب صبح کے آثار نمودار ہوئے تو میونسپل کارپوریشن کے خاکروب ولائت مسیح کی نظر اُن پر پڑی۔ وہ یہ سمجھا کہ صاحب صبح کی چہل قدمی کے بعد بیٹھے ستا رہے ہیں۔ اُسے کیا معلوم کہ ابھی کچھ دیر قبل جاگی بائی کی سیڑھیوں پر بیٹھے صاحب کے ذہن میں باہم گڈ مڈ ہوتی ہوئی قدیم یادوں کا تصویری فیتہ چلتے چلتے اب لحظہ بہ لحظہ تھمتا جا رہا تھا۔ یا شاید تھم ہی گیا تھا۔

☆

# ارتباطِ قلب

## قاری شا

کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کو عصری صورتحال میں کوئی سیدھا راستہ نظر نہیں آتا یا اس کے کردار زندگی کے پیچ و خم اور اس سے بھی زیادہ اپنے ہی توہمات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ شاید یہ جزوی طور پر درست بھی ہو مگر ان افسانوں کی سالمیت، ان کا پہلو دار طرزِ روایت اور خود صورتحال کی پیچیدگی جو ان کے ذریعے محسوس اور معلوم ہو سکتی ہے ..... یہ سب خصائص کسی بھی جزوی تاثر کے بجائے متائل موجود اور متجاوب دکھائی دیتے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کے جدلیاتی ذہن کو اکہرے مطالب تلاش کرنے والوں سے وحشت ہوتی ہے اس لئے کہ سہولت کا کوئی بھی راستہ بسا اوقات ممکن ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ زندگی اور ادب کے ازلی اور ابدی تقاضے بے حد مضبوط اور باریک گرہ سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آج بھی تدبیر کے ساتھ گتھلک کو کم کرنا اس کو بھی آتا ہے مگر وہ آخری اور لازمی گرہ کو کھولنے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ اس کو توڑے بغیر کھولا ہی نہیں جا سکتا۔

نفسی، فنائی اور انداز نظر کا یہ لاتخیل تضاد یا تقابل اور ایک حد تک تجزیہ پیش کرنے کی کوشش اوروں نے بھی کی ہے مگر اس دوہری حقیقت کی جلوہ گری کسی یک رُخے اسلوب کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ "گشدہ کلمات" میں ایک طرف تو حساس مشاہدے اور بے خوف گواہی کی زبان ہے اور دوسری طرف واردات تخیل کی رسائی کا ابلاغ۔ دونوں قسم کے اظہار ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی پیہم کشمکش میں منتج کاغذ پر دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خطرے کا مقام ہے مگر افسانہ نگار دیدہ و دانستہ یہ خطرہ اپنے سر لیتا ہے اور کئی مرتبہ افراد کے تصادم پر قیاتی لہر کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے جس کے اندر دونوں عناصر پیہم تخالف اور تعاون کے دائرے بناتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ میرے خیال میں جو آدمی "متخیل سرائے" اور "زمین جاگتی ہے" کی طرح کے زوردار افسانے لکھ سکتا ہے اس کو ابہام برائے ابہام اور نمائشی مشکل پسندی کا طعنہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ عصری صورتحال میں ان افسانوں کا لکھا لازم تھا اور اگر ہم سوچ بچار کی صلاحیت سے بالکل ہی بے نیاز نہیں ہو چکے تو ہمارے لئے ان کا پڑھنا اتنا ہی لازم ہے جتنا لکھنے والے کے لئے ان کا لکھنا۔

(مظفر علی سید)

جہاں تک حامد بیگ کے تہہ دار اور پیچیدہ استعاراتی اسلوب کا تعلق ہے یہ واضح کردوں کہ ان کے اس اسلوب کا تعلق تجریدی معنویت سے نہ ہو کر تجرباتی معنویت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں لفظی ابہام کے بجائے معنیاتی ابہام نظر آتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں، منتخب اور منفرد لفظیات اور خوب صورت استعاروں کی مدد سے اپنے لیے ایک ایسا تخلیقی اسلوب وضع کیا ہے، جو ان افسانوں کو پڑھنے اور پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے قاری سے بھی کم از کم ثقافتی اور لسانی سطح پر تخلیقی ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا نثری اسلوب بنیادی طور پر نہایت ہی پُرسکون نرم اور مدھم ہے اسی لیے ان کے افسانوں میں شوریدہ اور برانگیختہ جذبات کا اظہار بھی نرم غیر جذباتی لیکن موثر انداز میں ہوتا ہے۔

(فضیل جعفری)

مرزا حامد بیگ کا افسانوی مجموعہ "گمشدہ کلمات" پاکستانی افسانے کو بالکل ایک نئی جہت دے دیتا ہے جو کسی مغربی اثر سے پاک ہمیں اپنے اجتماعی شعور کی ان گلیوں تک پہنچا دیتا ہے جن کے پیچھے صدیوں کی چھپی ہوئی روشنی چل رہی ہیں۔ جنہیں ہم بس محسوس کرتے ہیں۔ بڑی شاعری کے بطون میں، داستانوں کے اختتامی، کڑی در کڑی تسلسل میں جہاں کوئی مجرم نہیں ہوتا کوئی منصف نہیں۔ کوئی ظالم نہیں کوئی مظلوم نہیں۔ اس میں تو ہم خود ہوتے ہیں۔ سب ہم اور سب صدیوں سے!..... مرزا حامد بیگ کا ہمیں واقعی انتظار تھا......

(شمیم احمد)

تکنیکی اعتبار سے قصہ کہانی کے افسانے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کے زمانے پر پھیلے ہوئے ہیں، مرزا حامد بیگ کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی کہانی کا منظر نامہ شہر سے متعلق ہو یا دیہات سے، وہ اوپری سطح سے گزر کر اس اندرونی پرت کو چھونے کی سعی کرتے ہیں جہاں اشیاء اپنے ٹھوس پن کی بجائے مجرد ذائقوں کے ساتھ اپنی پہچان کراتی ہیں چنانچہ اُن کے یہاں تہذیب مظاہر کی بجائے ذوقی چیز بن کر سامنے آتی ہے، وہ اس ذوقی کیفیت میں کرداروں، واقعات اور ماحول کی فنی بہت کرتے ہیں اور واقعاتی کیفیات کو جیاتی سطح پر لاتے ہیں یوں کہانی کے مجموعی کیف کا تاثر میں بدل دیتے ہیں۔

(ڈاکٹر رشید امجد)

مرزا حامد بیگ کی ایک خصوصیت ہے ماحول کی گھمبیر گراں باری اور معنوی پن کو قدرتی مناظر کی کشش، فطرت اور ازلی کیفیات سے ٹکرا دینا۔ وہ ماحول اور مناظر کو پیچ در پیچ بُنتے ہیں۔

افسانہ "گمشدہ کلمات" کا پہلا جملہ ہی ہمیں افسانے میں ہونے والے واقعے یا حادثے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ شفاف آسمان پر بادلوں کے رنگین بجروں کا نظر آنا کسی ایسے حادثے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو رونما ہونے والا

ہے۔ اس سلسلہ میں خوف زدگی کے بجائے جذباتی رنگت ہو سکتی ہے اس لئے کہ آگے دنیا کا ذکر آیا ہے جس میں پرسکون انداز کارفرما ہے۔ عصر کا وقت ایک مخصوص اشارہ بن گیا ہے جو ایک طرف بیتے (جھیلے ہوئے وقت گذرنے کا احساس) تو دوسری طرف جھکنے کا نشان ہے۔ سارے افسانے میں ہم دیکھیں گے کہ بیتنے اور جھیلنے کا عمل اپنے مفہوم کے تنوع کے ساتھ جا بجا نظر آتا ہے۔

(مہدی جعفر)

یہ افسانے خارجی واقعات پر مبنی ہیں۔ کردار کی داخلی زندگی یا نفسیات پر نہیں۔ ان میں مونولوگ (monologue) یا خود کلامی نہیں پائی جاتی۔ ادیب کے جذبات و خیالات قاری پر ٹھونسے نہیں گئے۔ بلکہ اس کے برعکس افسانے کے واقعات کے ذریعے ان کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس طرح ادیب نے اس جذبات فروشانہ (Melodrama) اسلوب اور کاہلانہ بیان سے دامن بچالیا جو نئی نسل کے بہت سے ادیبوں کے افسانوں میں نقائص کے طور پر پائی جاتی ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں کہانی پن کا ایک مربوط اور مضبوط تاثر ملتا ہے۔ جو قاری کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور اسے برابر برقرار رکھتا ہے۔

(انڈاوننگ)

مرزا حامد بیگ نے پندرہ برس پہلے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ "تار پر چلنے والی" اس تحریر کے ساتھ مجھے بھجوایا تھا:

ظفر اقبال صاحب۔ لفظ کی کھوٹی چونی کو چلا رہا ہوں۔

فقیر مرزا حامد بیگ ۸۲ء

اس طرح سے انہوں نے مجھے میرا ہی ایک شعر یاد دلایا:

راس آئی ہے سخن کی گرم بازاری مجھے
لفظ کی کھوٹی چونی کو چلا دیتا ہوں میں

"تار پر چلنے والی" کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جسے میں نے فکشن سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہ تو باقاعدہ شاعری تھی۔ ویسے بھی افسانہ اور غزل کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں آ کر ملتے لگتے ہیں۔ خاص طور پر جدید افسانے کے۔

میں جو کہ غزل میں کرافٹ پر شاید ضرورت سے زیادہ ہی زور دیتا ہوں، یہ جان کر مزید خوش ہوا کہ اس فکشن نما شاعری میں ایک کرافٹس مین کی خوبیوں اور مہارت کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں محبت، شاید کائنات کا سب سے پیچیدہ اور پراسرار مظہر ہے، اس کو اتنی اصلیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان شعرائے کرام پر افسوس ہوتا ہے جو یا تو اس تجربے سے گزرے ہی نہیں اور مانگے تانگے کے تجربات پر گزر اوقات کرتے ہیں اور اگر گزرے بھی ہیں تو شعر میں بیان کرتے وقت اسے اتنے زیادہ کپڑے پہنا دیتے ہیں کہ ان میں محبت کی شکل ہی نہیں پہچانی جاتی۔ افسانے میں اگر اس طرح کی "احتیاط" برتے کا رواج جائے تو ایک سیدھی سیدھی جعلسازی کا گمان گزرتا ہے اور دوسرے کردار بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حقیقت (قاری) کا خود زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

(ظفر اقبال)

مرزا حامد بیگ کی ایک خصوصیت جو مجھے نظر آئی اور جس کی طرف ہمارے آج کے جدید افسانہ نگار زیادہ توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ افسانے کی فسانویت خارجی حقیقت سے ابھرتی ہے اور یہی قاری سے افسانے کو پڑھواتی ہے۔ میں جناب سجاد باقر رضوی کی تائید کرتا ہوں کہ "حقیقت اور خواب" معلوم و نامعلوم، موجود و ناموجود سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ حامد بیگ جب لکھنے کے لئے افسانہ شروع کرتے ہیں تو ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہوتے ہیں.... گرد و پیش کی دنیا..... ٹھوس حقائق، جن میں ہر شے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ پھر کسی موڑ پر مانوس غیر مانوس میں ٹھوس اشیا تاثرات میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور پورا افسانہ ایک علامت بن کر ذہن میں در آتا ہے اور ہم سے اپنے معنی اور جہتیں متعین کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ افسانے کی روایت سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ انہوں نے اس روایت کے بہترین عناصر کو قبول کرتے ہوئے اسے آگے بڑھایا ہے۔ جناب سجاد باقر رضوی کا یہ خیال ہے کہ مرزا حامد بیگ کسی موضوع پر افسانہ نہیں لکھتے مجھے زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ مجھے تو ان کے ہر افسانے میں نہ صرف یہ کہ موضوع نظر آیا بلکہ مجھے تو اس موضوع میں ایک انداز نظر کی کارفرمائی بھی دکھائی دی۔ مثلاً "نیند میں چلنے والا لڑکا" ایک مخصوص معاشرے پر ایک مخصوص زاویے سے طنز ہے۔ یہاں کسی قسم کی بے تعلقی نہیں۔ وہ مخلص فنکار کی طرح پورے جذبے کے ساتھ اپنے کرداروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے یہاں زوال پسند جاگیردارانہ نظام سے وہ ہمدردی کہیں نظر نہیں آتی جو ہمارے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں نمایاں ہیں اور ہمارے قاری ان کا داستانوی انداز سے مطالعہ کرتے ہیں۔ "کہانی کا بڑھاپا" میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کے یہاں بھی ابہام ملتا ہے لیکن وہیں تک جہاں تک وہ حسن ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند نقاد بھی اگر سکہ بند تنقیدی نظر اپنائیں اور وہ مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں بھی اپنی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔

(ڈاکٹر اطہر پرویز)

ایک ابھرتے فن کار نے دلکشی کے ساتھ اپنے فن پارے کو متعارف

کرتا ہے۔ مرزا حامد بیگ ایک نئے افسانوی ڈکشن کے ساتھ دنیائے افسانہ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ وہ نہ صرف الفاظ کے انتخاب اور حسنِ استعمال کا شعور رکھتا ہے بلکہ نئے الفاظ کو متعارف کرانے کا سلیقہ بھی جانتا ہے۔ افسانوں کے عنوانات کا ڈکشن کاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرتا ہے.... "مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا" "ایکٹ... یادگار محفوظ" "برج عقرب" "سرسوتی اور راج ہنس" "بابے بڑھ کا آخری گیت" وغیرہ نئے افسانوی ڈکشن کی نشان دہی کرتے ہیں اور اب ان الفاظ پر نظر ڈالیے..... گھگھر، ساحل، واکھشش، بیلائی، بست، بھادا، برہم راشی..... پاکستانی جدید افسانے میں یہ بالکل نئے ڈکشن کا اضافہ ہے۔ نئے افسانوی ڈکشن کے ساتھ نئی افسانوی سحر کو تخلیق کرتے ہیں۔ افسانہ "مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا" میں بوڑھی ماں کا گھگھر پر بندھے بچے کے لیے پتنگ کی گڈی میں گڑ ڈال کر اس کے پاس رکھنا اور یہ کہنا "جانتے ہو اس پتنگ کی گڈی میں کیا ہے؟ گڑ! ہوائیں اور بارشیں گڈی کو ٹھکا دیں گی اور تپش گڑ کو پگھلا دے گی۔ پھر وہ گھگھر سے نیچے بہہ نکلے گا۔ جا رہے گا اور اس میں سے ریشم کا کیڑا پیدا ہوگا۔ جو ریشم بنے گا، بکھارے گا۔ پھر کسی روز میرا بانی بیا اس ریشم کی ڈور کے سہارے نیچے اترے گا۔ میں اسے چھپا کر رکھوں گی۔ اسے لے کر کہیں دور نکل جاؤں گی۔" ایک نئی سحر کی تخلیق ہے جو ہمارے تخیل میں آباد دنیا اور آرزوؤں کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ مرزا حامد بیگ نہایت فنی بصیرت کے ساتھ اپنے افسانوں میں سحر کاری کے جادو جگاتا ہے۔

دھند، نور، اسرار اور خوشبوؤں سے معمور افسانوی فضا کی تخلیق، نئے افسانوی ڈکشن کے استعمال اور سحر کاری کے ہنر کے پیشِ نظر مرزا حامد بیگ میری نظر میں آج کے افسانے کا معتبر نام ہے۔

(جمیل آذر)

صاحب! ہمیں وہ تدبیر بتائیے کہ ایک ورق خط میں اس و قبح اور "وجہ" کا معنی بھر پور ادا ہو سکیں جو ہمیں متقدمہ کے کرم اور آپ کے التفاتِ خاص کی بدولت شبِ قدر کے تحفے کے طور پر یہاں نصیب ہوا اور ہم نے دو دن دو رات میں اول تا آخر ورق ورق پڑھ ڈالا۔

جی خوش ہوا کہ ہماری زبان میں کچھ لوگ ہیں جو یوں جی لگا کر، آنکھیں بچا کر کام کرتے ہیں..... اور ایک ہم بھی!

حامد بیگ، مرزا حامد بیگ، سید حامد، حامد حسین میرے سامنے ملنے والوں میں کئی ایک ہیں، آپ کے مضامین، جو ادھر چھپتے رہے ہیں (خصوصاً ہومر والا مضمون) ان کی روشنی میں ایک حامد کو دوسرے حامد سے شناخت کر لیا تھا، لیکن مرعوب نہ ہوا تھا "مغرب سے نثری تراجم" نے مرعوب بھی کر دیا۔

مختصر عرض ہے کہ:

باب ہشتم (فہرست) تو جیسا کسی اطلاعی ادارے کے شایانِ شان ہو، ویسا ہی، البتہ ۱۰۱ ادبی تراجم کا تفصیلی تعارف خاصے کی چیز ہے۔ جب تک ایک ذی علم، روشن خیال، ذی علم صاحبِ قلم نے سالہا سال کی کلاسیکی ادب پاروں کا اصل میں یا اصل سے قریب ترین زبان میں جم کر مطالعہ کیا/تقابلی مطالعہ کیا ہو، یہ تفصیلی تعارف (جو ایک درجے میں تنقیدی تعارف نامہ بھی ہو گیا ہے) تکمیل نہیں ہو سکتا۔

میں ۷۷-۱۹۷۶ء پر شاہ ولی اللہی بصیرت کا جو خاموشی سے تجزیہ آپ نے کر دیا ہے، وہ بلند بانگ ولی اللہیوں کو نصیب نہ ہوا تھا۔ Objective اسٹڈی ہونے کے علاوہ نہایت محتاط اور بے لاگ تجزیہ ہے۔ اسی طرح ص ۱۳۴-۱۳۰ پر جان گلکرائسٹ سے میر امن تک کا سلسلہ، ڈپٹی نذیر احمد، سرسید سے لے کر ہمارے زمانے میں حسن عسکری، عزیز احمد اور سلیم احمد کے تراجم اور مطالعے اور ان کے اپنے بیان کی تنقیح...... سبھی نہایت خوب ہے۔ ترجموں کے حوالے اور اقتباس دے کر اہم محققوں اور مترجموں کے کام کی اور ساہی کی بھی نسبت سے سجاؤ نمائش نگاری ہے کر دیکھنے والا خود نتیجہ نکال سکے۔ حاشیے اور تعلیقات سے کچھ کم قابلِ قدر اور آگہی بخش نہیں۔

صفات لئے ہیں (اور صحیح بات یہ کہ علمی نظم و ضبط کے ساتھ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے کہ میں چند صفات یہاں گنوا نہیں سکتا۔ عیب لئے ہیں کر دوسرے اگراف میں گنوائے جا سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر ظ۔ انصاری)

## نعت

**افتخار عارف**

دل و نگاہ کی دُنیا نئی نئی ہوئی ہے
درُود پڑھتے ہی یہ کیسی روشنی ہوئی ہے

میں بس یونہی تو نہیں آ گیا ہوں محفل میں
کہیں سے اِذن ملا ہے تو حاضری ہوئی ہے

جہانِ کُن سے اُدھر کیا تھا کون جانتا ہے
مگر وہ نُور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے

ہزار شکر غلامانِ شاہِ بطحا میں
شروع دن سے میری حاضری لگی ہوئی ہے

بہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے
جُدا ہوئے ہیں تو اب جان پر بنی ہوئی ہے

یہ سر اُٹھائے جو میں جا رہا ہوں جانبِ خلد
مرے لیے مرے آقاؐ نے بات کی ہوئی ہے

مجھے یقیں ہے وہ آئیں گے وقتِ آخر بھی
میں کہہ سکوں گا زیارت ابھی ابھی ہوئی ہے

## نعت شریف

**علیم صبؔا نویدی**

اسرارِ دو جہاں کا مقدر رسولِ پاکؐ
رعنائیِ حیات کا مظہر رسولِ پاکؐ

سانسوں کے ذکر کا ذرا جوہر بھی دیکھنا
باہر رسولِ پاکؐ ہیں اندر رسولِ پاکؐ

سجدہ کناں ہے اپنی ہر اک آرزوئے جہاں
اس معبدِ حیات کا منبر رسولِ پاکؐ

آیاتِ روشنی کے مبارک قدم کا فیض
ہم آپؐ کے ہیں آپ کا گھر گھر رسولِ پاکؐ

مَیں ہوں صبؔا سفیرِ سخن اور ہیں مری
سیرِ جہاتِ نو کا سمندر رسولِ پاکؐ

## سید مشکور حسین یاد

### سورج پوجا پہ لتا آرزو کی غزل

کیا خوب حقیقت ہے جو اظہر ہے من الشمس
جو کچھ بھی جہاں میں ہے مقدر ہے من الشمس

تن کو ذرا تاکیں تو تناور سا نظر آئے
من میں جو ذرا جھانکیں تو مظہر ہے من الشمس

کتنا بھی چلا جائے سمندر کے وہ اندر
سیپی میں سراسیمہ سا گوہر ہے من الشمس

ہے نورِ علیٰ نور جمادات کا دستور
یہ کوئلہ یہ لعل یہ جوہر ہے من الشمس

باغ آپ کا ہے لاکھ بجاتے رہیں بغلیں
کانٹا ہے من الشمس گلِ تر ہے من الشمس

یہ خاک یہ پانی یہ ہوا آئے کہاں سے
یہ آگ ہی گر گرمیِ کوثر ہے من الشمس

ایک ایک کرن جھاڑتی ہے پھونکتی ہے یادؔ
جنتر ہے من الشمس کہ منتر ہے من الشمس

## شبنم شکیل

دُور ہوا ابہام کہانی ختم ہوئی
آ پہنچا انجام کہانی ختم ہوئی

شہزادہ شہزادی رستہ بھول گئے
اور پھر پڑ گئی شام کہانی ختم ہوئی

ربط و تسلسل کا تو اس میں نام نہ تھا
مت لو اس کا نام کہانی ختم ہوئی

کس کی خاطر اب تُو دھڑکتا رہتا ہے
اے دل کر آرام کہانی ختم ہوئی

سننے والے بس تھوڑا سا صبر کریں
قصہ ہوا تمام کہانی ختم ہوئی

گزری عمر کی باتوں کو دہرانا کیا
ڈھلنے کو ہے شام کہانی ختم ہوئی

شبنمؔ اب اِک نیا سفر آغاز کریں
یاں اپنا کیا کام کہانی ختم ہوئی

## نامی انصاری

فرشِ مخمل پر جو ہم اکثر چلیں
بایقیں ہر سمت سے پتھر چلیں

دھوپ کی شدت بھی جاں فرسا ہوئی
شام ہو جائے تو اپنے گھر چلیں

بسترِ گل چند لوگوں کے لئے
ہم کہاں تک سنگریزوں پر چلیں

روحِ انساں کس طرح روشن رہے
شہر میں جب ظلم کے لشکر چلیں

خاک میں اس کی ہے خوشبوئے وفا
کیوں نہ دشتِ کربلا ہو کر چلیں

نقدِ جاں سے کوئی سودا ہو تو ہو
ہم کہاں سے لا کے نقدِ زر چلیں

فکرِ نامیؔ صاعقہ آثار ہے
چال اپنی کیسے بازیگر چلیں

## کرشن کمار طورؔ

کشادگی پہ کہاں ساعت اثر ہر روز
ہوئی ہے گردِ سفر رونقِ سفر ہر روز

نہیں ہے پھر بھی ہے اندیشۂ ضرر ہر روز
کہ ہوتی جاتی ہے یہ عمر مختصر ہر روز

کبھی کبھار ہی ہوتا ہے التفاتِ حسن
دیارِ عشق میں میرا کہاں گذر ہر روز

کہیں نہ گرمیٔ بازار سرد ہو جائے
ہے کاروبارِ جہاں اس پہ منحصر ہر روز

سراغ اس کا خدائی میں کچھ نہیں موجود
گرفتِ شب میں ہے کیوں کاسۂ سحر ہر روز

وفا کا لفظ ہے اب مجھ کو صورتِ انکار
میں اس مکان سے ہوتا ہوں دربدر ہر روز

ہوں طورؔ جس کی شناسائی سے میں شمع مثال
اسے بھی ہوتی تو ہوگی مری خبر ہر روز

## اکبر حمیدی

کبھی آیا گیا نہیں کوئی
اُن سے اب سلسلہ نہیں کوئی

فاصلے تو دلوں کے ہوتے ہیں
اور تو فاصلہ نہیں کوئی

تیری تصویر میرے ہاتھ میں ہے
دیکھ لے آئنہ نہیں کوئی

لڑکھڑاتی ہے کیوں دیے کی لَو
جب کہیں بھی ہَوا نہیں کوئی

اکثر اوقات یونہی ہوتا ہے
تجھ سے ہرگز گلہ نہیں کوئی

اُس گلی سے ہی ہو کے گذرو گے
اور کیا راستا نہیں کوئی

کس قدر بے سہارا ہیں وہ لوگ
جن کا اکبر خدا نہیں کوئی

## محشر زیدی

یہ آدمی کہ جسے حادثوں نے پالا ہے
اسی سے چشمِ تمدار میں اُجالا ہے

چمن کو فطرتِ انساں دِکھا چکی ہے آگ
ہر ایک منظرِ ارمان جلنے والا ہے

ہم انتخاب پہ اپنے یونہی نہیں نازاں
تمام محفلِ امکاں کو دیکھ ڈالا ہے

کسے ہے حوصلۂ امتحاں ہماری طرح
یہاں ہمی نے محبت کا ڈول ڈالا ہے

یہاں قصیدہ شمائل لہو کا ہر قطرہ
یہ دل نہیں ترے اوصاف کا بَھولا ہے

دلوں کا میل بتاؤ شکن جبیں پہ نہ لاؤ
یہاں تو صرف محبت کا بول بالا ہے

لہو کی نذر گزاریں دلاورانِ چمن
نئی بہار کا سورج نکلنے والا ہے

دَمک رہا ہے شبستانِ دل کا ہر گوشہ
کسی کی یاد کی قندیل سے اُجالا ہے

سماعتیں نہ بصارت نہ تاب گو یائی
کلید کھلی یہ دل تھے۔ دلوں پہ تالا ہے

نہ اپنا شوق نہ اپنی خوشی نہ اپنا غم
یہ عاشقی نے ہمیں کس ڈگر پہ ڈالا ہے

کبھی ہم اُس کے کرم سے نہیں ہوئے مایوس
اگرچہ سامنے افکار کا ہمالا ہے

جہانِ تازہ کی دیتے ہیں ہر قدم پہ نوید
ہمیں سے عرصۂ تنگ و تاز میں اُجالا ہے

تری کشادہ دلی نے بتا دیا محشر
کوئی تو بات ہماری سمجھنے والا ہے

## شاہد واسطی

رات کو اب تو اسی ڈھب سے بسر کرنا مجھے
شام ہوتے ہی طواف بام و در کرنا مجھے

کچھ نہیں لینا چمکتے ان ستاروں سے ہنوز
جو بھی کرنا ہے بس اپنی خاک پر کرنا مجھے

خواب میں آؤ گے تازہ زخم دینے کے لئے
جاگنا ڈرنا یہی کچھ رات بھر کرنا مجھے

اب نہیں کرنے کا میں اظہار غم اشعار میں
سوچنا یہ روز اور بار دگر کرنا مجھے

سوچتا ہوں یاریاں اتنی پرانی ہو گئیں
چاہئے اب تو ہر اک کے دل میں گھر کرنا مجھے

اب کہاں پر اور کب آنا ہے استقبال کو
یہ مری درخواست ہے اتنی خبر کرنا مجھے

## پی۔ایس۔جین جوہر

بظاہر زندگی کا بوجھ ہلکا کر کے ہم نکلے
گناہوں کا پلندہ باندھ کر سوئے عدم نکلے

سیاسی دوڑ کے میدان میں تیغ و قلم نکلے
وفا کی داد دینے والوں کے ہی سر قلم نکلے

وفا کے راستے کتنے کٹھن ہیں ہم نے اب سمجھا
کہ جن کو پوجتے تھے ہم وہ پتھر کے صنم نکلے

نہ مذہب کی رواداری نہ ڈر قانونِ قدرت کا
یہاں سب آدمی تو تھے مگر انساں کم نکلے

نہ جانے کن گناہوں کی سزا ہے زندگی میری
ہزاروں آفتیں ایسی کہ ہر آفت پہ دم نکلے

خبردار اے جہاں والو قیامت آنے والی ہے
کہاں جائیگی دنیا گر خدا کے گھر میں بم نکلے

کسی کی لاڈلی بیٹی کو شوہر نے جلا ڈالا
وفا کے پاسباں ہی بانی ظلم و ستم نکلے!

عذابِ زندگانی سے مفر ممکن نہیں جوہر
نہ جب تک خواہشوں کا انت ہو یا تن سے دم نکلے

## سرور انبالوی

وقتِ رُخصت آنسوؤں کی شکل میں اُس کا سلام
مُدتیں گزریں مگر بھولا نہیں ہے وہ پیام

چند آنسو یاد میں اُس کی بہا لیتے کہیں
کوئی بھی آیا نہیں ہے راہ میں ایسا مقام

تیری خوشبو سے معطر ہو گیا کمرہ میرا
گلستاں سے آئی ہے لیکر صبا تیرا پیام

اُس کے کوچہ سے گُزر بادِ صبا ہو گر تیرا
اُس کے کوچہ کے درودیوار کو کہنا سلام

شک نہیں دیوانگی میں اپنی ہم کو بھی کوئی
رہتا ہے لیکن لبوں پر ہر گھڑی تیرا ہی نام

زیست کا حاصلِ جنونِ شوق نے سمجھا اسے
عشق کو جانا ہوا ہے عقل نے سودائے خام

آدمی نے بستیوں میں زہر گھولا آپ ہی
ہو گیا ہے بستیوں میں اب تو رہنا بھی حرام

نفرتوں کی آندھیاں بپھری ہوئی اُٹھی ہیں کیا
رکھدیا ہم نے جلا کر اِک دیا بالائے بام

قبر بھی ملتی ہے جاں دے کر سرور انبالوی
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام

## جلیل عالی

شوقِ شہرت میں خیالات کو سستا نہ کیا
حرمتِ حرف کا ہم نے کبھی سودا نہ کیا

زندگی تحتیٔ الفت سے بنالی آساں
فائدے کے لئے نقصان کسی کا نہ کیا

اپنے ملبے سے بھی تعمیر اٹھائی دل نے
ورنہ دنیا نے مٹا دینے کو کیا کیا نہ کیا

راہ چلتے رہے اخلاص کی دھیمی لَو میں
خودکوخواہش کی چکاچوند سے اندھا نہ کیا

اس کی آواز پہ بھی جان لڑائی بے سود
اس نے بھی جیسا زباں سے کہا ویسا نہ کیا

امتحاں تھا وہ رفاقت تھی کہاں بس یہ کہو
بھرم اپنا بھی رکھا اس کو بھی رسوا نہ کیا

## انوار فیروز

غم بھی کیا چیز ہیں بیگانہ بنا دیتے ہیں
لوگ اس بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں

کیا مقدر کے ستارے ہیں کہ چمکیں جب بھی
یاد کے شہر کو ویرانہ بنا دیتے ہیں

دامنِ شوق میں سوکھے ہوئے پتے بھر لوں
ان کو چھُو لو تو یہ نذرانہ بنا دیتے ہیں

کچھ بھی ہو ان سے مفر دہر میں ممکن ہی نہیں
پیار کے زخم تو دیوانہ بنا دیتے ہیں

ایسے بھی لوگ ہیں دنیا میں جو مطلب کے لئے
دے کے رشوت اسے نذرانہ بنا دیتے ہیں

جانے کیا لوگ ہیں تھکتے ہی نہیں ان کے قدم
اک نیا مسئلہ روزانہ بنا دیتے ہیں

اپنے دُکھ جان سے پیارے نہ ہوں کیونکر انوؔار
یہ مرے اشکوں کو پیمانہ بنا دیتے ہیں

## پروفیسر صدیق شاہد

تسکینِ دل و جاں کے جو سامان گئے ہیں
کچھ ان کے جلو میں مرے ارمان گئے ہیں!

کٹ مرتا ہے انساں پئے حاصلِ ناحق؛
اے گردشِ دوراں تجھے پہچان گئے ہیں

تو قطرۂ نیساں ہے مرے دشت کے حق میں
تا حد و نہایت ترے احسان گئے ہیں!

گھر کس طرح محفوظ ہو تا راج گروں سے
باتوں کی سپر لے کے نگہبان گئے ہیں!

جاتی ہی نہیں تشنگیٔ صاحبِ تخلیق؛
لے کر یہی احساس سخندان گئے ہیں

شبنم کی لطافت ہے کہ تو نکہتِ گل ہے
جس رنگ میں تو ہے تجھے پہچان گئے ہیں

شاہؔد جو پس و پیش تھی وہ سوچنے تک تھی
اک بار نکل آئے تو قربان گئے ہیں!

## قیصر نجفی

بے ترتیب سی دل میں دھڑکن لئے ہوئے
پھرتے ہیں ہم لوگ لبوں کو سئے ہوئے

ملتے ہیں ہر اک سے جھینپے جھینپے سے
جیسے ہم ہوں جرم سا کوئی کئے ہوئے

جانے کیسا نشہ ہے اب تک اترا نہیں
ایک زمانہ بیت گیا ہے پئے ہوئے

آج اسی کو دار پہ کھینچ کے آئے ہیں
جس کی مسیحائی سے ہم ہیں جئے ہوئے

وہ داتا ہے کام ہی اس کا دینا ہے
کیا بتلائیں کیا کیا ہے وہ دئے ہوئے

یہ قیصر کن راہوں پر ہم جا نکلے
مر مٹنے کا جذبہ دل میں لئے ہوئے

## عبدالرحمان عبد

اس نے چاہا نہ مرے درد کا درماں کرنا
ورنہ مشکل نہ تھا مشکل مری آساں کرنا

اک نظر میری طرف اے شہ خوباں کرنا
تم کو آتا ہے بیاباں کو گلستاں کرنا

لیلی حسن کا شیوہ ہی یہی ہے شائد
عشق کو چاک جگر گریباں کرنا

زندگی میں ہے عبث دولت غم سے رونق
غم کا شکوہ نہ کبھی اے دل ناداں کرنا

ہے شب ہجر یہی اہل وفا کا معمول
لے کے یادوں کے دیئے دل میں چراغاں کرنا

ہم بھی تقدیر کے منکر تو نہیں ہیں لیکن
دل جو باغی ہو تو کیا شکوہ دوراں کرنا

ہم پہ گر جائے گی افتاد جو گرنے کو ہے
کچھ نہیں بس میں تو کیا خود کو پشیماں کرنا

عبد لگتا ہے کہ اب خیر نہیں ہے اپنی
دل نے چاہا ہے پھر اس شوخ کو مہماں کرنا

## سُلطان صبروانی

یہ آشیانوں سے اُٹھتا دھواں ہمارے بعد
نہیں رہے گا کوئی بھی نشاں ہمارے بعد

دکھائی جائے گی پھر ندرتِ بیاں ان کی
رہے گی شعر کی صورت زباں ہمارے بعد

بس ایک ہم کہ چلے جائیں گے پسِ منظر
رواں دواں یہ رہے گا جہاں ہمارے بعد

اگرچہ کر نہ سکے کچھ مگر تمنا ہے
کوئی رہے نہ یہاں خستہ حال ہمارے بعد

یہ اور بات کہ ہم خود پہ منکشف نہ ہوئے
کوئی تو ہوگا یہاں رازداں ہمارے بعد

کوئی اشارہ تو ہو سمت کے تعین کا
چلے ہی آئیں گے پھر کارواں ہمارے بعد

ہم آفتاب میں ڈھلتے گئے سنورتے گئے
وہ ایک سایہ رہا ہے کہاں ہمارے بعد

تھے جس کے مرکزی کردار ہم زمانے میں
سُنائی جائے گی وہ داستاں ہمارے بعد

## ڈاکٹر صابر آفاقی

زمیں روتی رہی پر آسمانوں سے نہیں اُترے
فرشتے کہکشاں کی نردبانوں سے نہیں اُترے

تمہارے نام کے کتبے اتارے ایک ایک کرکے
تمہارے حسن کے چرچے زبانوں سے نہیں اُترے

فریبِ صبحِ کاذب تم نہ کھانا قافلے والو
ابھی تک دیکھ لو پنچھی ٹھکانوں سے نہیں اُترے

رسالے نفرتوں کے تو سرِ بازار بکتے ہیں
صحیفے عشقِ انساں کے زمانوں سے نہیں اترے

ہزاروں بارشیں برسیں ہزاروں آندھیاں آئیں
ہمارے نام کے کتبے چٹانوں سے نہیں اترے

یہ تیری بھول تھی جو اسلحہ تن سے اتارا ہے
ابھی تک تیرے دشمن تو مچانوں سے نہیں اترے!

جو تھا بارِگراں اک زندگی کا سر سے اترا ہے
جنوں کے بوجھ لیکن میرے شانوں سے نہیں اترے

وہ دھرتی کے مسائل جان ہی سکتے نہیں صابرؔ
جو دھرتی پر کبھی آئینہ خانوں سے نہیں اترے

## محمد ظہیر

شکست میرا مقدر تھی غمگسار مرے
کریدتے ہو یہ کیا زخم بار بار مرے

میں اپنے آپ سے باہر نکل سکا نہ کبھی
زمانے پر نہ ہوئے جوہر آشکار مرے

انہیں سپردِ خزاں کر کے دم لیا سب نے
گلاب سارے تھے پروردۂ بہار مرے

وہ شیشہ ہوں میں، عموماً جو ٹوٹتا ہی نہیں
جو ٹوٹ جاؤں تو ریزے ہوں بے شمار مرے

میں جھوٹ پر رہوں زندہ کہ سچ پہ جاں واروں
ہے پیچھے تیرِ ملامت اور آگے دار مرے

اب آنکھ بھر کے مجھے کوئی دیکھتا ہی نہیں
وہ کیا نظر تھی جو ہوتی تھی آرپار مرے

نہ جی سکوں میں خوشی سے، نہ مر سکوں غم سے
یہ کس نے چھین لئے سارے اختیار مرے

ظہیر کام تو چلتے رہیں گے دنیا کے
کچھ اور وقت رہو پاس میرے یار مرے

## غالب عرفان

زہر اور آنسو امرت جان کے پی لیتا ہوں
جینا میری قسمت ہے میں جی لیتا ہوں

جاگتی رات کا پہرہ جگائے رکھے کب تک
نیند آنکھوں میں آئے تو جھپکی لیتا ہوں

آنے والا ہر لمحہ جکڑے رکھتا ہے
فارغ وقت سے کام اگر کچھ بھی لیتا ہوں

لہو کا منظر چلانے پر اُکسائے تو
آنکھیں بند کئے ہونٹوں کو سی لیتا ہوں

فٹ پاتھوں سے سستی چیزیں اپنی خاطر
اُس کے لئے سوغات مگر مہنگی لیتا ہوں

صرف اُسی کا دھیان نہیں رہتا ہے ہر دم
اپنی ذات میں بھی اب دلچسپی لیتا ہوں

سطوتِ عرفاںؔ جس کو جو چاہے وہ دیدے
نیکی اُس کو ملے تو میں بدی لیتا ہوں

## کرامت بخاری

دولتِ رنج رائیگاں میری
پر یہ دولت بھی اب کہاں میری

میں بھی گردش میں وہ بھی گردش میں
نقل کرتا ہے آسماں میری

شام کو یہ شفق نہیں ہوتی
آنکھ ہوتی ہے خوں فشاں میری

میں اکیلا نہیں ہوں تنہا ہوں
چاند راتیں ہیں رازداں میری

خوف بے مہری زمانہ سے
بزمِ انجم دھواں دھواں میری

میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا
ایسے اُجڑیں گی بستیاں میری

وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوئی
فکر تعمیر آشیاں میری

میں نے لکھی ہے داستانِ الم
لوگ لکھیں گے داستاں میری

## ڈاکٹر حنیف ترین

مرے سوال جو ہنس ہنس کے اس نے ٹالے ہیں
یہ معذرت کے نئے رنگ روپ ڈھالے ہیں

گرا کے مانیں گے سب منطقوں کی دیواریں
حوالے جن کے ہر اک فکر سے نرالے ہیں

جنہیں قبول تھی تکمیلِ آرزو دل کی
ہوئے تباہ مگر شوق تو نکالے ہیں

رہے نہ وسوسے جب سے خرد کے جھولوں میں
قدم قیاس کی پینگوں کے کیا نرالے ہیں

اُداس ذہنوں کو لفظوں کے نور کیا دیں گے
کتاب فکر کے جب حاشیے ہی کالے ہیں

جو کوہِ ردِ عمل بن کے کل اُٹھے تھے حنیفؔ
وہ احتجاج جسارت نے ہی سنبھالے ہیں

## اکرام تبسم

ساتھ ہر اک لمحے کے جاتا ہے
فرداؤں سے ملنے جاتا ہے

ہم پر بھی کچھ حق ہے دنیا کا
ٹوٹتے اور بکھرتے جاتا ہے

چہرے کی تصدیق کرانے کو
آئینے آئینے جاتا ہے

جسم اتار کے مٹی پر رکھ دو
جاتی روح کے پیچھے جاتا ہے

ایک تبسم دل میں ہے یادا گی
اور یہاں سے کیا لے جاتا ہے

## کاوش پرتا پگڈھی

پیاس کیسے بجھے قسمت میں ہے تھوڑا پانی
اور وہ تھوڑا بھی مٹمیلا کسیلا پانی

کھارے پانی سے زباں میری ہے اتنی مانوس
بدمزہ لگتا ہے جب پیتا ہوں میٹھا پانی

تجھ میں کیا مکر و ریا جور و جفا ہی بس ہے
تیری رگ رگ میں شرارت ہے اچھلتا پانی

کالے پانی کے تصور ہی سے ڈر لگتا تھا
کیا پتہ تھا کہ مقدر میں ہے کالا پانی

دن پہ کیسے کہوں کس کا ہے پانی کیسا
اپنے پانی کو سبھی کہتے ہیں اچھا پانی

مجھ پہ جو لطف و کرم بن کے برستا تھا کبھی
ڈستا رہتا ہے مجھے اب وہی اجلا پانی

متفق اس سے کہاں تک ہے کوئی کیا معلوم
ٹھنڈا ہو جاتا ہے دل پینے سے ٹھنڈا پانی

بہتے پانی کی طرف سے ہے عبث فکر تمہیں
خود بخود راہ بنا لیتا ہے بہتا پانی

بوندا باندی بھی مقدر میں نہیں ہے شاید
خواب میں بھی مرے آنگن میں نہ برسا پانی

ہوشیاری سے قدم اپنے وہاں پر رکھنا
اور گھاٹوں سے ہے اس گھاٹ پہ گہرا پانی

ایک لمحہ بھی یہاں کیسے ٹھہرتا کاوش
اٹھ گیا اس کا جب اس شہر سے دانہ پانی

## حصیر نوری

جتنے بھی رازِ دل تھے ہوئے آشکار سب
حیرت زدہ ہیں چہرے کے نقش و نگار سب

خود بٹ گئے ہیں کمتر و برتر کی صف میں لوگ
ورنہ خدا کے بندے ہیں یہ شاہکار سب

ظلم و ستم ہے عام جو دنیا میں آجکل
اک ہاتھ میں ہے سمٹا ہوا اختیار سب

احوالِ واقعی سے نہ پردہ اٹھا کبھی
بندے ہیں مصلحت کے حقیقت نگار سب

سچائیوں کو کس طرح جھٹلائے گا کوئی
لکھے ہوئے عمل ہیں وہ تاریخ وار سب

اہلِ ہنر نہ بیچتے اپنے ہنر تو پھر
کیسے توانا ہوتے یہ سرمایہ دار سب

یہ نشۂ غرورِ انا کچھ نہ پوچھئے
بندے جو تھے وہ ہو گئے پروردگار سب

موسم کے سرد و گرم کا کیا تذکرہ حصیر
ہم تم نہیں فقط کہ ہوئے ہیں شکار سب

## پروفیسر زُہیر کنجاہی

جو دشمنی ہے تری مجھ کو دوستی سی لگے
کبھی اندھیرے کے پیچھے بھی روشنی سی لگے

ہر ایک بات کو ہنس ہنس کے ٹال دیتے ہو
مجھے تو اُس کی نیابت میں دشمنی سی لگے

نہ کوئی فون نہ کوئی پیام ہی آیا ہے
مَیں سوچتا ہوں مجھے اس میں برہمی سی لگے

یہ برشگالِ تمنا کی آمد آمد ہے
اسی لئے تو ہواؤں میں کچھ نمی سی لگے

زمانے بھر کے ہیں چہرے بھی پھول سرسوں کے
یہ کیسی رُت ہے کہ مجھ کو بجھی بجھی سی لگے

سبھی عدو ہیں تو کس کس کے منہ کو بند کریں
بس ایک ہم ہیں زباں میں جو آشتی سی لگے

زُہیر سامنا کیسے کرو گے خواجہؐ کا
یہ اَور بات کہ چہرے پہ تازگی سی لگے

## ماجد سرحدی

ہر ایک آنکھ مرے حق میں کیوں عتابی ہے
مرا لہو تو ازل ہی سے انقلابی ہے

مری نظر میں کئی زاہدوں سے ہے بہتر
وہ ایک شخص جو مخلص ہے گو شرابی ہے

ہوا ہے خون کسی غمزدہ کی حسرت کا
تمہارے چہرے کی رنگت بڑی شہابی ہے

مجھے تو رنج ہے اپنی شکستِ توبہ کا
مگر بتا کہ تری آنکھ کیوں گلابی ہے

لگے جو چوٹ کسی کو تو زخم آئے مجھے
میں کیا کروں کہ یہی مجھ میں اک خرابی ہے

شفق کا رنگ ہے یا انقلاب کی آمد
فصیلِ شہر سرِ شام کیوں گلابی ہے

پلا رہا ہے وہ ہر اک کو خُم کے خُم ماجدؔ
نگاہِ دوست مگر مجھ پہ احتسابی ہے

## علی آذر

اپنی بے چارگی پہ خود سے ہی نفرت کی ہے
کب کسی شخص سے اے دوست شکایت کی ہے

قیدِ تنہائی کی ہر شخص نے دی مجھکو سزا
جھوٹ کی دنیا میں سچ کہنے کی جراُت کی ہے

مجھکو عادت نہیں جھکنے کی بتوں کے آگے
ہر رگِ جاں نے فقط اُسکی عبادت کی ہے

جو کھٹکتا تھا تمہیں دوستو کانٹے کی طرح
آج اس شخص نے اِس دُنیا سے رحلت کی ہے

زندگی میں تو نہیں آئے مرے گھر پہ کبھی
ناحق مرنے پہ مرے آپ نے زحمت کی ہے

چارونا چار مجھے ملنا ہی پڑتا تھا تمہیں
اسلئے دور بہت دور سکونت کی ہے

کس نے وعدوں کا بھرم توڑ دیا ہے آذر
کس نے اے دوست امانت میں خیانت کی ہے

## شگفتہ نازلی

جُدا سا چہرہ جو دیکھیں گُلاب کھلتے ہیں
پھر اپنی سوچ کو سوچیں گُلاب کھلتے ہیں

دلوں کی خوشیوں کی خوشبو چہار سُو پھیلے
یہ ساری رسمیں اور ریتیں گُلاب کھلتے ہیں

کریں کُچھ ایسا کہ موسم کا رُوپ ہی بدلے
شگوفے کِھلنا جو سیکھیں گُلاب کھلتے ہیں

سجے وہ زُلف میں یا کہ سجے کوئی گجرہ
پیام خوشیوں کے پہنچیں گُلاب کھلتے ہیں

تمام راستہ ہی خار بن گئے تھے بار
اب ایک بار تو جیتیں گُلاب کھلتے ہیں

تلافی ہو رہے گی ساری ہی اُداسی کی
وہ گفتگو میں جو مہکیں گُلاب کھلتے ہیں

گُزر گئے کئی موسم ہیں پیڑ ویراں سے
پرندے اب کے تو چہکیں گُلاب کھلتے ہیں!

## عادل فریدی

تجزیہ میں کر رہا ہوں وقت اور حالات کا
ہے سفر درپیش ناممکن سے ممکنات کا

سلسلہ پھیلا ہے "نامعلوم" سے معلوم تک
آدمی کی آگہی اور ناگہاں آفات کا

کیا دھریں الزام ہے بے اختیار اپنی طرح
یہ زمیں بھی ایک سیارہ ہے کائنات کا

رقص کرتی تھی ہوا شعلوں کی پائل باندھ کر
آج تک بھولا نہیں ہوں میں وہ منظر رات کا

ایک بوجھل سا تصور ایک بوجھل سا خیال
کیا بگاڑے گا مرے تازہ تفکرات کا

جس میں وعدوں کے سوا کچھ بھی نہ ہو عادلؔ فرید
صاحبو! کیا فائدہ پھر ایسی ترجیحات کا

## طالب انصاری

قریۂ سنگ میں آئنہ گری کرتا ہوں
جو مرے دل میں سما جائے وہی کرتا ہوں

ایک عادت سی ہے مشکل میں پڑے رہنے کی
راہِ ہموار میں دیوار کھڑی کرتا ہوں

کتنے لمحے میرے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں
میں جو اک لمحہ پکڑنے کی سعی کرتا ہوں

اہلِ دنیا سے محبت تو نہیں ہو سکتی
یہ بھی کیا کم ہے کہ نفرت میں کمی کرتا ہوں

جو ضروری ہو وہ رہ جاتا ہے کرنے والا
ویسے کرنے کو تو میں کام کئی کرتا ہوں

درسِ اثبات اسی بات سے سیکھا میں نے
ماسوا تیرے ہر اک شے کی نفی کرتا ہوں

جانتا ہوں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے پھر بھی
جانے کیوں تجھ کو بھلانے کی سعی کرتا ہوں

لوحِ دل پر کبھی مٹی نہیں جمنے دیتا
آبِ گریہ سے اسے دھو کے نئی کرتا ہوں

دربدر پھرتا ہوں تعبیر کی خاطر طالبؔ
خوابِ مظلوم کی یوں دادرسی کرتا ہوں

## انجم جاوید

چراغِ فکر تو روشن اک آئینہ کر دے
ہوا کے رُخ پہ یہی ایک معجزہ کر دے

مرے وجود میں گونجے اذان کی آواز
جو میرا دل ہے اسے خانۂ خدا کر دے

عجیب حال قلندر نے کر لیا اپنا
ہوا سے کہتا ہے تو مجھ کو آئینہ کر دے

یہ ایک سانپ سے کہتا تھا اک سخن جوگی
کمالِ فن مجھے تیرا تجھے مرا کر دے

میں دائرے میں مقید ہوں زندگی کے مگر
کسی کا ہے یہ تقاضا مجھے رہا کر دے

سیاہ شب سے ڈری تھی بہت ہوا انجم
پکارتی تھی کہ روشن کوئی دیا کر دے

## امتیاز احمد دانش
(آرہ ۔ بھارت)

کیوں نہیں پھر سے وہ ماحول بنایا جائے
دو فریقین کو اک میز پہ لایا جائے

عین ممکن ہے کہ کچھ فاصلے کم ہو جائیں
دائرہ ذہن کا تھوڑا تو بڑھایا جائے

تم ہی بتلاؤ کہاں کی ہے یہ دانشمندی
اپنے ہی ہاتھوں سے گھر اپنا جلایا جائے

بن نہ جائے کہیں اک داغ نما اپنا وقار
خود کو اتنا بھی نہیں خود سے گرایا جائے

آؤ مل بیٹھ کے ہم اس پہ ذرا غور کریں
پرچمِ امن کو کس طرح بچایا جائے

سوز دل سوز جگر کم تو یقیناً ہوتا
قصۂ درد مگر کس کو سنایا جائے

گر یہی مرضیٔ مولا ہے تو پھر دیر ہے کیا
"تاج کانٹوں کا مرے سر پہ سجایا جائے"

عہد حاضر کا تقاضا ہی یہی ہے دانشؔ
آئینہ داروں کو آئینہ دکھایا جائے

## رعنا پروین

کہیں پہاڑ پہ رستہ دکھائی دیتا ہے
دیا سا دور سے جلتا دکھائی دیتا ہے

کریں تو کیسے کریں اعتبار لوگوں پہ
ہر ایک سانپ ہے ڈستا دکھائی دیتا ہے

حسین رتوں کا چمن بھی اسیر ہوتا ہے
بھری بہار میں ہنستا دکھائی دیتا ہے

وفا خلوص کے موتی بہت ہی عنقا ہیں
کہیں چھپا لو چمکتا دکھائی دیتا ہے

یہ کیا ہوا کہ چھٹکنے لگی ہیں زنجیریں
مرا نصیب سنورتا دکھائی دیتا ہے

اجاڑ شاخ پہ کونپل نظر تو آئی ہے
اداس موسم بدلتا دکھائی دیتا ہے

## شہاب صفدر

بچ پہ اک شخص کے ڈٹ جانے سے
بچ گیا شہر اُلٹ جانے سے

نہ رہی خیر خبر کی صورت
خواب کا رابطہ کٹ جانے سے

بھڑک اُٹھی مری بجھتی ہوئی پیاس
اُس کے اِس بر سے پلٹ جانے سے

کیسا اندھیر مچایا شب نے
اک دیا راہ سے ہٹ جانے سے

پھر کہیں کا نہیں رہتا انسان
سایۂ خوف چمٹ جانے سے

اُس کی وحدت ہوئی مضبوط شہابؔ
میرے دو حصوں میں بٹ جانے سے

## مشتاق شبنمؔ

رفاقتوں میں کوئی رنگ بھر نہیں پائے
وہ آئینہ تھا مگر ہم سنور نہیں پائے

نہ امن و صلح کا گہوارہ بن سکی یہ زمیں
جو کام کرنا تھا ہم کو وہ کر نہیں پائے

زمیں سے تا بہ فلک ہے فشارِ تیرہ شبی
افق سے صبح کے سورج ابھر نہیں پائے

بکھر رہے ہیں مسائل کی تیز دھار پہ ہم
یہ پل صراط تھی ایسی گزر نہیں پائے

شکار ہو گئے جو مصلحت کی سازش کا
صداقتوں کا وہ اظہار کر نہیں پائے

جنہیں حیات کی حسرت تھی مر گئے وہ لوگ
جو چاہتے تھے کہ مر جائیں مر نہیں پائے

نہ مجھ سے پوچھئے! انجام ان کا اے شبنمؔ
بلندیوں سے جو اپنی اتر نہیں پائے

## حکیم خان حکیمؔ

رنج و غم کا اثر نہیں رکتا
آنسوؤں کا سفر نہیں رکتا

دیکھ لیتا میں اُس کو جی بھر کر
وقت ظالم مگر نہیں رکتا

میں ازل سے ہی اک سفر میں ہوں
ایک لمحہ بھی گھر نہیں رکتا

شب کی تاریکیاں کریں کچھ بھی
روشنی کا سفر نہیں رکتا

خواب آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
کوئی منظر مگر نہیں رکتا

آدمی کے حکیمؔ مرنے سے
زندگی کا سفر نہیں رکتا

## شہباز خواجہ

کب گوارا ہے مجھے اور کہیں پر چمکے
میرا سورج ہے تو پھر میری زمیں پر چمکے

کتنے گلشن کہ سجے تھے مرے "اقرار" کے نام
کتنے خنجر کہ مری ایک 'نہیں' پر چمکے

جس نے دن بھر کی تمازت کو سمیٹا چپ چاپ
شب کو تارے بھی اُسی دشت نشیں پر چمکے

یہ تری بزم یہ اِک سلسلۂ نکہت و نور
جتنے تاریک مقدر تھے یہیں پر چمکے

یوں بھی ہو وصل کا سورج کبھی اُبھرے اور پھر
شامِ ہجراں ترے اک ایک مکیں پر چمکے

تو ملے مجھکو کبھی وہم و گماں سے باہر!
یہ ملاقات کبھی اوجِ یقیں پر چمکے

آنکھ کی ضد ہے کہ پلکوں پہ ستارے ٹوٹیں
دل کی خواہش کہ ہر اک زخم یہیں پر چمکے

وہ جو اِک ظلم جسے شب نے چھپایا شہباز
عین ممکن ہے کہ وہ دن کی جبیں پر چمکے

## عادل حیات

رہِ حیات میں کوئی نشاں تو رہنے دوں
نہیں ہے روشنی گھر میں دھواں تو رہنے دوں

اماں زمیں پہ کسی کو ملی، جو مجھ کو ملے
دیارِ یاد میں کوئی گماں تو رہنے دوں

بہ ملا زور ہے آندھی کا ان دنوں گھر میں
دیا جلاؤں کہ شوقِ زیاں تو رہنے دوں

جتن کے بعد بھی ہوتا کہاں ہے کچھ حاصل
ہنر کو بیچ دوں، نام و نشاں تو رہنے دوں

ہوائے تیز نشانے خطا کرے گی بہت
قلم سے تیر چلاؤں، کماں تو رہنے دوں

جلن کو دھوپ کی ٹھنڈک سمجھ لوں میں عادل
انا سفر میں بھی اک سائباں تو رہنے دوں

## پرویز ساحر

کھوٹے سکوں کا اِک انبار لگا رکھا ہے
اُس نے بازار میں بازار لگا رکھا ہے

سارے عشاق وہیں جمع ہوئے رہتے ہیں
جب سے اُس شوخ نے دربار لگا رکھا ہے

اور کیا اپنی محبت کا وہ دے مجھ کو ثبوت
میرے رُخسار سے رُخسار لگا رکھا ہے

وہی جس میں کبھی تصویر چھپی تھی اُس کی
میں نے اب تک وہی اخبار لگا رکھا ہے

کس لیے جاگتا رہتا ہے یوں شب بھر ساحرؔ
تُو نے کیا خود کو یہ آزار لگا رکھا ہے

# قیاس

## جوگندرپال

میں یہاں شاہراہ کی پٹری پر سارا دن مردہ پڑا رہا، مگر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ ابھی ابھی میری آنکھ آپ ہی آپ کھلی ہے اور حیرت سے میری جان پر بنی ہوئی ہے کہ میں تو مر چکا تھا، پھر جی کیسے پڑا ہوں۔

شام کافی گہری ہو چکی ہے اور سڑک کی بتیوں سے روشنی کے فوارے پھوٹ رہے ہیں اور راہگیروں کے انبوہ کے انبوہ مخالف سمتوں میں اندھا دھند آ جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے بے خبر، بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر۔ وہ آدمی چلتے چلتے اس درخت سے ٹکرا گیا ہے اور اپنا سر سہلاتے ہوئے جوں کا توں آگے ہو لیا ہے، تو اُس کی بجائے اور ہی کوئی سر سہلا رہا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے، کیا پتہ وہ بھی میرے مانند ذیابیطس کا مریض ہو اور انجانے میں اس کے قدم اپنے آپ اٹھ رہے ہوں۔

میں اپنے وجود کو گھسیٹ کر قریب ہی پٹری کے کنارے پتھر کے بنچ پر آ بیٹھا ہوں اور حواس بجا کرنے کے لئے لمبی سانس لے رہا ہوں۔

آج صبح گھر سے نکلتے ہی مجھے کھٹکا سا ہوا تھا کہ وہ میرے پیچھے لگ گیا ہے.... نہیں، مجھے معلوم نہیں وہ کون اور کیا ہے۔ کئی دفعہ میرے خون میں شکر کی مقدار یک دم گر جاتی ہے اور وہ.... ہاں، ہمیشہ وہی.... میرے آگے پیچھے، دائیں بائیں سے مجھے آلیتا ہے.... نہیں، میں اُسے کبھی دیکھ تو نہیں پایا، تاہم مجھے یقین ہے وہ وہی ہوتا ہے۔ جب وہ میرے سر پر آ پہنچتا ہے تو خوف کے مارے میں اپنے اندر ہی کہیں غائب ہو جاتا ہوں اور اگر چل رہا ہوتا ہوں تو میری بجائے وہی چلنے لگتا ہے.... کئی بار تم مجھے کوئی اور ہی لگتے ہو، شرون، بڑے پیارے.... اپنی بیوی کی موت کے بارے میں مجھے سدا یہی خوف رہا ہے کہ وہ بیوہ ہو گی کی آس پر میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ اتنی میٹھی ہے کہ اکثر اپنی نظر بچا کر اُسے منہ سے لگا لیتا ہوں اور پھر پیشاب کی بجائے شربت خارج کرنے کی نوبت آتی ہے تو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں کہ آئندہ ہمیشہ احتیاط سے کام لوں گا۔ مگر کیا کروں؟ احتیاط برت برت کر بدن میں شکر کا نشان بھی نہ رہے تو سنبھالنے کے لئے بھوکا اور پیاسا بیٹھا ہی ساتھ دے تو دے۔

کاما سے بچاؤ کے لئے ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کر رکھی ہے کہ اِس نوعیت کی ایمرجنسی میں مجھے خوف محسوس ہونے لگے تو میں اطمینان سے مسکرانا شروع کر دوں اور مسکراتے ہوئے منہ میں میٹھی گولیاں ڈال لوں۔ میں ہمیشہ میٹھا اپنے پاس رکھتا ہوں اور اپنے بٹوے کے بالائی خانے میں میں نے ٹائپ شدہ نوٹ رکھا ہوا ہے۔ اِس میں اپنے نام اور پورے پتے کے علاوہ میں نے یہ اطلاع فراہم کر رکھی ہے کہ میں ذیابیطس کا مریض ہوں اور یہ کہ میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں بھی شکر کی گولیوں کا پیکٹ رکھا ہوا ہے۔ اِس میں سے چند گولیاں میرے منہ میں ڈال دی جائیں گی تو مجھے ہوش آ جائیگا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر آ کر مجھے یہ احساس بے چین کرنے لگا تھا کہ وہ.... ہاں وہی، اور کون؟.... میرے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر ہونٹوں میں ایک بے لباس مسکراہٹ کو جکڑ لیا اور اپنا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف لے گیا تاکہ میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں رکھ لوں، مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ بس میں بیٹھ کر کھا لوں گا اور بس اسٹاپ کی جانب تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ ایسے موقعوں پر میں ٹھیک سے سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہوں۔ سارا فاصلہ میرے سر دردوں میں بٹا ہوتا ہے، مگر میں فوراً خوف سے مسکرا مسکرا کر اپنے آس پاس گھوم رہا ہوتا ہوں.... میں بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور بار بار اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان خاتون سے ٹکرا گیا، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اُس کی گری ہوئی اشیا کو اکٹھا کرنے میں اُس کی مدد کروں، میں ویسے ہی آگے چلا گیا۔

"ایڈیٹ!"

اُسے سن کر خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک اور خاتون سے اپنے کہے کی معافی مانگنے کے لئے اُسے جھک کر سلام کرنے لگا۔ اُس بے چاری کی سمجھ میں کچھ آیا، نہ میری سمجھ میں، اور ذرا سا ٹھہر کر کندھے اچکا کے وہ اپنی راہ ہولی، اور میں منہ لٹکا کر اپنی۔

اُس وقت بھی میں اگر دو چار میٹھی گولیاں منہ میں رکھ لیتا تو بات بگڑنے سے بچی رہتی، مگر اُڑے اُڑے سے ہوش میں مجھے اِس کے سوا کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا کہ کسی طرح جب جاعت بس میں جا بیٹھوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بدستور مسکرا مسکرا کر مزید خوف زدگی سے اپنی رفتار تیز کر لی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جس سے خوف زدہ ہوں، وہ میرے ذہن میں بھی آ گھسا ہے۔ اب تو جو کچھ کرنا تھا اِسی چھلاوے کو کرنا تھا۔

میں اب پتھر کے بنچ پر بیٹھا تعجب کئے جا رہا ہوں کہ ایک بار موت واقع ہو جائے تو کوئی کیونکر جی سکتا ہے۔ میرے گرد و پیش روشنی کا فوارہ چھوٹا ہوا ہے اور سینکڑوں لوگ اندھا دھند اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہر ایک کے ذہن پر کوئی چھلاوہ قابض ہے اور وہ بے خبری میں جدھر بھی جا رہا ہے، اُسی چھلاوے کی مرضی سے ہی جا رہا ہے۔ اِسی اثنا میں ایک بے نام اور بے بس پلا مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اپنی ننھی سی دُم ہلاتے ہوئے میرے قدموں

میں آ بیٹھا ہے اور میرے جوتے چاٹنے لگا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ پٹڑی پر چلتے چلتے میں بس اسٹاپ سے بھی آگے نکل گیا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر اور کیوں جا رہا ہوں۔ میرا سر تو اتر گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں دھندی چھا رہی تھی اور ذہن میں نیند کے چٹ کھل رہے تھے۔ میں نے پوری کوشش سے اپنے آپ کو اپنے جسم کے سارے حصوں میں سے ذہن میں اکٹھا کر لینا چاہا اور اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ فوراً اندرونی جیب سے میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں رکھ لوں.... ہائیں! یہ کیا؟.... میرے ہاتھ جیب کی طرف اٹھ نہیں پا رہے تھے۔

میں نے پٹڑی پر چلتے ہوئے راہگیروں پر نظر دوڑائی اور پھر کسی کے عقب میں لڑکھڑاتے ہوئے اُسے مخاطب کرنا چاہا.... ارے بھائی!.... بھائی!.... کسی نے میری طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میرے ہاتھ پیر جواب دے رہے تھے اور ہر لمحہ میرے لئے نہایت اہم تھا۔ آخر میں ایک شخص کا راستہ روک کر اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا.... پلیز!.... میری جیب میں سے.... اُس نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے ایک طرف جھٹک دیا اور سرعت سے آگے بڑھ گیا۔

میں اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ ایک اور شخص کو روکنے کی بے تاب کوشش میں میں نے اپنے آپ کو اُس پر گرا دیا اور.... اور جہاں وہ مجھے نظر آ رہا تھا وہاں دراصل کوئی تھا ہی نہیں۔ میں آنکھیں پھاڑے نادیدہ وہاں دیکھتا رہا اور ہول سا محسوس کر کے بے اختیار چیخنے لگا.... اے لوگو! خدا کے واسطے.... کوئی خدا کے واسطے میری جیب سے گولیاں نکال کر میرے منہ میں ڈال دو.... بچاؤ!.... شاید میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں ورنہ اتنی بھیڑ میں سے کوئی تو میری طرف متوجہ ہوتا۔ شاید وہاں کوئی موجود ہی نہ تھا یا کیا پتہ میرے منہ سے آوازیں ہی نہ نکل رہی تھیں اور بدحواسی میں میں اپنے اندر ہی اندر چلائے جا رہا تھا.... یا کیا پتہ کیا؟....

پٹڑی پر پڑا اُچھل کر میری گود میں آ بیٹھا ہے اور مجھے سونگھ سونگھ کر میرے وجود پر اِس طرح منہ مار رہا ہے جیسے میں کوئی نہایت لذیذ شے ہوں۔ میں نے پیار سے جھک کر اپنے گال اُس کے منہ کے ساتھ جوڑ لئے ہیں مگر یہ خیال مجھے ابھی تک بے چین کئے ہوئے ہے کہ اگر میں مر چکا تھا تو جی کیسے پڑا۔

اپنی دانست میں میں یہاں پٹڑی پر لڑکھڑاتے ہوئے چیخ چیخ کر بدستور چلائے جا رہا تھا.... او بھائی لوگو! کوئی تو....

ایک نوجوان کے اچانک رک جانے پر میری جان میں جان آئی۔ میں نے اپنے جسم کو اُس کی طرف کھینچ کر اپنی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نوجوان اپنا ہاتھ بڑی سرعت سے میری جیب کی طرف لے گیا اور میرا بٹوا نکال کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ارے بھائی.... اے لوگو!....

نامعلوم مجھ میں اِتنا دم کہاں سے پیدا ہو گیا کہ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑنے لگا.... نہیں! میں کیسے دوڑ سکتا تھا، وہی دوڑ رہا تھا.... وہی! اور کون؟.... جو میری اِس حالت میں میری بجائے چل رہا ہوتا ہے۔ چند قدم پر ہی اُس نے میرے وجود کا بوجھ وہیں جھٹک دیا اور اُس نوجوان کے تعاقب میں غائب ہو گیا اور.... اور میں ڈھیر کا ڈھیر نیچے آ گرا۔

پِلّا میرے کندھوں پر چڑھ کر میرے منہ میں منہ ڈال رہا ہے اور مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ پٹڑی پر گرتے ہی میرا دم نکل گیا تھا.... ثبوت؟.... ثبوت کیا دوں؟ اتنی گہری نیند دم نکلنے کے سوا کب آتی ہے؟.... اور پھر میں نے اپنی اِن دو آنکھوں سے اُسے ہو بہو دیکھ لیا.... وہ کون؟.... اور کون؟.... یم دوت!.... یم دوت مجھے جھنجھوڑ رہا تھا اور اٹھنے کو کہہ رہا تھا.... چلو چلیں!.... میں گڑگڑانے لگا سو میں اُس سے کہنے لگا پہلے میری جیب سے چند میٹھی گولیاں میرے منہ میں ڈال دو.... اُس نے جھک کر میری جیب سے گولیوں کا پیکٹ نکالا اور بڑے پیار سے ایک ایک کر کے تین چار میرے منہ میں ڈال دیں اور انتظار کرنے لگا کہ میں اٹھ کر اُس کے ساتھ ہو لوں، مگر گولیاں چوستے چوستے میں از سر نو سانس لینے لگا۔

☆

## یک نہ شد دو شد بلکہ سہ شد

مشکور حسین یاد کے پہلے مجموعۂ غزلیات ''برداشت'' کے بعد دوسرا مجموعۂ غزلیات پرداخت بھی چھپ کر منصۂ شہود پر آ گیا ہے۔ یہ دونوں مجموعے قطعی طور پر اپنے انداز کے مجموعے ہیں..... سُنا ہے مشکور حسین یاد کا تیسرا مجموعۂ غزلیات ''نگہداشت'' بھی جلد سامنے آ رہا ہے..... کیا آپ مشکور حسین یاد کی غزل سے واقف ہیں......؟

☆

# سانپ اور سانپ

## ستیہ پال آنند

بیڑی سلگا کر کش لگاتے ہوئے نتارو جم کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی ابھی گرم گڑ کی چائے پی کر نکلا تھا۔ اس لئے اس کے سانس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے بیڑی کا ایک گہرا کش لیا۔ پھر اکڑوں ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی۔ گلی کے پار جو گھر تھا، اس کی چق ہل رہی تھی۔ نتارو ٹکٹکی باندھے ہوئے سامنے کے دروازے سے نکلتی ہوئی سانولی سی لڑکی کو دیکھنے لگا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پنڈت گھسیٹا رام کی بہن ہے اور وہ لوگوں پر اپنی دہشت ظاہر کر کے اس سے پیشہ کرواتا ہے۔ نتارو نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس سے بات چھیڑنے کے لئے ابھی کوئی بے فکرا گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ایک خارش زدہ کتا ضرور اس کے سامنے کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ اس نے اسے دھتکارا اور پھر ہونٹوں میں ہی کہا ”سوتی، تم جانتے ہو کہ جس لڑکی کو پنڈت گھسیٹا رام نے ماڈل آرٹسٹ کا نام دے رکھا ہے، وہ کون ہے؟ یہ سالے کی اپنی سگی بہن ہے۔ بیٹی بی بی کی مریض ہے اور جب یہ سالے اپنی بیماری کا واسطہ دے کر پیشہ کرنے سے انکار کرتی ہے تو یہ حرام کا جنا اسے پیٹتا ہے..... سوتی! مجھے پتہ ہے رات بھر کی گلی ملاری گھر پہنچی ہے، نہ جانے کس کس کے بستر تک گھر ملتی رہی ہے اور اب صبح صبح اپنے لئے اور اپنے بھائی کے لئے دکان سے دودھ، ڈبل روٹی اور مکھن خریدنے جا رہی ہے۔ جانتا ہے حرامی کا پلا کرنجی سنگھ حلوائی اسے ڈبل روٹی، دودھ اور مکھن تو مفت میں دے ہی دے گا بلکہ شاید کچھ روپے بھی دے دے۔ تھو تھو..... تھو ہے اس کمینے پر!“ اس نے تھوک دیا۔ کتے نے اس کی تھوک کو سونگھ کر دیکھا اور پھر نا امید ہو کر ذرا دوری پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

محلے کے لوگ اب جاگنے لگے تھے۔ جس چبوترے پر وہ بیٹھا تھا، اس سے ذرا دوری پر پانی کا نل تھا، جس کے ارد گرد کیچڑ جمی گندگی پر کیلے کے چھلکے بچھے رہتے تھے۔ نتارو کے پاؤں کے پاس بھی ایک چھلکا پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر بالکل راستے کے بیچ میں پھینک دیا اور دائیں بائیں دیکھ کر معصومیت سے ہاتھ جھاڑ دیئے۔ کتے نے چھلکے کو بھی سونگھ کر دیکھا اور پھر بالکل نا امید ہو کر گلی میں چلنے لگا۔

ابھی تک نتارو کے بے فکرے اور گپ باز ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ دھوپ اب چبوترے پر بکھرنے لگی تھی۔ وہ سرک کر دھوپ میں ہو بیٹھا۔ گھروں سے مردوں، عورتوں کے نہانے، اونچی اونچی آواز میں پوجا پاٹھ اور جاپ کرنے، برتنوں کی جھنجھناہٹ اور صبح کے وقت کی دیگر ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

یکا یک کالو حلوائی کے گھر کا دروازہ کھلا اور اس کی موٹی، چیچک سے بگڑا چہرے والی بیوی باہر نکلی۔ ہاتھوں میں پانی بھرنے کے لئے دو بالٹیاں تھیں۔ اس نے چبوترے کی طرف دیکھا اور پھر نفرت سے منہ پھیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نتارو نے زور سے تھوک دیا جیسے منہ میں مکھی آ گئی ہو۔ پھر ادھ جلی بیڑی نالی میں پھینک کر اس نے زور سے کہا ”ذرا دیکھ کے سوہنا!“ اور پھر پنڈت گھسیٹا رام کے گھر کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگا، جس میں سے کڑوے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ ”اب سالے کی دوسری بہن تو سی چولھا جلا رہی ہوگی۔“ اس نے پھر بڑبڑا کر کہا۔ لیکن اب اس کی بات سننے کے لئے کتا وہاں نہیں تھا۔

گلی کے ایک سرے سے اس کا لنگوٹیا یار کستا آ رہا تھا۔ ہاتھ میں بیڑی کا تازہ بنڈل تھامے کستا بے فکر سرکاری ملازم کی طرح لگ رہا تھا۔ جس کے پاس تنخواہ اور بالائی آمدنی کے روپوں کی ریل پیل ہو۔ نتارو دن کے شروع ہونے کی خوشی میں کھانسا۔ پھر اس نے چور نظروں سے رام سرن لکڑی اور کوئلہ ٹال والے کو دیکھا جو گلی کے دوسرے سرے سے چابیوں کا گچھا انگلیوں میں گھماتا ہوا آ رہا تھا۔ رام سرن اچھا کھاتا پیتا شریف آدمی تھا۔ اس کے دو بچے تھے، جو روزانہ کانونٹ بس پر اسکول جاتے تھے۔ اس کی آمدنی خاصی تھی اور وہ محلے بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن بے فکروں کے اس گروہ نے اس کی بھی ایک کمزوری ڈھونڈ لی تھی۔ رام سرن کی شادی، انہوں نے سنا تھا کہ نو برس کی عمر میں ہی ہو گئی تھی۔ اور جب اس کی بیوی پہلی بار سسرال آئی تھی تو اسے علم نہیں تھا کہ خاوند بیوی کا رشتہ کیا ہوتا ہے اور خاوند اپنی بیوی کو کیا کہہ کر بلاتا ہے۔ اس نے معصومیت میں اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ وہ اسے کیا کہہ کر پکارا کرے۔ بھائی یا بہن۔ کیونکہ اس کے بچپن میں ابھی یہی دو رشتے اس کے تجربے میں آئے تھے۔ ایک اس کی بہن کا جو اس سے بڑی تھی اور اس کے بڑے بھائی کی بیوی کا، جسے وہ بھابی کہہ کر بلاتا تھا۔

رام سرن ان کے پاس سے ہو کر نکلنے لگا تو نتارو نے منہ دوسری طرف کر کے کہا ”بھابی جیسیں ایں ایں.....“

”سیں ہیں ہیں ہیں.....“ کو اس نے کچھ یوں لمبا کر کے کہا کہ نل پر پانی بھرتی ہوئی کالو حلوائی کی بیوی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ایک عورت کے سامنے رام سرن اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور اس نے رکے بغیر ہی دو چار کھری کھوٹی سنا دیں۔

”آوارہ لوفر! شہدے! راہ چلتے لوگوں کی پگڑی اچھالنا ہے نہ کام کاج.....“ سامنے سے کستا آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے بھی بڑبڑاتا ہوا اکڑ کر گیا تو کستا نے رک کر اور دوسری طرف منہ کر کے آواز دی۔

”بھابی جی!“

کالو حلوائی کی بیوی بے شرمی اس تماشے سے لطف اندوز ہوتی ہوئی بالٹیاں اٹھائے جونہی گھر جانے کے لئے نل سے مڑی تو راستے میں پڑے کیلے

کے چھلکے سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بری طرح گر گئی۔ دونوں اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے۔ تھل تھل پلپلی جسم کو چاروں شانے چت دیکھ کر کاکا ہنسی بھی روک نہ سکا۔

"کیا ہوا بھائی؟" دونوں نے اس کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ "ارے چوٹ تو نہیں لگی؟ جانے کون سالا کیلا یہاں کیلے کے چھلکے پھینک جاتا ہے"

ٹھنڈا پانی اس کے کپڑوں پر پڑ گیا تھا اور وہ کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی پھر بھی اس نے ان کی مدد پسند نہ کی اور اٹھتے ہوئے بولی..... "دور ہو چنڈالو! ہر آتے جاتے کو چھیڑتے ہو! موئے بیکار نکھٹو مونڈی کاٹے! سارا دن چبوترے پر بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور مکھیاں مارتے ہیں۔ دور ہٹو مجھے مت چھوؤ چنڈالو!"

"بھائی! تمہاری گالیاں ہمیں لگتی کہاں ہیں؟ ہمارا تو جنم جنم سنور جاتا ہے ان سے۔ سچ مانو تو کالو بھائی کے رس گلے بھی اتنے میٹھے نہیں ہوتے جتنی تمہاری گالیاں۔"

اور وہ دونوں ہنستے ہوئے اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھے۔

دھوپ اب خوب پھیل چکی تھی۔ گلی میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ پنڈت کیسیتا رام کی پتنی مکھن اور ڈبل روٹی لے کر واپس آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے اور کپڑوں میں سلوٹیں تھیں۔ لگتا تھا کہ پنچی نگھر نے سامان اسے مفت میں نہیں دیا تھا۔

"ارے او مس بھو جان! ذرا پیچھے کو دیکھنا۔" کسنا نے پکار کر کہا اور جب وہ بغیر جواب دیے ایک کھا جانے والی نظر ان پر ڈال کر کسی ہوئی ہرنی کی طرح ان کے پاس سے گزر گئی اور گھر کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا تو کسنا زور زور سے ہنسنے لگا۔

"اسے مت چھیڑا کرو کسنے..... " تارو نے کہا "مجھے اس پر رحم آتا ہے"

کسنا کے جواب دینے سے پہلے ہی کالو حلوائی کسی کام سے باہر نکلا۔ تارو نے بڑی سنجیدگی سے آنکھ دبا کر کسنا سے کہا..... "چینی کا کنٹرول اٹھا لیا گیا ہے..... اب تو بلیک مارکیٹ بند ہو جائے گی۔"

"ہاں بھیا! کمر توڑ دی ان کی!" بازو نے پاس آتے ہوئے کہا..... وہ ان کی چوکڑی کا تیسرا رکن تھا۔

بازو کے آتے ہی انہیں کالو حلوائی سے چھیڑ چھاڑ بھول گئی۔ تارو نے اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا "کہاں تھا بے چنگیز کی کالی اولاد؟"

بازو کی داڑھی آ گئی تھی۔ اس لئے اسے کالا کہنے میں مزہ آتا تھا لیکن بازو ہنستا ہی رہتا۔ بولا "پھر تم نے میری کالی داڑھی کا مذاق اڑایا؟ استاذ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ادب سے بات کیا کرو۔ ہاں تم نے پوچھا ہے کہ کل کہاں تھا..... رام بن کی سادھو پر جوگیوں کے ڈیرے میں گیا تھا۔ ایک پہنچا ہوا سادھو آیا ہے۔ دھونی رما کر بیٹھا ہے۔ کھوپڑی فرتے سے ہے۔ انسانی کھوپڑی میں ہی پانی پیتا ہے اور کھوپڑی میں ہی چاول پکا کر کھاتا ہے۔ کل شام چھالے نے بتایا تو سوچا درشن کر ہی آؤں۔"

"تو درشن کئے؟" کسنا نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔

"درشن ذرا لمبے ہوتے جا رہے ہیں..... لب دیوی دیا ملتے کہاں ہیں؟" تارو نے مڑ کر گزرتی ہوئی رام پیاری دلّی کی طرف دیکھا اور پھر پکار کر کہا "چھوت لبو چھاگ چھال.....!"

"چھوت لبو چھاگ چھال!" باقی کے دونوں نے ایک آواز ہو کر دہرایا اور ساتھ ہی کہا "میری اوم میری اوم!"

تینوں اپنا اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد زور زور سے ہنسنے لگے۔

یہ فقرہ رام پیاری دلّی کو چڑھانے کے لئے کہا گیا تھا۔ رام پیاری کا اپنے نکھٹو خاوند میری اوم سے اکثر جھگڑا رہتا تھا اور ایک بار ان چاروں نے نل کر اس ادھیڑ عمر کی عورت کو الجھا لیا تھا۔ اس سے ہمدردی جتائی تھی اور بیچاری دلّی کا پیٹ کرنے والی محنت مزدوری سے کچھ روپے بچا کر اپنے بال بچوں اور نکھٹو خاوند کا پیٹ پالنے والی عورت کے منہ سے نکل گیا تھا..... "کیا کروں، جورو پہ چھوت لبو چھاگ چھال کرواتی ہوں مسٹنڈا لے جاتا ہے" اس دن سے رام پیاری دلّی کو چڑانے کے لئے ان کے ہاتھ میں ایک انمول فقرہ آ گیا تھا۔ رام پیاری کو دیکھتے ہی تڑاق سے تیتری کی طرح یہ فقرہ رسید کر دیتے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگتے۔

رام پیاری آنچل کھینچتی ہوئی کھسیانی بلی کی طرح چپ چاپ گزر گئی تو بات چیت گھوم کر اسی موضوع پر آ گئی۔ تارو نے پوچھا "ہاں تو بازو تم اس سادھو کی بات کر رہے تھے"

"بس کچھ نہ پوچھو بھیا۔ سادھو تو پورا پہنچا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ میں نے یونہی ذرا اس کی قابلیت اور گیان جاننے کے لئے ویدوں کی بات چلائی تو کہنے لگا "تو کیا جانے بیٹا۔ اصلی سنسکرت کے وید تو پچھلی لام سے بھی بہت پہلے جرمن یہاں سے چوری چھپے لے گیا تھا۔ نازیوں کے لالچی پنڈتوں سے خرید کر....."

بات بڑی عجیب سی تھی۔ کسنا نے سانس روک کر پوچھا "تب؟"

"..... اور اپنے سوامی دیا نند سرسوتی جی نے واپس منگوائے تھے۔ ورنہ کون جانے بھارت کی ایک انمول چیز وہیں جرمنی میں رہ جاتی۔ تب میں نے پوچھا کہ جرمن نے آخر ہمارے ویدوں گرنتھوں سے لیا کیا تھا؟ تو ہمارے سادھو مہاراج ہنس کر کہنے لگے بھولے ہوا؟ ارے جرمن بھی تو ہمارا آریہ بندھو بھائی ہے۔ یہ جتنے ہوائی جہاز، ایٹم بم اور دوسرے ہتھیار..... ارے ان کے بنانے کی ودیا اور نسخے تو ویدوں سے ہی سیکھے ہیں جرمن نے۔"

نا رو اور کسنا کی آنکھیں کپاٹ سی کھل گئیں۔ کسنا بول اٹھا "یہ بات!"

"ہاں اور بات سچ بھی ہے کسنا..... رام جانے میر اول تو پہلے بھی کہتا تھا کہ یہاں گاندھی جی کا نشان سواستک ہمارے ہی دھرم کا نشان ہے ارے بھائی، اگر جرمن انگریزوں کا ماموں نہ ہوتا تو ولایت کو کب سے اڑا چکا ہوتا۔"

کسنا اور نا رو دونوں بہت متاثر دکھائی دیے۔ کسنا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پنڈت گھسیٹا رام اپنے دروازے سے لنگڑاتے ہوئے باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور چہرے پر جابجا تیزاب سے جلنے کے داغ تھے۔ اس کے نچلے ہونٹ پر تازہ زخم اب بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے آ کر پوچھا۔

"کیا بھائی، تم نے مجھے بلایا تھا؟"

نا رو نے ایک سکوڑ کر کہا..... "کسنا نے نہیں، میں نے بلایا تھا پنڈت..... "اور ساتھ ہی وہ مجذوب سے پرے اٹھ کھڑا ہوا" کل رات تمہارے گھر میں کسی کو مار پڑی تھی؟"

پنڈت نے ایک لمحے کے لئے اپنے مد مقابل کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں، ایک لمبے وقفے کے لئے ایک دوسرے پر مرکوز رہیں۔ پھر اس نے نظریں گھمائیں۔ ہونٹ کو خم دے کر کہا "تمہارا اس سے مطلب؟ میرے گھر میں کسی کی مار پٹائی ہو یا نہ ہو، اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟"

"نہیں پنڈت..... "بارو نے ان دونوں کے بیچ میں آتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ کل شام جو میں کوتوالی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو منشی نجابت علی ہیڈ حوالدار نے آواز دے کر مجھے بلا کر پوچھنے لگا کہ اپنے محلے میں ڈولی گھسیٹا رام نام کی کوئی لڑکی ہے؟ میں نے کہا ہاں ہے لیکن اس کا نام ڈولی گھسیٹا لال نہیں، ڈولی زلیا لال ہے۔ اور وہ "ڈولی آرٹل" کے نام سے جانی جاتی ہے، اور وہ اپنے دوست پنڈت گھسیٹا لال کی..... وہ..... کیا کہتے ہیں، کچھ منگیتر قسم کی ہے اور اس کے ساتھ ہی رہتی ہے..... اب تم جانو پنڈت، بات تو بس اتنی ہی ہوئی، مگر جانتے ہو نجابت علی خان بڑا کائیاں ہے۔ اڑتی کے پر کتر لیتا ہے۔ بات کوئی نہ کوئی ضرور ہوگی، کوئی رپورٹ..... کوئی ہنگامے، شور و غل یا مار پیٹ کی شکایت..... محلے میں سے کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر اپنا سوہن پہرو تو اس بات کے لئے مشہور ہے۔ باپ بیٹے پر چغلی کھاتا ہے یہاں! ادولٹی سنگھ کے منجر کا قصہ تو تمہیں معلوم ہی ہے....."

پنڈت گھسیٹا رام کا رنگ زرد پڑ گیا۔ نا رو نے آنکھ میچ کر کے شریفوں کے سے انداز میں کہا "منشی نجابت علی یہ بھی کہتا تھا کہ ڈولی پنڈت کی بہن ہے زلیا لال سے اس کی شادی ہوئی اور بعد میں اس نے اسے چھوڑ دیا۔ تب سے تمہارے پاس رہتی ہے، اور تم نہ جانے لوگوں کو کیا کیا کہتے ہو کہ تمہاری کیا لگتی ہے۔"

پنڈت کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک بار بارو سے نا رو اور پھر نا رو سے بارو کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ پھر لنگڑاتا ہوا چپ چاپ گھر واپس چلا گیا۔

نا رو نے کہا "رات مار مار کر ادھموا کر دیا ہے بے چاری کو تبھی وہ دھرم سنگھ کے ساتھ نہیں جاتی تھی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر..... ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو پہلا گاہک چھوڑ کر گیا تھا اُسے۔ کہتے ہیں اسے ٹی بی کی بیماری ہو گئی ہے۔ خدا کا خوف بھی نہیں سالے کو۔ ابھی تو اور جیا زادے کے پیچھے گر جا گھر بھی جاتا ہے!!" اس نے زور سے تھوک دیا۔

دھوپ اب خوب کھل اٹھی تھی۔ گلی میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ چوک رشید کی طرف سے آنے والے ہوکر کے اخباروں کے بنڈل اٹھائے ہوئے تھے۔ اردو میں "ملاپ"، "پرتاپ"، "ویر بھارت" اور "زمیندار" اخبار صرف ایک ایک آنے میں بکتے تھے، اور دوسری جنگ عظیم کی خبریں، کانگریس اور مسلم لیگ کی بات چیت، انگریزوں کی حکمت عملی، ہندو مسلم فسادوں اور دیگر لوکل خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ موہن پورہ بنیادی طور پر ہندو آبادی تھی اور لٹی ہاتھ کے ساتھ ساتھ بسی ہوئی تھی۔ اس لئے چوک میں ملاپ پرتاپ وغیرہ ہندو اخبار زیادہ بکتے اور پڑھے جاتے تھے۔ لیکن "زمیندار" بھی کچھ لوگ شوق سے پڑھتے تھے۔ حاجی لق لق کا گپ شپ کا کالم بھی لطف دے جاتا تھا۔ گاندھی کی بکری اور لنگوٹی پر ایک طنزیہ نظم بھی تو چھپتا تھا۔

نل پر پانی بھرنے والوں کی گنتی تو زیادہ تھی ہی۔ اگر کچھ کمی تھی تو کھیلنے والے بچوں کی، تو وہ بھی بلو اور لالی کے آنے سے پوری ہو گئی۔ بلو اور لالی نا با جو کرشن لال کے لڑکے تھے، جن کی عمر ابھی سکول جانے کی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں رنگ پھینکنے کی پچکاریاں تھیں اور وہ کچا پکا سبز اور سرخ رنگ ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔

"ہولیاں شروع ہو گئیں ہیں؟" کسنا نے بلو کو پکار کر پوچھا۔

"ہاں چاچا! آج تیسری ہولی ہے" بلو نے جواب دیا اور ساتھ ہی اس پر رنگ پھینکنے کے لئے پچکاری اٹھائی۔

"نہ بچے آج نہیں، آخری ہولی کے دن جی بھر کر رنگ پھینکنا۔" بارو نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور پھر چڑی سی لگا کر بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔ "آج صبح کی خاص خبر تو سنانا ہی بھول گیا..... اس سالے پنڈت گھسیٹا رام کے سامنے سنانی چاہئے تھی!"

"تو اب سنا دے بارو، لے ادھر سردیا بھی آ گیا!" نا رو نے چکڑی کے چوتھے رکن کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے کہا..... "سروپ بھیا، تمہاری بڑی لمبی عمر ہے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔"

"کام میں پھنس گیا تھا یار اودم۔ یہ پنڈت جی ہیں یا اپنے رادھے رامن؟ ان کا لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ پانچ ہزار روپے چرا کر۔ وہیں رہا

سویرے سے لے کر اب تک!"

وہ بیٹھ گیا تو بازو نے اپنی سلگائی ہوئی بیڑی اسے تھمادی اور پوچھا "رادھے ارائن تو بڑا غریب سا برہمن ہے اس کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا؟ ڈاکا نیا بنک میں بھی رکھ سکتا تھا۔ گھر میں کیش رکھنے کی کیا پڑی تھی اُسے؟"

"بھولے ہو بازو تم بھی! اس سالے اپنے بڈھے سسر کو زہر کس لئے دیا تھا اس نے؟ اس کے پاس جاکر اور کے بیچے جانے پر لی ہوئی رقم جو بڑی تھی گھڑے میں دبا کر پلنگ کے نیچے زمین میں!" پھر ذرا توقف کے بعد اس نے پوچھا "ہاں تم کیا خبر سنانے والے تھے؟"

بازو نے بیٹھے گھسیٹا رام کے گھر کے بند دروازے کی طرف دیکھا "سسرے کی بہن سویرے سویرے بچی سنگھ داری والے کے کمرے کے اندر گھس رہی تھی۔ وہ اسے بازو سے پکڑے ہوئے تھا۔"

نارو نے زور سے زمین پر تھوک دیا۔ "چھوڑ یار ے بات گندی! زبان گندی! کسی دن پہنچ جائے گا یہ بھی کرتا توں کے دوزخ میں!"

☆

یہ دوز کی بات تھی۔

... نارو نار چند ستھی

... بازو بہاری لال بھسی

... کرتا کشن لال کوہلی

... سرجا سروپ چند سکھروال

ایک ہی محلے کے چار بے فکرے اپنے گھروں سے پیٹ بھر روٹی کھاتے ہی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس چبوترے پر آبیٹھتے۔ محلے کے بوڑھوں، جوانوں، مردوں، عورتوں کی کمزوریاں ان سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ شہر کی ہر خبر کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ اگر کوئی شریف الطبع انسان ان کی گرفت میں نہ آتا تو بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کو چڑانے کا سامان پیدا کر ہی لیتے تھے۔ گالیاں کھاتے لیکن چوں تک نہ کرتے۔

کون تھے یہ چاروں؟ ہم عمر بے فکرے کچھ لوگوں کی دانست میں مسٹنڈے، راہ چلتے لوگوں پر آوازے کسنے والے، سارا دن گپیں ہانک کر وقت ضائع کرنے والے۔ یہ چاروں بہرحال جرائم پیشہ یا غنڈے نہیں تھے۔ کسی نے انہیں چوری کرتے ہوئے یا راہ چلتی لڑکیوں سے مذاق کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی بیڑیوں کی دلالی کرتا ہے یا جوا خانہ چلاتا ہے یا جیب تراشوں کے گروہ کا سرغنہ ہے۔ سب ان سے نالاں تھے۔ ان کی قینچی کی طرح کتر کتر چلنے والی زبان سے پریشان تھے۔ ان کے ٹھٹھا تحول کرنے کی عادت سے ہراساں تھے۔

۱۹۴۳ء کا یہ دور بھی تاریخ ساز تھا۔ دوسری جنگ عظیم بس اب ختم ہوا ہی چاہتی تھی۔ چاروں کے والدین جنگ کے شروع میں ایک ہی گاؤں سے اپنا بوریا بستر اٹھا کر پنڈی آگئے تھے۔ گاؤں میں کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں تھا، اس لئے پانچ برس پہلے لیا گیا یہ فیصلہ جو چاروں کنبوں نے قبول کرلیا تھا انہیں کچھ راس آیا بھی، کچھ نہیں بھی۔ گاؤں کا نام کوٹ سارنگ تھا۔ ضلع اٹک کا یہ دور افتادہ ڈھول میں نا ہوا گاؤں، صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چلا آرہا تھا۔ بولی ٹھٹھول طرار، طنز باز لوگوں کا یہ گاؤں اس بات کے لئے مشہور تھا کہ وہاں کوئی کسی کو نہیں بخشتا تھا۔ ایک کہاوت نے اس سچائی کو امر کر دیا تھا۔ کہاوت پنجابی میں تھی اور کچھ یوں تھی۔ "گوڑ خوشابوں، ٹھگ لاہوروں، جھگڑو وی چنیوٹوں..... پیو پترے تے چگلی ماری، سارا واں آئے کوٹوں!" یعنی جھوٹ جوہر ہے شہر خوشاب کا، ٹھگ لاہور کے مشہور ہیں۔ جھگڑا چنیوٹ شہر کی خوبی ہے اور کوٹ سارنگ اس بات کے لئے شہرت رکھتا ہے کہ یہاں باپ بیٹے کے خلاف چغلی کھانے سے باز نہیں آتا!"

صرف پانچ برس پہلے یعنی جنگ کے شروع ہونے کے فوراً بعد جب یہ چار کنبے اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ کر راولپنڈی پہنچے تو ڈھوک رتہ سے آتی ہوئی سڑک کے دائیں کنارے پر یہ علاقہ ویران اور غیر آباد تھا۔ جب لئی نالے میں کبھی کبھی سیلاب آجاتا تو ایکڑوں تک یہ زمین زیرآب ہوجاتی۔ پھر کچھ لوگوں کو سوجھی کہ اس بنجر غیر آباد زمین سے سونا اگلایا جائے تو جاٹوں سے اراضی کے قطعہ جات خرید کر ایک سال میں ہی سڑکوں، گلیوں اور احاطوں (مکانات کی تعمیر کے لئے پلاٹ) کی درجہ بندی کر کے نمبر لگا دیئے گئے۔ نام رکھا گیا، موہن پورہ۔ یعنی ہندوؤں کے کرشن بھگوان کے نام کی نسبت سے وجود میں آتے ہی بس گئی اور ایک کے بعد ایک مکانات تعمیر ہوتے گئے۔ چک لالہ چھاؤنی قریب ہونے کی وجہ سے پنڈی شہر نے خوب فائدہ اٹھایا۔ نوکریاں عام تھیں۔ کاروبار چمک رہا تھا اور لوگوں کی چاندی تھی۔

نارو، بازو، کرتا اور سرجا کے والدین نے آکر پہلے پہل چھوٹے موٹے کام شروع کئے۔ چھابڑی اور کھوکھے کے لنڈال اور خیاری کی دکانیں خوب چلیں، لیکن آہستہ آہستہ کام دھیما پڑتا گیا اور چاروں گھر نیم متوسط طبقے کے گھروں کی طرح صرف گزارا کرنے کی مالی حیثیت کے زمرے میں ہی آگئے۔ تو بھی روٹی کی فکر نے ابھی ستانا شروع نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا تو کچھ لوگوں نے کوٹ سارنگ واپس جاکر اپنی جدی جائدادیں اور زمینیں بیچ دیں اور روپیہ لے کر مستقل طور پر پنڈی آگئے۔ یہ چاروں خاندان بھی انہی میں سے تھے۔ اور جائیدادوں کی فروخت سے موصول ہوئی رقمیں کھا رہے تھے۔

چاروں نوجوان جو اپنے خاندانوں کے پنڈی آکر بسنے کے وقت پندرہ سولہ برس کے تھے اب بیس اکیس کے لگ بھگ تھے۔ لیکن ان میں کوٹ سارنگ کی "باپ کے بیٹے پر چغلی کھانے کی عادت" بدرجہ اتم موجود تھی۔ بولی

باڑی اور طنز طرازی انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے بڑوں کے گوے میں
رچی ہوئی تھی۔ پنڈی آنے کے بعد یہ رنگ کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا تھا۔ مشہور تھا
کہ سوتے میں بھی ان کی ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔

نارو کا اصلی نام راجندر تھا۔ وہ لالہ سوہن لعل کا پہلوٹھی کا لڑکا تھا۔
بارہ برس کی عمر میں کوٹ سارنگ سے ہی وہ سر کے بال منڈوا کر اگلے سادھوؤں
کی ایک ٹولی کے ساتھ گھر سے نکل گیا تھا۔ دو برس کے بعد جب اس ٹولی کا
گذر اس کے ننھیال کے گاؤں چکل پہ مراڑ کے قریب سے ہوا تو اس کی نانی نے
جو سادھوؤں کی بہت عقیدت مند تھی اُسے پہچان لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گئی
جہاں سے وہ لوٹ کر کوٹ سارنگ آ گیا۔ ان دو برسوں میں اس نے بہت سے
ہنر سیکھ لئے تھے سانپ پکڑنے کے فن میں وہ ماہر تھا۔ کچھ پلوں میں ہی وہ اپنے
چھو منتر سے گھروں میں سے سانپ نکال لیتا اور پھر دہشت زدہ لوگوں کے سامنے
ہی اُسے اپنے بس میں کر کے ہار کی طرح گلے میں ڈال لیتا۔ یہ بات مشہور تھی کہ وہ
سانپ کی موجودگی کو سونگھ لیتا ہے۔ کسی محلے میں جاتے جاتے وہ کسی گھر کا دروازہ
کھٹکھٹاتا اور اونچی آواز میں کہتا "بہنا! تمہارے گھر میں ناگ کا باس ہے۔ چاہو تو
ابھی پکڑ لوں۔ میری دکھشنا صرف پانچ روپے ہے۔" اگر گھر والے رضامند ہو جاتے تو
اسی وقت پانچ روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ناگ پکڑوا لیتے لیکن اگر وہ ضد پر اڑ
جاتے تو پھر ان کے گھر یا باہر سانپ دکھائی دینے لگتے۔ پھر نارو کی دکھشنا بھی بڑھ
جاتی اور وہ پانچ روپے کے بجائے گیارہ روپے وصول کرتا۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے
تھے کہ وہ خود گھروں میں سانپ چھوڑ دیتا ہے اور پھر کسی جڑی بوٹی کو ہاتھ پر مل کر
ان کے بلوں سے نکلنے والی بُو کے زیر اثر سانپ کو واپس اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ منتر
پڑھنا تو صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے ہے۔

اب اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ دیکھنے میں خوبرو نوجوان تھا۔
ماں باپ سے اس کی کبھی بنی نہیں تھی۔ کبھی کبھار سانپ پکڑنے کی اپنی ٹھیک کمائی
سے وہ کچھ روپے ماں کو دے دیتا۔ صبح وہ گھر سے چائے پی کر باہر نکل جاتا۔
دوپہر کا کھانا بھیجاں مہری کے تندور پر کھاتا اور شام کو دیر سے گھر جا کر ڈھک کر
چھینکے میں رکھا ہوا کھانا نکال کر گرم کئے بغیر کھا لیتا۔ اور ڈیوڑھی میں پڑ رہتا، جہاں
اس کی چارپائی پر ہر وقت ایک دری بچھی رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کا باپ
اس لئے اس سے ڈرتا ہے کہ اس کی چارپائی کے پایوں کے ساتھ سانپ لپٹے
رہتے ہیں، لیکن ایسا کسی نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

نارو کی ماں کو محلے والوں نے "منگی" نام دے رکھا تھا۔ وہ بالکل
چھوٹے سے قد کی گول مٹول منگی سی عورت تھی۔ نارو کے باپ سے اس کی عمر بیس
برس کم تھی۔ تبھی ہر برس ان کے ہاں کوئی نہ کوئی بچہ ضرور ہوتا۔ جس برس ان کے
ہاں کوئی اولاد نہ ہوتی، نارو کا باپ اپنی بیوی کا علاج حکیموں سے کروانے لگتا۔
نارو کی ماں اپنی پڑوسنوں پر شک کرتی کہ انہوں نے کوئی جادو ٹونا نہ کر دیا ہو۔
نارو دل میں بڑا کڑھتا لیکن ماں باپ کے سامنے زبان نہ کھول سکتا۔ یہ اس کی
کمزوری تھی۔ جب کوئی شخص اس کی چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازی سے تنگ آ کر
جواب میں اس کے ہر برس ایک بھائی یا بہن ہونے پر طنز کرتا تو اسے چپ ہوتے
ہی بن پڑتی لیکن پھر بھی تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ کہتا "میرے ماں باپ کوئی
نہیں ہیں۔ میں تو سادھو فقیر ہوں۔ یہ طعنہ میرے لئے نہیں ہے۔"

"تو کیا آسمان سے گر پڑا تھا تو؟" ایک بار کوٹ سارنگ سے ہی
پنڈی ہجرت کر کے آئی ہوئی رام پیاری والی نے پوچھا تھا۔

"ہاں...." نارو نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔

"ارے مجھے کیا کہتا ہے؟" رام پیاری بولی تھی "انہی ہاتھوں سے تو
تجھے جھلایا تھا۔"

"تو ت لیو جھاگ جھال کر.... ہیں ما؟".... نارو نے پھر چوٹ
کی تھی اور رام پیاری کو بھاگتے ہی بن پڑی تھی۔

نارو کو اگر اس کی چنڈال چوکڑی کا سردار کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ بری
شرارت اسے ہی سوجھتی تھی۔ جہاں دوسرے لوگوں کے سکینڈل ان کی کمزوریاں
اور ذاتی راز وہ چٹخارے لے لے کر بیان کرتا، وہاں پنڈت گھسیٹا رام کا ذکر چھڑ
چھڑتے ہی اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ چنگاریاں
بن بن کر اڑنے لگتے۔ طنز آمیز اور مزاحیہ لہجہ تلخ ہو جاتا۔ وہ اسے منافقت کے
نام پر ایک بدنما داغ تصور کرتا تھا۔ ایک بھائی جو بھائی ہو کر بیمار بہن سے پیش
کرتا ہے لیکن عجیب بات تھی کہ وہ ڈولی سے ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا۔ کئی
دنوں سے اس کے دوست دیکھ رہے تھے کہ ڈولی کے سامنے آتے ہی اس کی
آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر ہو جاتی ہیں۔ وہ انھیں بھی ڈولی پر آوازے کسنے سے
منع کرتا۔ ڈولی اس کے خیال میں ایک لٹا ہوا قافلہ تھی جو اجاڑ راہوں پر گرتے
پڑتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس لئے نارو کی اس میں دلچسپی کی کوئی وجہ ظاہر نہیں
ہوئی تھی پھر بھی اس کے دوست دیکھتے تھے کہ ڈولی کا ذکر آتے ہی وہ کچھ عجیب سی
حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ ڈولی بھی گذرتے ہوئے کبھی کبھی اس کی طرف
پھڑ پھڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی جیسے ان دونوں میں کوئی گہرا پوشیدہ راز ہو۔

کہتا تھا تو غریب نادار والدین کا بیٹا" مگر سبھی جانتے تھے کہ وہ شاہ
خرچ ہے۔ کبھی کبھی رام لیلا کمیٹی یا گو شالا کو اس قدر دل کھول کر چندہ دیتا کہ
دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ ایک بار اس نے سب خرچ خود کر کے یگیہ ہون
وغیرہ کے ساتھ پوجا پاٹ بھی کروائی تھی کہ مندر کی اونچی سیڑھیوں سے گر کر مر
جانے والی لنگڑی گائے کی موت کا کلنک محلے والوں کے سر سے دور ہو سکے۔
سب لوگ جانتے تھے کہ اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں، لیکن اس کی غریب
پروری اور دیا دلی کو دیکھ کر کوئی بھی یہ بات اس کے سامنے کہنے کا حوصلہ نہیں کر
سکتا تھا۔ اس کے تین دوستوں پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ کوئی ناجائز کاروبار
یا جرم نہیں کرتا۔ صرف اپنی مردانہ طاقت اور جوش مردی کی کمائی کھاتا ہے۔
"جوش مردی" کے معنی بھی ان کی لغت میں مختلف تھے۔ دراصل پکتا شہر کی

سب سے خوبصورت، سب سے زیادہ امیر اور سب سے بڑھ کر مغرور طوائف نورجہاں کا "یار" تھا۔ اور خرچ کرنے کے لئے اسے روپے پیسے کی کمی نہیں رہتی تھی۔ نورجہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑی امام کے میلے پر ایک برس اس نے ایک ہفتے میں تین ہزار روپے کمائے تھے۔ اس کے کوٹھے پر اب بھی سو سو کے نوٹوں کی گڈیوں سے بات کی جاتی تھی۔

کسنا یعنی کشن چند لال مڈل تک پڑھ چکا تھا۔ وہ انگریزی کے بھی کچھ الفاظ بول لیتا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ گھر بار بوڑھی دادی چلاتی تھی جو اسے کوٹ سارنگ سے اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ اس لئے لائی تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ دادی کو وہ گھر کے خرچ کے لئے روزانہ پانچ سات روپے دیتا رہتا۔ کسنا چاروں دوستوں میں زیادہ عقل مند، زیادہ امیر اور زیادہ عزت والا تھا۔ اس کا ذہن بھی باتوں سے تیز تھا۔ اسے چاروں طرف کی خبر رہتی تھی۔ محلے کے بچوں کو وہ اکثر اگنی بوٹی دے کر آس پاس کے لوگوں کے راز معلوم کرتا رہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کانونٹ کی بس میں بیٹھ کر جانے والے رام سرن کے بچے کانونٹ اسکول میں اس لئے داخل کئے گئے ہیں کہ ایک کرسچن ماسٹر ٹیچر سے رام سرن کی گاڑھی چھنتی ہے اور رام پیاری دادی بھی اسکول میں بچہ گرانے کے کسی معاملے میں رام سرن کے حوالے سے جانی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ اس کی یادداشت کے بہی کھاتے میں یہ بات بھی درج تھی کہ لالہ دھنا مل اپنی بیوی کو روزانہ کیوں پیٹتا ہے اور اپنے نوجوان بھانجے کو گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا۔ کالو حلوائی اپنی دکان پر چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو ملازم کیوں رکھتا ہے اور اپنی بیوی سے اس کا جھگڑا دن بدن کیوں بڑھتا جاتا ہے اور اس جھگڑے میں اس کی دکان پر ملازم لڑکوں کا کیا حصہ ہے۔

کسنا بھی ایک طرح سے چنڈال چوکڑی کا سردار تھا۔ پولیس تک اس کی رسائی تھی۔ ڈپٹی کمشنر کے محلے کو وہ جانتا تھا۔ باہر کے محلوں کے کئی غنڈے اس سے خوف کھاتے تھے۔ ڈھوک رتہ کے بہرام خان نے ایک بار چار لوگوں کے سامنے گڑگڑا کر کسی بات کے لئے معافی مانگی تھی۔ روز سینما، نیو روز سینما اور امپیریل سینما والے ٹکٹ کے روپے نہیں خرچنے پڑتے تھے بلکہ باکس میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کے لئے مفت پاس ملتے تھے۔ باوجود اس بات کے وہ خود کسی غنڈہ گردی کے کام میں ملوث نہیں تھا۔ جوئے کے اڈوں پر اس کے نام کی پرچی نکل جاتی ہو یا ناجائز شراب نکالنے کی بھٹیاں اس کے رسوخ کے سہارے پولیس کے چھاپوں سے بچی رہتی ہوں یا نہ، لیکن کہنے والے یہ ساری باتیں کہتے تھے۔ وہ خود محلے میں کوئی بدمعاشی برداشت نہیں کرتا تھا۔ مجال ہے کہ کوئی لڑکا کسی راہ چلتی لڑکی کو چھیڑ سکے۔ اسے گوارا نہیں تھا کہ محلے کی کوئی لڑکی تاک جھانک کرتی نظر آئے۔ وہ اس کے ماں باپ کے پاس جا کر ان کا ناک میں دم کر دیتا اور اس وقت تک چین نہ لیتا جب تک اس لڑکی کی شادی نہ ہو جائے اور وہ ڈولی میں بیٹھ کر بخیریت ان کے محلے سے دور نہ چلی جائے۔

"تھڑا پالیٹکس" یا "چبوترہ سیاست" میں وہ کم سے کم حصہ لیتا۔ اس کی سرگرمیاں اپنے شہر تک ہی محدود تھیں۔ پڑوسیوں میں وہ اپنی دلچسپی کا اظہار صرف اس حد تک کرتا جس حد تک اس کا دل اجازت دیتا۔

سروپ کشن بالکل ان پڑھ تھا۔ "سر دیا" ڈھائی اکھر تو نہ پڑھ سکا لیکن اس کی طبیعت غضب کی تھی۔ پنجابی بیت یوں پڑھتا جیسے اس میں وارث شاہ یا بلھے شاہ کی روح حلول کر گئی ہو۔ وہ محلے کے ہر جھگڑے کو سلجھانے میں مدد دیتا اور خود صلح صفائی کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا۔ پھر جب جھگڑا ختم ہو چکتا اور فریقین ہنسنے لگتے تو وہ جھگڑے کی کہانی کو بیتوں میں باندھ کر ایک پختہ مشق کوی (شاعر) کی طرح سناتا اور لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کسی کا لڑکا روپے چرا کر بھاگ جائے یا کوئی چھوٹا بچہ میلے میں گم ہو جائے وہ خدائی خدمتگار کی طرح اپنا فرض پورا کرتا۔ ڈاکخانے میں کوئی بابو اس کا دوست تھا اور اس کی وساطت سے اسے محلے کے ہر شخص کی مالی حیثیت کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا کہ ملا جھبوری کے ڈاکخانے کے بنک اکاؤنٹ میں بائیس ہزار روپے کی کثیر رقم جمع ہے جب کہ بنئے گھسیٹا رام کے کھاتے میں صرف تین روپے بارہ آنے جمع ہیں اور رام پیاری دادی جب مرے گی تو اس کے نکھٹو خاندان بیری اوم کو تین ہزار روپے ہاتھ لگیں گے۔ باسط پال جو اخبار کا ایڈیٹر بنا پھرتا ہے بالکل کنگال ہے.... سروپا عمر میں ان سب سے بڑا تھا۔ پچیس برس کی عمر تک اس نے ہاتھ میں کبھی ایک سو روپیہ ایک ساتھ لے کر نہیں دیکھا تھا۔ گھر کا گذارہ اس کی پچاس برس کی ماں نہ جانے کیسے چلا لیتی۔ ہر روز شام کو چار آنے کا ایک کیپسول لے کر کھا لیتا اور پھر ساری رات بے سدھ نشے میں بے ہوش پڑا رہتا۔

لوگوں کے ذاتی رازوں کی نقاب کشائی کے علاوہ وہ چبوترہ سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ اکثر کہا کرتا "گورو گوبند سنگھ کی بانی میں آیا ہے 'جد روس پنجاب تے آوے گا سیر اتو یکا ہے'" اور پھر بڑا سنجیدہ بن کر کہتا "وہ دن دور نہیں رہے کہ روس پنجاب پر چڑھ دوڑے گا۔ ایک بار جرمن کو نیچا دکھا دے پھر انگریزوں کو بھی مات دے دے گا.... اور پھر چیزیں اتنی سستی ہو جائیں گی کہ دو پیسے کی ایک سیر گندم ملنے لگے گی۔" ان باتوں میں وہ روس کے اشتراکی نظام کے بارے میں سنی سنائی باتیں بھی جوڑ لیتا تھا کہ امیر غریب برابر ہو جائیں گے اور پھر کوئی کسی کا غلام نہیں رہے گا۔ سرکار سب کا دھندا خود چلائے گی۔ کھیتوں کی ملکیت سرکاری ہو گی۔ ساہوکار نہیں ہوں گے اور اگر کوئی شخص کام نہیں کر سکے گا تو اسے روٹی نہیں ملے گی۔

بھنگ پی کر یا نشہ آور دوائی کا کیپسول کھا کر جب وہ آسمانی خبریں لاتا تو بڑے بڑوں کے ہوش بھی ٹھکانے آ جاتے۔ ایک بار اس نے سب کو بتایا تھا کہ انگریزوں کا بڑا لاٹ چرچل اب مسلمانوں سے مل گیا ہے اور وہ جناح کی بات مان لے گا اور پاکستان بن جائے گا۔ اسی طرح سیاست بھی اسی نے کہی تھی

کہ بکری کا دودھ پینے والا کبھی طاقتور نہیں ہو سکتا جبکہ مہاتما گاندھی کا جسم بہت
کمزور ہے۔ بکری کے دودھ اور شیرنی کے دودھ کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بات
بھی اس نے سب کو بتائی تھی کہ مدراس کی سرکس کے شیر پالنے والے ایک شیر
بان نے مہاتما گاندھی کو صلاح دی ہے کہ وہ اب شیرنی کا دودھ پیا کریں تاکہ
ان میں حوصلہ اور طاقت آجائے اور وہ انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لئے
وہ روزانہ پاؤ سیر شیرنی کا دودھ ان کو پہنچا سکتا ہے۔

باڑو کا نام تو پیارے لعل تھا، لیکن یہ باڑو سے بگڑ کر بنا تھا۔ اس کا
جسم بھاری بھرکم تھا لیکن عقل تیز تھی۔ مذاق میں ایسے باریک نکتے پیش کرتا کہ
عقل دنگ رہ جاتی۔ وہ سادھوؤں، سنتوں اور فقیروں کا بڑا زبردست مرید تھا اور
ان سے گھڑ دوڑ کے ریس میں نکلنے والے نمبر پوچھنے کے لئے ان کی خدمت میں لگا
رہتا۔ اس کا دوڑ کے نمبروں پر روپیہ لگانے کا شوق پاگل پن کی حد تک بڑھا
ہوا تھا۔ شہر کے دونوں کھائیوال، جو سٹہ کے روپے اکٹھے کرنے کے علاوہ نمبر
نکلنے پر انعام کی رقم دینے کے بھی ذمہ دار تھے، اس کے واقف تھے۔ عام طور پر
کھائیوال پولیس کے ڈر سے کسی کے سامنے نہیں آتے اور اپنا سارا کاروبار
ایجنٹوں کے توسط سے کرتے ہیں لیکن باڑو با اعتبار آدمی تھا، اس کے علاوہ خود
کھائیوال بھی سادھوؤں کے ڈیروں کے چکر کاٹتے تھے.... ابھی گزشتہ دنوں
باڑو کی ملاقات ایک گھوری سادھو سے ہوئی تھی۔ اس سادھو کی خصوصیت یہ تھی کہ
وہ پانی بالکل نہیں پیتا تھا اور دن میں صرف دودھ پیتا تھا۔ باڑو کی شردھا اتنی زیادہ
تھی اور وہ اس کی خدمت میں اتنا مگن ہوا کہ سادھو مہاراج خوش ہو گئے اور انہوں
نے ریس کے اور دوڑ کے نمبر بتانے کی شرط یہ رکھی کہ باڑو کہیں سے انہیں پانچ
برس کا ایک لڑکا قربانی کے لئے لادے جو وہ مہاکالی کو بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ باڑو
اپنی شردھا کے باوجود اتنا غیظ و غضب میں آگیا اور سادھو کے چمٹے سے ہی
سادھو کی وہ گت بنائی کہ اسے بھاگتے ہی بن پڑی تھی۔

باڑو کے کئی نام تھے۔ کچھ برس پہلے اس نے شاعری بھی شروع کی
تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کا شوق ختم ہو گیا تھا۔ جب وہ "غزل" کو بسیار
کوشش کے باوجود "گل" "کہنے سے آگے نہ بڑھ سکا تو اس کے استاد نے اسے
دھتکار کر اپنے سلسلۂ تلمیذ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بارے میں ایک بات اور بھی
مشہور تھی کہ اس نے زندگی میں تین چیزیں کبھی نہیں دیکھیں۔ عورت بستر میں،
روپیہ جیب میں اور ہاتھ کام میں۔ کام ہو کر بھی کیا سکتا تھا؟ کچھ عرصہ وہ کانگریس
پارٹی کے ساتھ بھی رہا تھا اور ایک بار تو جیل کی ہوا کھاتے کھاتے بچ گیا۔ جب
اسے پتا چلا کہ جیل میں بھنگ اور کیپسول نہیں مل سکیں گے تو ستیہ گرہ کی سب
تیاری، کھدر کے کپڑے اور گاندھی ٹوپی، سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور
کچہری پر دھرنا دینے کے وقت وہ وہاں سے چپکے سے کھسک گیا۔

اسے بھی چوہدری ٹیلیکس سے دلچسپی تھی۔ وہ اسے "جینئس گزٹ" کہا
کرتا تھا۔ باڑو ہی تھا جس نے سب سے پہلے لوگوں کو بتایا تھا کہ پٹیالہ کے مرحوم
مہاراجہ کی بارہ سو رانیاں تھیں اور وہ ہر تیسرے دن ایک نئی شادی رچاتا تھا۔ کئی
رانیاں تو اس کی شکل صرف شادی والی رات کو ہی دیکھتی تھیں اور بس۔ اس کے بعد
وہ بھول جاتا تھا کہ اس ماہ کسی عورت سے اس کی شادی ہوئی بھی تھی کہ نہیں۔

اسی طرح یہ خبر بھی وہی لایا تھا کہ فرانس کی عورتیں ہندوستانی
مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں اور دوسری جنگ عظیم میں فرانس کے جرمنوں کے
قبضہ سے نکلنے کے بعد وہاں پہنچے ہوئے ہندوستانی فوجیوں خاص کر سکھ فوجیوں کو
اپنا خاوند بنانے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ وہ گاندھی
جی کا بڑا معتقد تھا۔ اس کے خیال میں گاندھی جی، گورو نانک کے اوتار تھے اور
گرو نانک رام چندر کے، سسر راجہ دشرتھ کے اوتار تھے۔ جبھی تو گاندھی جی اکثر
رام راج کی بات کرتے تھے۔

یہ چنڈال چوکڑی تھی!!

☆

۱۹۴۶ء کی ہولی کا آخری دن تھا۔ ہولی کا تہوار مارچ میں آتا ہے۔
سردی نکل چکی ہوتی ہے اور رنگ ڈالنے پر اور کپڑوں کے گیلا ہو جانے پر بھی کسی
کو تکلیف نہیں ہوتی.... چنڈال چوکڑی کے اراکین نے البتہ شاید رنگ کے
علاوہ کیچڑ اور گندگی کا بندوبست کر رکھا تھا۔

تارو اور سروپا صبح سے ہی اپنی گدی پر تھے۔ باڑو پھر کسی سادھو کی
خدمت میں لگا ہوا تھا۔ کستا ہولی کے تہوار کی خوشی میں نورجہان کے پاس تھا۔
تارو کے کپڑے بے داغ تھے۔ اس پر ابھی تک کسی نے رنگ نہیں ڈالا تھا لیکن
سروپا سر سے پاؤں تک رنگ میں نہایا ہوا تھا۔

سروپا تارو سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے
کرتے وہ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ لیتے تھے۔ دیکھنے میں تو کوئی
بھی رنگ پھینکنے والا گلی میں نہیں تھا لیکن گلی کا اوپر کا حصہ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی
سنج رنگ سے تر بتر تھی۔ گھروں کے دروازے یا بند تھے یا نیم وا تھے۔

کرشن لال ڈاک بابو کے لڑکے بلّو نے ایک دوسری منزل سے
پکار کر کہا "چاچا؟"

رام سرن لکڑی کے سٹال والا بالکل نئے کپڑے پہن کر گلی کو خالی
پاتے ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ تارو اور سروپا کو چبوترے پر براجمان دیکھ کر جلدی
جلدی نکل جانے کی کوشش میں تھا۔ "دیکھو وے بلّو کے بچے.... بابو رام سرن
اپنی ہی گلی کے آدمی ہیں۔ ان پر رنگ بالکل نہیں پھینکنا۔ ہاں مجھ کو ٹھیک ہے....
بھائی صاحب.... ایں ایں...."

لیکن اس کے ساتھ ہی اوپر سے ایک بوچھاڑ آئی اور رام سرن کئی
رنگوں میں سر سے پاؤں تک نہا گیا۔ دراصل اوپر چھت پر پانچ چھ بچوں نے ہاتھ
میں رنگ کی پچکاریاں پکڑ رکھی تھیں۔ رنگوں سے بھری ہوئی بالٹیاں ان کے پاس
پڑی تھیں۔ تارو کا صحیح کرنا ان کے لئے سگنل تھا کہ بچو ہوشیار ہو جاؤ، شکار نزدیک آ

گیا۔ پھر صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے کہا "کل نکال لینا بھائی نارو.... پانچ روپے کیا چیز ہوتے ہیں۔ رگڑے ہی پھر تمہارے سگریٹ کا کش لگے!" ذرا دور جا کر بڑبڑاتے ہوئے اس نے کہا "کوٹ سانگ کے تخم سارے کے سارے گندل کی طرح کڑوے ہوتے ہیں!"

نارو نے بات سن لی۔ اس کا موڈ کچھ بگڑ گیا لیکن جلدی اسے دل بہلانے کا سامان پھر ہاتھ آ گیا۔ سامنے سے جوگیا یعنی گیسری رنگ کا لبادہ پہنے ایک سادھو ادھر آ نکلا تھا۔ نارو نے سادھو کا استقبال کرتے ہوئے کہا "آؤ آؤ مہاراج! ادھر چبوترے پر بیٹھو۔ کہاں ارادہ ہے مہاپرشوں کا؟"

سادھو نے ایک بھگت کو اپنی آؤ بھگت کرتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا "بیٹا! میری دوار میں گنگا جمنا کے پاس دوارکا دام ہاتھ ہمارے استھان کا نام ہے۔ سال میں ایک بار بھگتا کے لئے نکلتے ہیں۔ ست تمہاری نگری میں بھو کے چلے جاتے ہیں۔ پاؤ بھر گھی، سیر بھر آٹا اور لکڑی مل جائے تو بھوجن بنا لیں۔ دیا ہو جائے کرپا نِدھان۔"

کرپا نِدھان سروپا نے آگے بڑھ کر کہا "سادھو مہاراج! سنا ہے اب سرکار سادھوؤں پر بھی ٹیکس لگانے والی ہے۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ خبر ہے؟" اور ساتھ ہی وہ اپنی پھیلا کر ہنسنے لگا۔

سادھو نے شرارتی نوجوانوں کو پہچان لیا اور وہ ایک بار الکھ نرنجن کہہ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ نارو نے پکار کر کہا "الکھ نرنجن! سادھو مہاراج کی جے! کوئی پرانا پر رنگ نہ چھینکا رے!" اور اس نے سادھو کا چمٹا چھین کر اسے بڑی ناکہ کر گرا دیا۔ اوپر سے دھا دم رنگ، پانی، کیچڑ اور مٹی کی بارش شروع ہو گئی۔ نارو خود پیچھے ہٹ گیا۔ سادھو کا آٹا بکھر گیا۔ اس کی ہنڈی کھل گئی اور دیگاری بکھر گئی۔ نارو نے اس کا چمٹا نالی میں گرا دیا تھا۔ لڑکوں کی ٹولی اب چھتوں سے نیچے اتر کر گلی میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگی تھی۔

"لوٹ لو کوئی بھائی!" نارو نے آنکھ دبا کر لڑکوں سے کہا۔

لڑکے پل پڑے۔ انہوں نے پیسے لوٹ لیے۔ دیکھتے دیکھتے سادھو کا جھگڑا چھوڑا پھٹ گیا۔ اس کی چیخ پکار سن کر عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں اور ایک عورت نے ماتھے پر ہتھڑ مار کر کہا "ہرے رام! ہرے رام! دھرتی ماتا پھٹ جا!"

"لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ بھونچال! بھونچال!" نارو نے نعرہ لگایا اور خود اکڑوں بیٹھ گیا۔ کچھ عورتیں واقعی بیٹھ گئیں اور باقی حیرانی سے ادھر ادھر بھونچال کے آثار ڈھونڈنے میں لگ گئیں۔ لیکن نارو کو مسکراتے پا کر انہوں نے اس پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

"مر جائے نکھٹو کا کال! نکھٹو نکھٹو!"

"میں کیا جانوں، چاچی!" نارو نے کہا "تم نے کہا میری رام ہرے رام دھرتی ماتا پھٹ جا تو میں سمجھا کہ بھونچال آ گیا ہے!" یہ کہہ کر اس نے

سروپا کو بازو سے پکڑا اور چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سادھو اب اٹھ ہی رہا تھا۔ وہی لڑکے اب اس کے لئے پیسے چنتے اور آٹا اکٹھا کرنے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا لیکن ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔

جب سادھو چلا گیا تو نارو نے لڑکوں سے کہا "بس بھائی! اب کھیل ختم۔ اب ہمیں کچھ کام کی باتیں کرنی ہیں۔" اور وہ دونوں پھر باتوں میں جٹ گئے۔ لڑکے اب رنگ کی پچکاریاں لئے سر عام کھڑے ہو گئے تھے۔

"بابو شام تک دنگے کے نتیجے کے بعد آ جائے گا" سروپا نے کہا۔ "کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ اب دنگے کے جھگڑے میں بھی بے ایمانی ہونے لگی ہے۔ کھائیوال چاندی ہتھیا رہے ہیں اور چونکہ نئے پولیس کپتان نے چھوٹے افسروں کو سختی سے اس بات کی تنبیہ کی ہے، اس لئے وہ بھی چھاپہ مارنے کی اسکیم بنا رہے ہیں۔"

نارو نے سنجیدگی سے کہا "میں اور بات سوچ رہا تھا۔ سیٹھ گھسیٹا رام اب اپنی عیاشیوں اور شراب کے لئے رات دن اپنی بہن کو تاش بیتوں کے ساتھ بھیج دیتا ہے۔ سالا کوئی لولا لنگڑا بھی نہیں کر خود کچھ کما نہ سکے۔ ان کرتا توں کے باپ دادا تو بھکی چمار تھے...."

"وہ الگ بات ہے نارو!" سروپا بولا "تم تو جانتے ہی ہو، بھنگی چماروں کو ہم نے کرستان یا مسلمان بننے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اگر انہیں اچھوت نہ سمجھتے تو وہ آج ہندو ہوتے!"

بات سچ کی تھی لیکن نارو کی سمجھ سے بہت دور تھی۔ اس نے واپس اپنے مدعا کی طرف جاتے ہوئے کہا "سنا ہے کہ سیٹھ کی بہن لی بی کی پہلی اچھی ہے اور روتی بھی کماتی ہے۔"

سروپا ترنت بول پڑا "تو کیا ہوا! ایک مر گئی، دوسری اس کی جگہ لے لے گی۔ چھوٹی کی عمر اب اس قابل ہوتی جا رہی ہے کہ کوئی اس کی تھالی اٹھا کر ساٹھ سو روپے بھی دے دے گا۔"

اسی وقت انہیں سامنے سے منشی نجابت علی آتا ہوا دکھائی دیا۔

"ارے بھائی! یہ کیسا بیان پھر کیوں؟" نارو نے چونک کر کہا۔

جب وہ ان کے پاس سے گزرنے لگا تو دونوں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ جو اور بڑے رعب سے ان کے پاس سے گزرتا ہوا سیٹھ کا دروازہ کھٹکھٹا کر کھلتے ہی اندر چلا گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ گلی میں کھڑی ہوئے لڑکوں کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ نارو کا رنگ جلدی جلدی بدلنے لگا۔ وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت سیٹھ کے گھر سے چیختی ہوئی آواز آئی "نہیں! میں نہیں جاؤں گی!" کوئی چیخ رہی تھی۔ اور دھپ دھپ تڑاخ تڑاخ کی آوازوں سے پتا چلنے لگا کہ سیٹھ اس کی مرمت کر رہا ہے۔ نارو ایک بار چبوترے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے نالی پر منہ ٹیڑھا کر کے بڑے زور سے تھوکنے کی کوشش کی۔ اس نے زور

لگا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا لیکن اس کے منہ سے کوئی بھی ہو ادھار رہے ہوا۔ سروپا اسے سنبھالنے لگا۔ اسی بیچ میں پنڈت گھسیٹا رام کے گھر کا دروازہ کھلا اور اس میں سے پہلے منشی باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ڈولی تھی۔ اس کا چہرہ جلدی جلدی دھلا دیا گیا تھا۔ وہ اب بھی سسک رہی تھی۔ دونوں گلی پار کرنے لگے۔ انہیں آتے دیکھ کر لوگ کترا کر ایک طرف ہو گئے۔ ڈولی نے بڑی عجیب سی زخمی پھڑ پھڑاتی ہوئی نظروں سے نارو کی طرف دیکھا۔ جو اب بھی بار بار بے شدھ سا نتھنے کرنے کی کوشش میں بے حال ہو جا رہا تھا....

نارو جب ذرا ہوش میں آیا تو اس نے سروپا کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے رک رک کر رازدارانہ لہجے میں کچھ باتیں کیں۔ اور اسے دھکیل کر اٹھا دیا۔ ”تم کسنا اور بارو سے ملو اور شام تک واپس یہاں.... آج رنگ جگ نہیں! سمجھا“ یہ کہہ کر وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سب سے پہلے لالہ بیلی رام کے گھر گیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور لالہ کے باہر نکلنے پر کہنے لگا۔ ”لالہ! آگ بھی نکلوا لو۔ مجھے پانچ روپے کی اشد ضرورت ہے“

لالہ بیلی رام نے کہا ”پانچ روپے تم بے شک ابھی لے جاؤ۔ آگ کل نکال لینا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“

”نہیں لالہ! مجھے روپوں سے بھی زیادہ آگ کی ضرورت ہے۔ تم اٹھ کر میرے ساتھ چلو اور دکان کا تالا کھولو۔ میں آگ کو باہر ہی بلاؤں گا لیکن سڑک پر بین بجانے یا منتر پڑھنے سے خود ہی تماشا بن جائے گا“

لالہ حیران رہ گیا۔ اس نے ساتھ جا کر دکان کا تالا کھولا۔ نارو نے ڈبے سے بین نکالا اور بجانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک کالا بھجنگ سانپ اس کے پاس آ گیا۔ اس نے سانپ کو سر سے پکڑ کر اپنے کرتے کی آستین میں چھپا لیا اور پانچ روپے وصول کرتے ہی بیچا.... وہ جا....

اس دن نارو نے شہر کے مختلف محلوں، گوردا ٹک چوہڑ کیا محلہ ٹالی ویر ہولی محلے سے الگ الگ دو درجن سانپ نکالے اور ساٹھ روپے کے قریب رقم کمائی۔ جب شام کو وہ جھونپڑے پر واپس آیا تو اس کی آستین میں صرف ایک کالا بھجنگ سانپ تھا۔ نارو کا اپنا رنگ بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے کسی نے خون کی آمیزش والی سیاہی پوت دی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی، جیسی سانپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ سروپا وہاں نہیں تھا۔ البتہ بارو اور کسنا کھڑے تھے۔ کسنا اور وہ شہر کی تازہ ترین خبروں پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کسنا کہہ رہا تھا۔

”انجم کے ٹھیکے کی نیلامی ایک لاکھ پانچ ہزار میں ہوئی جس میں سے آٹھ ہزار نیلامی افسر نے رشوت لئے۔ اب انجم میں ضرور ملاوٹ شروع ہو جائے گی۔ شکر ہے سب کا ہم چاروں میں سے انجم کی لت کسی کو نہیں پڑی۔“

نارو پہنچا تو کسنا نے کہا ”بھیا! سنا تو نے؟ وزیر بند ہو گیا ہے آج اڈے پر چھاپہ پڑا اور پولیس والے پندرہ آدمی پکڑ کر لے گئے۔ کھانے والوں کی کچھ پیش نہ چلی۔ شکر ہے اپنا بارو وہاں نہیں تھا لیکن ان کے بھی کھانے میں بارو کا ہاتھ تو ضرور ہوگا!“

بارو مسکرایا۔ ”تو پھر میں بھی جیل کی ہوا کھاؤں؟“

کسنا ہنس پڑا۔ ”تمہیں کس بات کا فکر ہے؟ جب تک تمہارے یار کے دم میں دم ہے۔ تم لوگ موج اڑاؤ۔ ابھی ابھی پائی جی کے کھانے میں دو سو بخشی صاحب کو دے آیا ہوں۔ تم خطرے سے باہر ہو!“

ہولی کا شور و غل اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ گلی کے بیچوں بیچ رنگ سے لتھڑا ہوا سا دکھا آتا اب تک بکھرا پڑا تھا۔ بارو کے کپڑے بھی رنگ سے لتھڑے تھے۔

نارو نے پر معنی نظروں سے پنڈت گھسیٹا رام کے دروازے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”میرا کام؟“

کسنا نے نظریں جھکاتے ہوئے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹے نوٹوں کی گڈی نکال کر اسے تھما دی۔ ”تین سو کے لگ بھگ ہیں“ اس نے کہا۔

نارو نے روپے جیب میں رکھنے کے بعد ایک لمبا سانس لیا۔ کسنا کا ہاتھ دبایا اور چلنے کو ہی تھا کہ گلی کے دوسرے سرے سے منشی نجابت علی خان آتا ہوا دکھائی دیا۔ منشی کے ساتھ ایک اونچے قد والا اور لمبے طرّے کی پگڑی پہنے ایک اجنبی شخص بھی تھا۔ سب جہاں کھڑے تھے، وہیں سن ہو کر رہ گئے۔ وہ دونوں اکڑ کر چلتے ہوئے ان کے پاس سے گزر گئے۔

گلی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جو کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ گہری تخیر اور حاملہ خاموشی۔

وہ دونوں پنڈت گھسیٹا رام کے دروازے پر رک گئے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، جو فوراً کھل گیا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔

یکایک اس خاموشی کو چیرتی ہوئی ڈولی کی تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی، جیسے فولاد کی پتلی تیز دھار والی تلوار کی ”شی“ جیسی آواز جو کھلی فضا کو چیرتی چلی جائے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ”میں نہیں جاؤں گی! مار ڈالو تو بھی نہیں جاؤں گی!!“

آج ایک دن میں یہ تیسری بار تھی۔

نارو نے کسنا کی طرف دیکھا۔ وہ اکڑوں بیٹھ گیا جیسے اچھل کر کسی کا گلا دبوچنا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر لہو کی آمیزش والی سیاہی اور گہری ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

اندر سے پنڈت گھسیٹا رام کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ پھر ایک تھپڑ کی تڑاخ سنائی دی۔ تھپڑ جو ڈولی کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر پڑا تھا۔ تھپڑ جو ایک بچی کو چپ ہونے پر مجبور کرنے کی غرض سے مارا گیا تھا۔

کچھ لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ کسنا نے آگے بڑھ کر اپنے

مضبوط ہاتھ تارو کے کندھوں پر رکھ دیے تھے۔ تارو زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن کرشنا کی پکڑ بڑی مضبوط تھی۔

دروازہ کھلا۔ اس میں سے پہلے منشی باہر نکلا پھر وہ لڑکا جو سب سے آخر میں ڈولی۔ لیکن ڈولی کے پیچھے پیچھے پیٹر بھی باہر نکل آیا تھا۔ ڈولی کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس کا منہ جلدی جلدی دھلا دیا گیا تھا لیکن تھپڑ کے داغ نمایاں تھے۔ پیٹر کے ہونٹوں پر ایک کالی بھدی سی مسکراہٹ تھی۔

آج تیسری بار مجبوری سے بے بس ڈولی نے پھڑپھڑاتی ہوئی زخمی نگاہوں سے تارو کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ تارو نے جھک کر نالی میں بڑے زور سے قے کی۔

ایک بار، دو بار، تین بار..... ایسے لگا جیسے تارو وہ سب کچھ الٹ کر نالی میں پھینک دینا چاہتا ہو، جو ایک عرصے سے اس کے پیٹ میں ناجائز اولاد کی طرح کلبلا رہا تھا۔

وہ نڈھال سا ہو گیا۔ عصمت کا لٹا ہوا قافلہ بہت دور تک نکل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں والا سانپ بہت بے کلی سے اس کے بازو کے اردگرد لپٹ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ کرشنا نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹائے۔ ایک بار اس سے بغلگیر ہوا۔ پھر تارو نے آگے بڑھ کر دونوں کے گرد باہیں ڈال دیں۔ وہ تینوں دوست ایک مضبوط تنے والے درخت کی طرح اکٹھے ہو گئے جیسے گتھی ہوئی جڑیں ایک دوسرے کے گرد اگ آئی ہوں۔

تارو کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں سے زیادہ گہری اور چمکیلی کشش تھی لیکن اس کا سانس دھونکنی کی طرح تیز چل رہا تھا۔

☆

رات محلے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پیٹر گھسیٹارام کو رات کے بارہ بجے کے قریب سانپ ڈس گیا۔

ڈولی اور لوسی کی چیخوں سے سب جاگ اٹھے۔ پیٹر نے بے ہوش ہونے سے پہلے سانپ کو کچل دیا تھا اور وہ مردہ اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ پہلے لوگ ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ اس نے ایک ٹیکہ بھی لگایا۔ دو تین گھنٹوں میں جب اس سے کچھ بن نہ پڑا تو کسی کو تارو کا خیال آیا۔ وہ اپنی ڈیوڑھی میں ہی سویا ہوا تھا۔ جب وہ آیا تو ڈولی اور لوسی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ تارو نے لوبان، اگربتی وغیرہ منگوائے۔ آدھ گھنٹہ منتر پڑھے۔ آخر میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سانپ مر چکا ہے۔ اگ دینا پوچا تو ل بھی کریں تو کیسے؟"

اس نے کہا۔

ایک آدھ گھنٹے کے بعد پیٹر گھسیٹارام کی موت ہو گئی۔

شہر میں عیسائیوں کی تعداد کافی تھی، اس لئے لاش کو دفنانے کے لئے کافی لوگوں کے آنے کی امید تھی لیکن آخر وقت تک کوئی بھی نہیں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ چرچ کے پادریوں نے بہت پہلے اس کی کرتوتوں سے تنگ آ کر اسے اپنے مذہب سے نکال دیا تھا۔ عیسائیوں کے قبرستان میں لاش دفنانے کا خرچ کرشنا نے برداشت کیا۔ دونوں لڑکیوں کے رشتے سے کوئی موسی نیا محلے سے پہنچ گئی تھی جو قبرستان سے واپسی پر دونوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی۔

خبر پھیلی کہ منشی نجابت علی کا تبادلہ پولیس لائن میں کر دیا گیا..... سنا گیا کہ اس نے کرشنا کو کوئی دھمکی دی تھی اور اس کام کے لئے نورجہاں کو اپنے وسیلے کام میں لانے پڑے تھے۔

خبر پھیلی کہ موسی کے گھر سے دونوں لڑکیاں دلی جانے کے لئے اسٹیشن پہنچیں جہاں کرشنا اور تارو پہلے سے موجود تھے۔ یہ بھی سنا گیا کہ تھرڈ کے ڈبے میں نہ چڑھ کر دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے لئے بیٹھیں۔ یہ بھی سنا گیا کہ تارو بھی اس گاڑی میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کرنے کے لئے چڑھا۔

یہ خبر بھی پھیلی کہ تارو ننگے سادھوؤں کی ٹولی میں شامل ہونے کے لئے ہردوار چلا گیا ہے اور پنڈی سے دور سوپالی میں کہیں رشی کیش کی پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ بالکل تارک الدنیا ہو گیا ہے اور سانپوں کو اپنے جسم کے اردگرد لپیٹے رہتا ہے۔

یہ خبر بھی بہت پھیلی کہ تارو کرسچین ہو گیا ہے اور دونوں بہنیں اب اس کے ساتھ کہیں لاہور میں رہتی ہیں۔ لوسی اسکول میں پڑھتی ہے اور ڈولی کرسچین اسپتال میں صفائی وغیرہ کا کام کرتی ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو تارو کے ساتھ کوٹ سارنگ جانے والی بس پر پنڈی گھیب سے چڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور شاید وہ اپنے آبائی گاؤں میں آباد ہو گیا ہے۔

خبریں بہت پھیلیں اور بہت کچھ سنا گیا لیکن کرشنا کو ٹھیک ٹھیک دو ماہ کے بعد جو خط نورجہاں باجی کے پتے پر لاہور ہی سے پوسٹ کیا گیا تھا اور اردو میں لکھا ہوا یہ خط ڈولی کا لکھا ہوا تھا۔ اس خط میں اس نے کرشنا کو بھائی صاحب لکھ کر مخاطب کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ دونوں بہنیں نرسنگ کا کورس کر رہی ہیں۔ اس کی بیماری کچھ زیادہ نہیں تھی اور اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ "وہ" اب موٹر مکینک کا کام کرتے ہیں اور ٹیکسی چلانا بھی سیکھ رہے ہیں..... اور ان تینوں کو یہ زندگی بے حد پسند ہے۔ نورجہاں باجی کے لئے پیغام تھا کہ ان کی بہن عصمت باجی نے ان کی بہت مدد کی ہے۔ پہلے کرائے پر مکان لے کر دیا لیکن انہیں کوٹھے کی زندگی سے بہت دور رکھا۔ پھر اپنے رسوخ سے "ان" کو نوکری دلوائی اور اسپتال میں انہیں نرسنگ کا کام سکھانے کے لئے داخل کروایا۔ نورجہاں باجی کو مریم کا خطاب دیتے ہوئے ڈولی نے ایک موافق خداوندی رتبہ دینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کی۔

چنڈال چوکڑی میں ایک رکن کی کمی ہو گئی تھی لیکن تارو کا چھوٹا بھائی گوردیال اس طرف دیا لو بڑی تیزی سے ان کا دم بھرنے لگا تھا۔ سانپ پکڑنے کا فن اس نے اپنے بھائی سے سیکھ لیا تھا..... اور کون جانے، اس کے بعد اس کے چھ بھائی اور تھے!

# فاصلہ

## جتیندر بلو

میرا اُٹھایا ہوا قدم ناکام ثابت ہو چکا تھا اور میں اپنے کیے پر سخت نادم تھا۔ اپنی ہی نظر میں میرا قد نصف رہ گیا تھا۔ میری شریکِ حیات ہاتھ میں گلاس تھامے کچن سے لوٹ آئی تھی۔ گلاس میرے سامنے رکھا اور دیا لہجہ اختیار کئے باسی الفاظ مجھ پر برس پڑی:

"تم سمجھتے ہو پوری دُنیا تم نے خرید رکھی ہے؟...... ہر شخص تمہاری سوچ کے مطابق سانس بھرے؟...... اور تمہاری سوچ کی داد دے؟"

کچھ دیر پہلے ہمارے درمیان گرم گرم مکالمہ ہوا تھا۔ میں اُس کی سرزنش کے نیچے دبتا چلا گیا۔ اُس کا پلڑا قدرے بھاری تھا لیکن میں نے چاہا تھا کہ اپنی صفائی میں چند وزنی دلائل پیش کر کے اُسے مطمئن کر لوں کہ میں ایسا نہیں ہوں جیسا کہ وہ سوچ رہی ہے لیکن مجھ میں ہمت ہی نہ ہوئی۔ اس لئے کہ وہاں تو جھلاہٹ تھی، ناپسندیدگی کی اُبھرتی ہوئی لہر کے ساتھ علیحدگی کی جھلک بھی تھی۔ چند مہینوں سے معاملہ نازک تھا اور گھر منتشر ہوا بھی۔ گو کہ میں اپنی بیوی روتھ سنڈرلینڈ کے حُسن اور محبت روّیوں سے خوب خوب واقف تھا اور اس کی تلون مزاجی کو جھیل رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر بھڑک اُٹھا کرتی اور مجھے ایسی کھری کھری سناتی کہ میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ لیکن میں بوجھ خاموش رہتا کہ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ فشارِ خون چڑھا کرتا لگتا جب اُس کے سر پر سوار ہو جاتا تو وہ الگ ہی عورت جان پڑتی۔ کبھی وہ مجھے اپنے دیش کی کالی ماں لگتی اور کبھی ماتا دُرگا لیکن جب اُس کا خونی دباؤ معمول پر آجاتا تو وہ الگ ہی شخصیت ہوا کرتی۔ میری چھت پر کھڑے ہو کر اس فکر میں ڈوبی رہتی کہ وہ میری گردن میں اپنی باہیں پھیلائے یا نہیں؟ اس وقت میری خواہش یہی رہتی کہ وہ میرے گالوں کے ساتھ میرے لبوں کو بھی چھوئے اور اُن کا رس نچوڑ کر اپنی دیرینہ محبت کا ثبوت ازسرِ نو پیش کرے؟ مگر یہ سب خواب بن کر رہ گیا تھا اور میں اپنے باطن کے گہرے سناٹے میں غرق ہوتا چلا گیا۔

اور اب وہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر منظر سے غائب ہو گئی۔ اُس نے جاتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ اُس کی گونج سارے گھر میں پھیل گئی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب دروازہ پیٹنے پر بھی وا نہیں ہوگا تو میں کتنی منت سماجت کروں؟ اپنی محبت کا واسطہ دوں؟ مگر دروازے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوگی۔ اس نے چند ماہ سے میری صحبت میں بیٹھنا بھی ترک کر رکھا تھا اور میں گلاس ٹکرانے کو ترس گیا تھا۔

وہسکی کا گلاس میرے سامنے رکھ کر جا چکی تھی۔ شام ڈھلنے کی فکر میں تھی۔ میں وینڈزورتھ کونسل کی فلک بوس عمارت کی دسویں منزل پر اپنے فلیٹ کی کشادہ کھڑکی سے برٹش ریل کی گاڑیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ کسی بالک نے لائنوں کا جال زمین پر بچھا رکھا ہے اور وہ گاڑیوں کی آمد و رفت سے کھیل و انبساط لے رہا ہے۔ منظر کے شمال جنوب میں واکس ہال ریلوے اسٹیشن واقع ہے اور شرق میں کلیپم جنکشن۔ واکس ہال کی اہمیت اس وجہ سے ہمیشہ رہی ہے کہ اُس کے پڑوس میں اوول (Oval) کا سرسبز کرکٹ کا میدان موجود ہے۔ دُنیا کا ہر وہ ملک جو نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کا غلام رہ چکا ہے اور جہاں انگریز اپنا ایجاد کردہ کرکٹ کا کھیل چھوڑ آئے تھے وہ آزاد ملک اب اپنے سابق آقاؤں کے ساتھ ایک ٹیسٹ میں وہاں ضرور کھیلا کرتا ہے۔ میں برسوں اس اسٹیشن پر ملازم رہا۔ اگر میچ انڈیا اور انگلینڈ کے درمیان ہوتا تو کرکٹ کے متوالے ہندوستانی اپنا ترنگا جھنڈا اُٹھائے گاڑیوں سے اُتر کر میدان کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے۔ یہی حال پاکستانی تماشائیوں کا بھی تھا' جب اُن کا میچ انگلینڈ سے ہوتا تو وہ کھیل کے عاشق ہرے پرچم اُٹھائے وہاں نظر آتے۔ مگر اُن کی نسبت انگریزوں کا ہجوم کہیں زیادہ رہتا۔ وہ برٹش اور انگلش جھنڈے اُٹھائے "Bash Pakis, Crush Indians" کے نعرے لگاتے گاڑیوں سے اُترتے۔ بعض دفعہ مختلف قومیت کے نعرے آپس میں ٹکرا جاتے۔ فضا میں تناؤ پیدا ہوتے ہی مجھ جیسے کمزور شخص کا دل دہل جاتا کہ کہیں اسٹیشن پر نسلی خون خرابہ نہ ہو جائے لیکن اسٹیشن پر پولیس کی موجودگی میں چھوٹی موٹی جھڑپ کے علاوہ کبھی کوئی سنجیدہ واردات رونما نہ ہوئی۔

اسٹیشن کے باہر اوروہ (Aurora) کافی تھا۔ میں مارننگ شفٹ کی ڈیوٹی پر جانے سے پہلے وہاں ناشتہ کیا کرتا تھا۔ میں تازہ تازہ اس ملک میں وارد ہوا تھا۔ اُن دنوں نسلی امتیاز اور تعصب اتنا زیادہ تھا کہ برٹش ریل کی ملازمت پانے کے باوجود میرا من واپس انڈیا لوٹ جانے کو چاہتا تھا۔ درحقیقت دائیں بازو کے ایک معروف رہنما اینک پاول نے تارکینِ وطن کے خلاف (Rivers of Blood) "خون کے دریا بہنے" کی اشتعال انگیز تقریر داغ ڈالی تھی۔ شہ پاتے ہی اُس کے پیروکار اور نیشنل فرنٹ کے جوشیلے اسکن ہیڈ حرکت میں آگئے۔ کئی ایشیائی نژاد لوگوں کی دکانیں توڑ پھوڑ دی گئیں۔ چند مکان بھی نذرِ آتش ہوئے اور بعضوں کی پٹائی سرِعام ہوئی۔ سفید فام راہ گیر وہاں کھڑے تماشا دیکھا کرتے۔ تارکینِ وطن ڈر ڈر کر اور چھپ چھپ کر کام پر جایا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک میں بھی تھا۔ مگر جس ہفتے میری ڈیوٹی مارننگ شفٹ کی ہوتی تو پو پھٹنے پر میں بے خوف و خطر سونی سڑکوں کے درمیان چلتا ہوا ہندی فلموں کے گیت گاتا ہوا اوروہ کافی میں داخل ہو جاتا۔ روتھ وہاں ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ سست، شکن مزاج مگر انتہائی تیز اور بے باک۔ ہر گاہک کے ساتھ دل کھول کر بات کرتی مگر اتنا فاصلہ ضرور رکھتی کہ کوئی شخص غلط فہمی کا شکار نہ

ہو لیکن اگر کوئی گاہک حد فاصل کو پار کر کے اس کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا تو اُس کا جواب کھلے لفظوں میں ایک ہی ہوا کرتا:

"اگلی بار آؤ گے تو میرے سیکشن میں مت بیٹھنا۔ ورنہ چائے بھی نصیب نہ ہو گی؟"

کافے میں زیادہ تر مزدور طبقہ اور نوکری پیشہ لوگ آیا کرتے تھے۔ میں نے ابتدا میں جب وہاں جانا شروع کیا تھا تو یہ سوچ کر بہت خوش ہوا تھا کہ اِس کافے کا مالک ضرور کوئی انڈین پنجابی ہو گا جس کی خاندانی ذات اروڑہ رہی ہو گی۔ مگر اس نے کافے کا نام اروڑہ سے بدل کر ارورہ اِس واسطے رکھ چھوڑا ہے کہ انگریزوں کو ہندوستانی نام لیتے وقت دقت نہ ہو۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مجھے اب تک وہاں کبھی کوئی ایشیائی شخص دکھائی نہ دیا۔ بعد ازاں مجھ پر کھلا کہ اورورہ رومن دیو مالا میں صبح کی دیوی کا نام ہے۔ مجھے اپنی کم علمی پر سخت افسوس ہوا۔ روتھ کے علاوہ وہاں ایک اور بھی خدمت گزار تھی۔ جو کافے کے جوان اطالوی مالک کی بیوی تھی۔ لیکن میں روتھ ہی کے سیکشن میں بیٹھنا پسند کرتا تھا خواہ مجھے انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جب مجھ کو انگلش بریک فاسٹ پروسے گی تو توسٹ قدرے جلا ہوا ہو گا۔ میں کڑک (Well Done) توسٹ کھانے کا عادی ضرور تھا۔ لیکن روتھ اُسے کچھ زیادہ ہی کڑک بنا کر لایا کرتی تھی۔ کبھی وہ نیم جلا ہوتا اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ میں اعتراض کرتا اور کبھی ناراض بھی ہو جاتا۔ لیکن وہ کچھ ایسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا دیتی' گویا میں اس کے نزدیک بے حد نادانی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ پھر نہایت پچکار کر مجھ سے کہتی جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔

"کھا لو کھا لو۔ میری خاطر کھا لو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ میں جلا ہوا توسٹ کھانے کا عادی نہیں ہوں!"

"نئے نئے اِس کنٹری میں آئے ہو؟ اتنا بھی نہیں سمجھے' یہ توسٹ تمہارے سانولے رنگ سے میل کھاتا ہے اور اس کو سینکنے والی عورت سفید فام ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ جلا ہوا توسٹ کھا کر میرے پیٹ میں درد اُٹھے گا؟"

"نہیں نہیں' بالکل نہیں۔ میں بے دلی سے جلتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟"

میں روتھ کی باتوں' اداؤں اور چٹکلے پن کو پسند ضرور کرتا تھا مگر جلا ہوا توسٹ میرے حلق سے نہ اُترتا تھا۔ وہ مجھے غصے میں بھرا ہوا دیکھتی تو مجھ کو مزید پچکارتی:

"دراصل تمہارے رنگ میں نمک شامل ہے۔ جانتے ہو کون سا؟"

میں احتیاطاً اس کا مزہ چکھا کرتا۔

"میں اُس نمک کی بات نہیں کرتی' جسے کھانے کے دوران پلیٹ پر چھڑکا جاتا ہے..... تمہارا نمک تو سمندری ساحلوں پر پایا جاتا ہے۔"

اُس کے کہنے میں کئی غیر مرئی پہلو پوشیدہ رہا کرتے جن کی گہرائی میں اُترنا اور وہاں سے کچھ اخذ کر کے لوٹنا میرے واسطے مشکل نہ تھا۔ اُس کا کن' اُس کا اندرون اور اُس کی ذہنی کیفیات میری سمجھ میں آ چکی تھیں لیکن میرے لب وا کرنے سے پہلے ہی وہ مسکرا دیا کرتی:

"غور سے دیکھو تو میرے رنگ میں دُنیا بھر کی کشش چھپی ہوئی ہے اور تمہارے رنگ میں فطری حسن' اگر یہ مل جائیں تو نسلی امتیاز کے کئی پہلو مٹ جائیں؟"

اور اُس شام میں اور روتھ رنگوں کا فرق مٹنے اور اُسے مٹانے میں جٹ گئے۔ وہ میرے سانولے بدن کا انگ انگ چوم کر اپنے اندرون کو روحانی خوشی بخش رہی تھی جبکہ میں اس کے جسم کی گوری چٹی جلد کو اپنی زبان سے ناپ اپنے ارمان پورے کر رہا تھا۔ انگلینڈ آنے سے پہلے میری شدید خواہش رہی تھی کہ وہاں کسی سفید فام عورت کے بدن کے ہر حصے پر اپنی زبان اور ہونٹوں کی چھاپ چھوڑ کر رنگوں کا احساس مٹاؤں؟ میں اس کی سبز مائل آنکھوں میں کھو کر اس کے سنہرے بالوں کو بھی چومتا رہا۔ اس وقت میں نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے دیکھا کہ آکاش پر ست رنگی کمان پھیل گئی ہے اور اس کے ساتوں رنگ ہماری جسمانی حرکات میں بھی موجود ہیں۔

ایک خوشگوار صبح میں ناشتے کے دوران چھری کانٹا پکڑے بیکن (Becon) کا ٹکڑا کاٹ کر لبوں کی طرف بڑھا رہا تھا کہ روتھ نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی: "خوش ہو جاؤ؟"

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

یہ سننا تھا کہ چھری کانٹا میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر پلیٹ پر جل ترنگ بجا اُٹھے۔ بیکن کا ٹکڑا بھی میری وردی پر اپنا نقش چھوڑ گیا۔ میرے اُڑے ہوئے ہوش دیکھ کر اس نے دریافت کیا:

"ڈارلنگ' کیا تم کو خوشی نہیں ہوئی؟"

شعوری یا لاشعوری طور پر میری گردن اثبات میں اوپر نیچے ہوتی چلی گئی۔ اور جانے کیوں میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر تم انکار بھی کر دیتے تو میں بچے کی پرورش ضرور کرتی۔ جانتے ہو کیوں؟"

میں بدحواس مگر خود کو سنبھالتا اُسے دیکھتا رہا۔

"وہ بچہ اِس دُنیا میں ملا جلا رنگ لے کر آئے گا ناں؟..... اور میں

زندگی بھر تمہارا رنگ اُس میں دیکھا کرتی۔"

اُس صبح میری ڈیوٹی پلیٹ فارم نمبر دو پر تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں لیکن میں ہر گاڑی سے اُترتے ہوئے مسافروں کا کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ میں ستون بنا کھڑا رہا۔ میں نے کسی مسافر کا نہ تو ٹکٹ چیک کیا اور نہ ہی کسی کا چہرہ وارپاس دیکھا۔ میرا ذہن تو دہلی کے لاجپت نگر میں پہونچا ہوا تھا جہاں میرے والدین رہائش پذیر تھے۔ چند روز پہلے اُن کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا کہ اب تمہارے قدم وہاں جم چکے ہیں۔ تم برسرروزگار ہو۔ سالانہ چھٹیوں میں گھر ضرور آؤ اور اپنی مرضی کی بیوی کو پسند کر کے ساتھ لے جاؤ۔ بہت سے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایک دو اونچے خاندان کی لڑکیاں پسند بھی ہیں مگر آخری پسند تو تمہاری ٹھہرے گی...... یہ سب سوچ کر میرے دماغ میں طوفان اُمڈ آیا تھا۔ روتھ کے انکشاف نے میری زندگی میں ایک نیا باب کھول دیا تھا' جس کا ہاشر میں اہم کردار تھا۔ خاصی اُدھیڑ بن کے بعد ایک اُلٹا سا خیال میرے ذہن سے گزرا کہ! اِس باب سے نجات پانا زیادہ مشکل نہ ہوگا' جرمنی میں منطقی دلائل کا سہارا لے کر روتھ کو اسقاطِ حمل کے لئے مجبور کر دوں۔ یوں بھی اس سوسائٹی میں حمل گرانا کوئی بڑی بات تصور نہیں کی جاتی۔ اس قسم کے واقعات تو ہر گھنٹے ہر روز ہوا کرتے ہیں۔ جو بھی خرچہ ہوگا میں برداشت کر لوں گا۔ یہ سوچ کر میں بے فکرے آزاد ہو گیا تھا مگر اُس اماوس کی رات میں' جب میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ میرے سینے پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر اچانک مجھ سے الگ ہو کر اُس کا قد بڑھتا چلا گیا ہے اور ترشول اُٹھا کر میری ہتیا کرنے لگا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے مجھے لہولہان کر ڈالا ہے۔ میں نے چیخنا چلانا چاہا! مگر میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور میں ہڑبڑا کر ڈراؤنا اُٹھ بیٹھا۔ اُس پل سے لے کر دن بھر یہ بھیانک خیال میرے ساتھ رہا کہ وہ بالک جو سنسار میں آنے کا آرزومند ہے' اُس کا وجود ختم کرنے کا ذمہ دار میں ہی ٹھہرایا جاؤں گا اور یہ احساس جنم جنم تک میرے ساتھ رہے گا۔

گھر سے خطوں کا آنا برابر جاری رہا۔ ہر خط کا متن قریب قریب ایک سا ہوا کرتا تھا۔ "کب آ رہے ہو؟ لڑکی والے متواتر پوچھا کرتے ہیں۔ وہ بھی جلدی میں نظر آتے ہیں۔ تمہاری چھٹیاں تو کب سے Due ہیں۔ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بھگوان کی شرن اور پوجا پاٹھ میں جیون گزارنے کی اِچھا رکھتے ہیں..... بس اب تم چلے آؤ۔ ہم نین بچھائے بیٹھے ہیں۔"

یہ خط میری پیدائش سے میرے ساتھ جڑا ہوا تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میرے ماتا پتا میرے سر پر سہرا بندھا دیکھ کر اپنا آخری فرض بھی نبھانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم کرم کے پابند ہیں۔ یہ اُن کے سنسکار بھی ہیں اور اُن کے بغیر زندہ رہنا اُن کے لئے محال بھی ہوگا؟ لیکن میں ٹال مٹول کرتا اپنی جان بچاتا رہا مگر کب تک؟ میں اپنی ہی نظر میں دنیا کا بڑا ہی چالاک اور ناقابلِ اعتبار شخص بنتا جا رہا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اپنی ہی عدالت میں مجرم بنا کھڑا تھا۔ چارو ناچار قلم اُٹھا کر میں نے اپنے والدین کو صاف صاف لکھ ڈالا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ روتھ کون ہے؟ میں مختصر کیا ہے۔ اُس کا خاندانی سلسلہ یورپ کے خانہ بدوشوں سے نسلاً جا ملتا ہے۔ اُس کی تعلیم بس واجبی ہے۔ مگر دنیاوی معاملات میں وہ اتنا علم رکھتی ہے کہ اچھے اچھوں کی چھٹی کرا دے۔ کافے میں وہ کُک ہاؤسنگ کا کام کرتی ہے اور میں بہت جلد باپ بھی بننے والا ہوں۔

روتھ کا پیٹ روز بروز نکل رہا تھا۔ اُس نے کافے میں کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ہم بے پناہ خوش تھے کہ دو دِلوں کے ملن اور ہم اولاد کا سونا دیکھنے والے تھے۔ اس دوران گھر والوں کا خط آیا۔ لکھا تھا۔ "تم نے بیاہ کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارے ماتا پتا کے جیون آخری مرحلے میں ہیں؟ جانے کب وہ پران تیاگ دیں؟ اُن سے مشورہ تو کیا ہوتا؟ تمہاری ماں کو جس قدر صدمہ پہونچا ہے' وہ لفظوں میں بیان کرنا کٹھن ہے۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس قوم کی لڑکی سے تم نے بیاہ رچایا ہے' اُس قوم کی اخلاقیات اور وفاداری کے معیار ہماری سنسکرتی سے بالکل الگ ہیں۔ اُن کے اخلاق کو تم کو سمجھنا ہوگا؟ دوسری بات جب ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو پتہ چلے گا کہ روتھ ایک عام سی عورت ہے' جس کا خاندانی سلسلہ بنجاروں سے جا ملتا ہے اور وہ ایک ڈھابے میں جھوٹی پلیٹیں اُٹھانے اور میز پہ صاف کرنے کا کام کرتی ہے تو ہماری ناک کٹ کر رہ جائے گی اور ہم کہیں کے نہیں رہیں گے؟..... بہر حال تمہارا ہونے والا جو ہے تم کو مبارک ہو۔"

میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے روتھ نے جان لیا تھا کہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ بے ساختہ پوچھ بیٹھی: "ہیک ہوم سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ہاں بالکل..... لکھا ہے ہماری بہو کو ہمارا آشیرواد دینا..... اور یہ بھی لکھا ہے کہ بچہ ہونے پر اگلے سال تم سب انڈیا آؤ"

"ہم ضرور جائیں گے..... دہلی کے بعد آگرہ کا تاج محل دیکھیں گے"

روتھ کی آنکھوں میں جاگتے خواب دیکھ کر میں نے اُس کی خواہشات کو بڑھاوا دیا۔

"جے پور گلابی شہر ہے۔ ہم وہاں بھی جائیں گے..... پھر وقت ملا تو اودے پور میں پانی میں کھڑے محل کا بھی نظارا کریں گے..... اور آخر میں متھرا کا مندر تو دیکھنا ہی ہے۔ وہ دہلی کے بہت قریب ہے۔" روتھ کا بے تحاشا مجھ سے لپٹ جانا فطری تھا۔ میں روز اوّل سے اُس کے چہلتے تیور کو دیکھتا اُس کو شدت سے چاہنے لگا تھا۔ وہ بھی میری محبت' میری چاہت پر فدا تھی۔

ہمارا بے بی ہوا۔ بے نہایت خوبصورت سا تھا۔ گل گوتھنا۔ اُس کی

شکل اور اس کا رنگ روپ دیکھ کر روتھ اکثر کہا کرتی کہ کرائسٹ (Christ) نے ہم دونوں کا رنگ ملا کر اس بچے میں ڈال دیا ہے۔ مقامی لوگ ہمیں بچے کے ساتھ ہنستا کھیلتا دیکھ کر سوچتیں کہ کس طرح ملے جلے رنگوں سے ہی دُنیا بنا کرتی ہے اور کوئی بھی رنگ دوسرے سے کمتر درجے کا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ ہر رنگ کی اپنی اہمیت اور افادیت ہوا کرتی ہے۔

میرے والدین ضعیف ہو چکے تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ روتھ اور ارون کو لے کر انڈیا ہو آؤں۔ اپنے خاندان کے ساتھ خاصا وقت گزاروں۔ ارون کو ماں کی گود میں ڈال کر اس کی کئی تصویریں کھینچوں۔ روتھ بھی میرے بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے مل کر یقیناً خوش ہوگی۔ اور ہم کئی مقامات کی زیارت کر کے واپس لوٹ آئیں گے۔ مگر میری خواہش اور میرا خواب پورا نہ ہوا؟ روتھ کا پاؤں پھر سے بھاری ہو گیا تھا۔ اُن حالات میں روتھ کا سفر کرنا اور ننھا سا بچہ ساتھ لے کر جانا مناسب نہ تھا۔ چند روز ہی بیتے تھے کہ ایک صبح ابھی نور کا تڑکا بھی نہ پھیلا تھا کہ پوسٹ مین ہمارے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ٹیلی گرام انڈیا سے آیا تھا (سن ساٹھ کی دہائی کے آخر تک انگلستان کے ان گنت گھروں میں ذاتی فون نہ تھا۔ مقامی لوگ زیادہ تر پبلک فون کا استعمال کرتے تھے) تار وصول کرتے ہوئے اور دستخط کرتے وقت مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ ماتا پتا میں سے کوئی ایک بھگوان کو پیارا ہو گیا ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ پتا جی چل بسے تھے۔ روتھ بھی بستر سے اُٹھ کر میری پشت پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے تار اس کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے پوری ہمدردی سے افسوس ظاہر کیا۔ پھر صدقِ دل سے کہا: ''تم آج ہی انڈیا چلے جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گی۔"

میرے باطن میں اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ پتا جی کا چہرہ اور اُن کا قد و قامت آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اُن کی طرح طرح کی باتیں بھی کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ مجھے خاموش پا کر روتھ بول اُٹھی:

''پیسے تو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہوئی تو میں اپنی جیولری پان بروکر (Pawn Broker) کے ہاں گروی رکھ دوں گی۔ تمہارے لوٹنے پر چھڑا لیں گے؟"

''کل صبح انہوں نے آخری سانس لی ہے۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا: ''انتم سنسکار (Last Rites) تو کب کے ہو چکے ہوں گے۔ پھر....؟" میں اپنی ذہنی کیفیت کو واضح نہ کر پایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں؟ (ان حالات میں میں اپنی فیملی کو تنہا چھوڑ کر جانے کے حق میں بالکل نہ تھا) لیکن میں جذباتی ہو چکا تھا اور پریشان بھی کہ میری سوچ الفاظ میں ڈھل کر میرے لبوں تک نہ پہنچ پائی تھی اور الفاظ گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔

روتھ کو جب دوبارہ ماں بننے کا شرف حاصل ہوا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش تھی۔ اس مرتبہ اس نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا، جو ہو بہو اپنے بھائی پر گئی تھی۔ ویسی ہی شکل و صورت۔ وہی ملا جلا رنگ روپ۔ ویسا ہی چہرہ۔ مگر نین نقش اپنے بھائی سے قدرے تیکھے، جو مجھ سے مشابہ تھے۔ روتھ کو بچی کی نگہداشت کے ساتھ اپنا خیال بھی رکھنا لازم ہو گیا تھا کہ وہ فشارِ خون (B.P) کی مریضہ بن چکی تھی۔ مرض اُسے گاہے بگاہے پریشان کرتا رہتا۔ وہ ملا کی پرورش کے دوران اکثر کہا کرتی: ''دیکھا تم نے؟ کرائسٹ ملے جلے رنگوں کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ ان رنگوں کے سہارے تو دنیا قائم ہے۔ اگر ہر شخص ہر رنگ کے آدمی کو اسی طرح چاہنے لگے اور پسند کرنے لگے تو زندگی کے کتنے مسائل حل ہو جائیں؟ دُنیا سے کتنی نفرت، کتنا اندھیرا دور ہو جائے؟"

بارہا اپنے گھر کا خوشگوار ماحول اور چھوٹی بڑی خوشیاں دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ روتھ اور میں نے مل کر ایک ننھی جنت قائم کی ہے، جہاں نہ تو کوئی شجرِ ممنوع ایستادہ ہے اور نہ ہی وہ سیب موجود ہے، جسے چکھ کر ہم جنت بدر کر دیے جائیں گے؟ شام میں جب کبھی میں لاؤنج کے وسط میں بچوں کے آگے کھلونے پھیلا کر ان کے ساتھ کھیلا کرتا تو روتھ گھر کا سکون، بچوں کے ساتھ اپنا پیار، شفقت، ممتا اور دیکھ بھال کو دیکھ کر کہا کرتی:

''ہم چاروں جب مل بیٹھتے ہیں تو لگتا ہے کہ یورپ اور ایشیا دونوں کانٹی نینٹ اکٹھے ہو گئے ہیں...... دیکھنا باقی کے تین کانٹی نینٹ بھی اسی طرح مل جائیں گے۔ پھر دنیا میں امن ہی امن ہوگا۔"

لیکن میں سمجھ سکتا تھا اور اپنے اندرون کی نچلی سطح تک محسوس کر سکتا تھا کہ روتھ ایک Idealist ہے، آدرش وادی ہے۔ اسی نظریے اور جذبے کے زیرِ اثر وہ دُنیا کو دیکھتی ہے اور اسی جذبے میں سرشار وہ میرے قریب آئی تھی۔ اور ہم نے صدقِ دل سے ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈالی تھی، جس کا ثمر قدرت نے ہمیں دو صحت مند بچوں کی صورت میں عطا کیا ہے۔ اب وہ بچے وقت کے ساتھ ساتھ ہماری آنکھوں کے تارے بھی بن چکے ہیں۔

''جنت میں ہم دو، ہمارے دو" ہر پہلو سے مطمئن اور خوش تھے۔ بچے سکول جانے لگے تھے۔ روتھ نے دوبارہ ریسٹورنٹ میں پھر سے کام شروع کر دیا تھا۔ کافے کا اطالوی مالک روتھ کے کام کو بہت پسند کرتا تھا۔ پرانے گاہک روتھ کو دوبارہ وہاں پا کر بہت خوش ہوئے تھے۔ کافے کی بِکری بھی بڑھ گئی تھی۔ روتھ دوپہر بچوں کو سکول سے گھر لے آیا کرتی تھی۔ وہ تیزی سے قد کاٹھ نکال رہے تھے۔ مگر انہیں دور سے یا نزدیک سے دیکھنے پر وہ نہ تو انڈین دکھائی دیتے اور نہ ہی انگلش۔ بلکہ میڈی ٹیرینین (Mediterranen) بحرِ روم کے کسی ملک کے لگا کرتے۔ لیکن ہم ان میں اپنے ملے جلے رنگ دیکھ کر بے پناہ خوش ہوتے۔ ایک رات جب ارون اور ملا اپنے مقررہ وقت پر ٹیلی ویژن دیکھ کر اُٹھ

کھڑے ہوئے اور ممی ڈیڈی کے گال چوم کر "گڈ نائٹ" کہہ کر اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو روتھ اُٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور سر میرے کندھے پر رکھ کر کہا "راکی (راکیش) ڈارلنگ! خوش ہو جاؤ"

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں۔ میں پھر سے ماں بننے جا رہی ہوں۔"

مجھے ذہنی جھٹکا لگا اور وہ بھی اتنا شدید کہ مجھے اپنی معلومات اور ہوشمندی پر شبہ ہونے لگا۔ میں اپنے دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد روتھ کے بدن کو اُن ہی دنوں میں چھوا کرتا تھا جو سیف پیریڈ کہلایا جاتا ہے اور جن میں حاملہ ہونے کے امکانات کم رہتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ میری اور روتھ کی مشترکہ آمدنی سے بچوں کی متوازن غذا، اُن کی پرورش، اُن کی جا بے جا مانگیں، گھریلو اخراجات اور پانی، بجلی، گیس، ٹیلیفون اور انشورنس کے بل ادا ضرور ہو رہے تھے۔ مگر ہم بچوں کے مستقبل اور اپنے بڑھاپے کی خاطر اتنی رقم پس انداز نہیں کر پا رہے تھے، جتنی کہ درکار تھی۔ تیسرا بچہ آنے پر تو یقیناً ہمارا ہاتھ تنگ ہو جائے گا؟ روتھ کو بھی ملازمت سے الگ ہونا ہوگا؟ لیکن یہ تمام حقائق اپنی جگہ پہ تھے اور میرا دل اپنی جگہ پہ۔

"تم جانتی ہو بچے مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں..... اب آنے والا آ ہی رہا ہے تو ہم اُسے کیونکر روک سکتے ہیں؟...... اگر خرچ پورے نہ ہوئے تو چند زیادہ اوور ٹائم کر لیا کروں گا؟"

وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی، کچھ اس انداز میں کہ میرے جسم کی واحد مالک وہی ٹھہری ہو۔ اُسے کاٹنے اور اُس پر دانتوں کے گہرے نشان چھوڑنے کا اختیار بھی اُسی کو ہو۔

اُس رات برسوں بعد ہم نے ایک دوسرے کے بدن کے تمام کس بل پہلی وصل ملاقات کی مانند پھر سے ٹٹولے تھے۔ چاند بھی اُس رات کئی ہفتوں کی غیر حاضری کے بعد روشن ہوا تھا۔

ہماری تیسری سنتان مقررہ وقت سے دس بارہ روز پہلے ہی سنسار میں چلی آئی تھی۔ روتھ کو ہسپتال میں داخل کراتے وقت اُس کا فشارِ خون اتنا بڑھ چکا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ زچگی کے دوران بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ روتھ دردِ زہ کے اذیت ناک عمل سے گزرتی موت اور زندگی کے درمیان جھول رہی تھی۔ میں لیبر اور ڈلیوری وارڈ کے باہر کوریڈور میں کھڑا انتہائی فکرمند اور پریشان تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کڑے وقت کے گزرنے پر میں نس بندی کا آپریشن کروا لوں گا تاکہ روتھ کو آئندہ اس جان لیوا عمل سے گزرنا نہ پڑے اور نہ ہی مجھ جیسے کمزور شخص کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ روتھ کی کربناک چیخیں برابر میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میرا دل تو کب کا میرے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ لیکن ڈاکٹر سیانے تھے۔ وہ اپنے وسیع تجربات اور فنی ذہانت سے زچہ اور بچے کو بچانے میں جُٹے ہوئے تھے۔ پھر اچانک گھنٹوں کے ڈوب جانے پر ایک نرس نے آ کر اطلاع دی کہ تمہاری وائف اور تمہارا بے بی بوائے دونوں صحیح سلامت ہیں تو میری جان میں جان آئی۔ تب میرے ہاتھ خود بخود آسمانی باپ کا شکریہ ادا کرنے کو فضا میں اُٹھ گئے۔

اپنے نوزائیدہ بچے کو پہلی بار ہاتھوں میں لینے پر جب میں نے فخریہ مسکراہٹ اور بھرپور پیار کے ساتھ اُسے غور سے دیکھا تو میری مسکراہٹ اور پیار چہرے پر فریز ہو کر رہ گئے اور میرے ہاتھ کپکپا اُٹھے۔ لگا کہ بچہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا۔ اُس کا رنگ روپ اپنے بہن بھائی سے ذرا بھی میل نہ کھاتا تھا۔ اُس کے بدن کی جلد بھی گوری چٹی تھی۔ بال سنہری تھے۔ آنکھیں بند تھیں، ورنہ وہ بھی اپنی زبان بولتیں۔ وہ گل گوتھنا بھی ننھا، جب کہ اُس کے بہن بھائی میرے سانولے بدن سے کچھ نہ کچھ چرا کر دنیا میں آئے تھے۔ نوزائیدہ کو دیکھ کر وہ بالکل ایک انگریز بچہ جان پڑتا تھا۔ میں اُس کے وجود میں خود کو کہیں بھی نہیں پا رہا تھا؟ ایک بھیانک خیال میرے ذہن سے گزرا کہ ہو نہ ہو یہ بچہ میرا نہیں ہے؟ کسی غیر کا ہے؟ مگر یہ شکوک پیدا ہوتے ہی مجھے ندامت بھی ہوئی تھی کہ روتھ تو میری دیوانی ہے۔ کتنا پیار، کتنا احترام کرتی ہے میرا۔ بارہا کہہ چکی ہے "راکی ڈارلنگ! تم میں اور ایک انگریز شخص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ ہر دم اپنے فائدے اور اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ جب کہ تم ہمیشہ بچوں کی بہتری اور میرے متعلق سوچا کرتے ہو...... پھر سب سے بڑی بات، تم نے خود کے متعلق سوچنا ہی بند کر دیا ہے۔"

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود میں نوزائیدہ بچے میں خود کو کہیں بھی نہیں پا رہا تھا؟

میں روتھ کو ہسپتال سے بیشتر کی طرح ٹیکسی میں لے کر گھر چلا آیا تھا۔ گذشتہ دونوں بار ہسپتال سے چلتے وقت بچہ میری گود میں رہا تھا۔ اُس کے رونے پر یا روتھ کے طلب کرنے پر بھی میں اُسے اُس کی ماں کے حوالے نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس بار بچہ روتھ کی گود میں تھا اور میں دوڑتی بھاگتی ٹیکسی سے عمارتیں، ٹریفک اور ڈبل ڈیکر بسیں دیکھ رہا تھا۔

گھر میں ارون اور ملایا بے حد خوش تھے۔ انہیں بیٹھے بٹھائے ایک کھلونا مل گیا تھا۔ وہ اپنے ننھے منے بھائی مائیکل کے سرہانے کھڑے ہوئے ٹکر ٹکر دیکھا کرتے۔ جتا جتا کر اُس کے گال چھوا کرتے ہوئے چوما بھی کرتے۔ اب اُس کی آنکھیں وا ہونے لگی تھیں۔ اُس کی سبز مائل آنکھوں کا رنگ بھی اپنی ماں پر گیا تھا۔ وہ روتا تو اُس کے بہن بھائی بھاگ کر اپنی ماں کو اطلاع دیتے۔ ایک بار بالکل ایسا ہی ہوا۔ شام اُتر رہی تھی۔ میں کوئی گھر پر تھا۔ مائیکل کے رونے

پر بچے بھاگ کر کچن میں داخل ہوئے۔ روتھ، مائیکل کے واسطے دودھ کی خوراک تیار کر رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے مجھ کو آواز دی: "دیکھو تو۔ مائیکل رو رہا ہے۔ اُسے اُٹھا لو۔ میں دودھ لے کر بس آئی کہ آئی۔" لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ میں جب بھی مائیکل کے قریب گیا، اُسے اُٹھاتے وقت میرے ہاتھ کانپ اُٹھے۔ وہ مجھے اجنبی سا لگا۔ اُسے نہایت غور سے دیکھنے پر بھی میں نے خود کو اس کے کسی انگ میں نہ پایا۔ ایک بار روتھ نے مذاقاً اور شکایتاً کہا بھی تھا:

"جب سے میں ہسپتال سے آئی ہوں۔ تم مائیکل سے دُور دُور رہتے ہو؟ ...... نہ تو پہلے بچوں کی طرح مائیکل کے آگے پیچھے ہوتے ہو اور نہ ہی اُسے اُٹھا کر اپنی بانہوں میں بھرتے ہو؟ اور نہ ہی اُس کے گال چوم چوم کر سُرخ کرتے ہو؟"

"ہاں ہاں...... نہیں نہیں...... ہاں۔" پھر میں نے خود پر قابو پالیا: "مائیکل اپنے بہن بھائی سے بالکل الگ الگ سا دِکھتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ پورے کا پورا مجھ پر گیا ہے۔" اُس نے فخریہ کہتے ہوئے گردن اونچی کر لی۔

"اور میں......؟"

"تمہارے بغیر مائیکل اِس دُنیا میں کیونکر آ سکتا تھا...... ذرا سوچو تو؟"

میں اُس سے کیا کہتا کہ سوچنا تو میں نے اُسی روز سے شروع کر دیا تھا جب مائیکل کو پہلی بار میں نے آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔ مجھے زبردست دھکا لگا تھا کہ وہ میری اولاد نہیں ہے، کسی غیر کا بچہ ہے، جس کا بدقسمتی سے میں ہی باپ کہلایا جاؤں گا۔ پھر میرا یہ خیال دھیرے دھیرے جڑ پکڑتا یقین کا روپ دھار بیٹھا کہ روتھ نے جب ہمارے کیفے اور ہوم میں ملازمت کی تھی تو اُس نے وہاں کے حسین مالک یا کسی انگریز گاہک کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اُن دنوں بہت خوش خوش رہنے لگی تھی۔ ایک بار میں نے وجہ بھی جاننا چاہی تھی تو اُس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا "ڈارلنگ، دوبارہ کام شروع کرنے پر میں نے محسوس کیا۔ میں پھر سے آزاد ہو گئی ہوں...... بچے سکول جانے لگے تھے...... تم کام پر چلے جاتے۔ میں گھر کی دیواروں میں گھری خود کو بہت اکیلا پایا کرتی۔ مگر اب مجھ کو نئی زندگی مل گئی ہے...... کسٹمرز سے زیادہ تو گورا خوش رہتا ہے...... پرانے کسٹمرز بھی زیادہ آنے لگے ہیں اور سیل بھی بڑھ گئی ہے۔"

"اور تمہاری سیلری بھی؟"

"ہاں۔ مگر میری توقع سے کم...... مگر چند ماہ میں ضرور بڑھ جائے گی۔ گورا ہمیشہ سے مجھ پر مہربان رہا ہے۔"

گھر میں تنخواہ کے بڑھ جانے پر روتھ محسوس کرنے لگی تھی کہ میں صرف مائیکل سے ہی نہیں، اُس سے بھی پرے پرے رہنے لگا ہوں۔ میں اُس سے صرف کام ہی کی بات کرتا۔ ورنہ کتاب یا اخبار پڑھنے میں مگن رہتا یا بچوں کے امور میں دلچسپی ظاہر کرتا۔ مائیکل کی طرف قدم بڑھاتے وقت کوئی غیر مرئی طاقت میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دیتی اور میرے پاؤں وہیں جم جاتے۔ میرا ضمیر بار بار مجھ سے کہہ چکا تھا کہ کسی کا گناہ اُٹھا کر گلے سے لگا اور اُسے اپنی اولاد سمجھ کر پالنا عقلمندی نہیں ہے؟ روتھ میری ہر حرکت پر بڑی آنکھ رکھا کرتی۔ بعض دفعہ اُس کی پریشانی اس قدر بڑھ جاتی کہ وہ جی بھر کر مجھے کوستی۔ میں خاموش اُسے دیکھے بغیر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اِس پر وہ مزید پریشان ہو جاتی اور اُس کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ جاتا کہ اُس کا چہرہ ڈراؤنا نظر آتا۔ جلی کٹی سنانا اُس کی فطرت بنی جا رہی تھی۔ میری خاموشی حد سے بڑھ جانے پر جب وہ برداشت نہ کر پاتی تو چار حرفی فحش الفاظ کا سہارا لے کر مجھ پر برس پڑتی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ برسوں کی ازدواجی زندگی میں اُس نے اِس طرح کی گھٹیا زبان کبھی استعمال نہ کی تھی۔ خیال آیا کہ آدمی اپنے خاندانی پس منظر اور ماحول سے الگ ہو کر کتنا بھی مہذب کیوں نہ بن جائے؟ لیکن وہ اپنے لڑکپن کے ماضی سے الگ نہیں ہو پاتا؟ اُس کی سرشت ہزار پردوں کو چیر کر بھی پھوٹ نکلتی ہے؟ روتھ کی اونچی اونچی آوازیں سن کر بچے سہم جاتے۔ ننھا مائیکل ڈر کر رو دیتا۔ روتھ دیوانہ وار لپک کر اُسے اُٹھا لیتی۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ اِس پریشان کُن اور بگڑے ہوئے ماحول میں اپنا جیون کب تک گزاروں گا؟

وقت رُوٹھ کے کہاں رُکتا ہے؟ وہ پڑتا کراہتا رہتا ہے۔ ایک روز میں دوپہر کی ڈیوٹی بجا کر شام کو دیر سے گھر لوٹا۔ بچے سو رہے تھے۔ مائیکل بھی اپنی Cot میں بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ لیکن روتھ جاگ رہی تھی۔ اُس سے مختصر کلام کے بعد میں نے کچن میں داخل ہو کر ڈنر کرنا چاہا۔ کچن لاؤنج سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ روتھ وہاں بیٹھی اُکھڑی اُکھڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جونہی پلیٹ اُٹھائی، اُس کی گرجدار آواز سارے گھر میں پھیل گئی: "ڈنر بعد میں کرنا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے؟"

میرے لاؤنج میں داخل ہونے پر اُس نے دروازہ بند کر ڈالا کہ بچوں کی نیند میں خلل نہ ہو۔

"کیا ہے؟" میں نے بھی روکھے پن سے قدرے اُونچا لہجہ اختیار کیا۔

"شور مت مچاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ گیا اور لاؤنج کی مدھم روشنی میں اُس کا غصے سے بھرا ہوا چہرہ صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بیزار سا تھا۔ اُس نے اپنا غصہ دکھانے کی خاطر کمرے میں چند قدم آگے پیچھے کی طرف اُٹھائے اور میرے قریب آ کر بولی: "کیا تمہیں یاد ہے کہ مائیکل اگلے ہفتے ایک برس کا ہو جائے

گا؟" مجھے واقعی اس کا یومِ ولادت یاد نہ رہا تھا۔ میں شرمسار سر جھکائے کھڑا ہی رہ گیا۔
"اس کی سالگرہ ہمیں منانی ہے۔ بچے بھی ضد کر رہے ہیں.....
مگر سال بھر میں تم نے مائیکل کو مشکل سے سات آٹھ بار اُٹھایا ہوگا؟.....وہ بھی
میرے کہنے پر اور مجبور کرنے پر..... میں پوچھتی ہوں کیوں؟" یہ سن کر میں
ایک طرح سے خوش بھی ہوا کہ اپنا دل کھولنے کا موقع شاید نصیب ہو۔
"میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مائیکل مجھے دوسرے بچوں
سے بالکل الگ سا دکھتا ہے..... ایسا لگتا ہے وہ..... وہ آکاش سے اُترا
ہے۔"
وہ چونکی۔ لیکن اس نے طنزاً جواب دیا: "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو
کہ مائیکل تمہارے بچوں کا بھائی نہیں ہے؟"
"میں نے یہ کب کہا؟"
"پھر کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم مائیکل کے باپ نہیں ہو؟"
"اس کا جواب تمہارے پاس ہے، صرف تمہارے پاس۔"
یہ سننا تھا کہ اس کے چہرے پر آگ سی لگ گئی۔ وہ زخمی شیرنی کی
طرح میری طرف لپکی۔
"تمہارا مطلب ہے جب میں نے کانف میں رہ کر کام شروع کیا
تو میں نے وہاں کسی غیر کے ساتھ ناجائز رشتہ قائم کر لیا تھا؟"
"اس کا جواب بھی تمہارے پاس ہے، صرف تمہارے پاس۔"
"شٹ اپ۔ میں نے تمہارا گندہ ذہن پڑھ لیا ہے" وہ بالکل
میرے قریب آ گئی۔ پھر میری آنکھوں سے ہو کر میرے دل میں چھید کرنے لگی:
"میرج کے بعد میں نے تمہارے سوا کسی دوسرے شخص کا ہاتھ پکڑا ہو تو میں
گنہگار..... تمہیں یقین آئے تو ٹھیک، ورنہ فیصلہ کورٹ اور ڈائی ورس کی صورت
میں ہوگا۔ میں تمہارا سائلنٹ ٹارچر اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔" دروازے
کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اچانک رک گئی۔ گویا مڑ کر اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔
بولی: "میں نے ایک خواب دیکھا تھا، جب تم لوگ نئے نئے اس ملک میں آئے
تھے۔ مگر تم بالکل ری ایکشنری (رجعت پسند) نکلے۔ اب وہ خواب ڈھیر ہو گیا
ہے اور اس کے ذمہ دار تم ہو؟"
وہ رات مجھ پر واقعی بھاری گزری تھی۔ مگر ایک بات میرے ذہن
میں بالکل صاف ہو چکی تھی کہ روتھ نے اپنی صفائی میں جو کچھ بھی کہا ہے، اس کے
پس پشت اس کا اپنا گناہ کا ڈر رہا تھا، جس پر پردے ڈال کر وہ میرے ساتھ
نفسیاتی ناٹک کھیل رہی تھی۔ لیکن میں اس کی باتوں پر ایمان کیسے لے آتا جبکہ
مائیکل کے وجود میں کہیں بھی میں شامل نہ تھا۔ روتھ نے میرے پہلے دو بچوں کو
بھی تو جنا تھا؟ جن میں روتھ کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔ مگر اس بار.....؟؟
میرے ارد گرد پھیلا ہوا اندھیرا چھٹا تو مجھے اپنی بنیاد اپنی زمین ہموار کرنے کا
خیال آیا۔ تاکہ مستقبل قریب میں میں کوئی مثبت قدم اٹھا پاؤں؟ یہی سوچتے
سوچتے اس رات میں لاؤنج کے صوفے پر دراز ہو گیا۔ روتھ نے میرا بستر وہاں
رکھ چھوڑا تھا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ طرح طرح کے بے ربط خیال مجھے پریشان کر
رہے تھے۔ اچانک میرے والد مرحوم کہیں سے نمودار ہو کر میرے سامنے آن
کھڑے ہوئے اور وہ اپنا کہا دہراتے چلے گئے۔ "جس قوم کی لڑکی سے تم نے
بیاہ رچایا ہے، اس قوم کی اخلاقیات اور وفاداری کے معیار ہماری سنسکرتی سے
بالکل الگ ہیں۔ تمہیں ان کی اخلاقی روایات کو سمجھنا ہوگا اور ان کے انوسار اپنا
جیون گزارنا ہوگا۔"
مجھے سخت افسوس ہوا کہ میں مختلف تہذیبوں کا شکار ہوا جا رہا ہوں
اور جانے میرا حشر کیا ہوگا؟ ان حالات میں میرا روتھ کے ساتھ رہنا مشکل ہو رہا
تھا۔ گو کہ میں اس سے بھرپور محبت کرتا تھا لیکن ہمارے درمیان اب مائیکل آن
کھڑا ہوا تھا، جو میری آنکھ کو نہ تو ایک پل بھاتا تھا اور نہ ہی گھر میں اس کی
موجودگی برداشت ہوتی تھی۔ لیکن میرے اپنے بچے میرا خون تھے، میرے لختِ
جگر تھے۔ ان سے الگ ہونے کو میں کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھا، خواہ مجھے قانونی
کارروائی کیوں نہ کرنی پڑے؟
ہمارا فیملی ڈاکٹر (جی پی) شمالی آئر لینڈ کا کیتھولک آئرش تھا۔ وہ
ڈاکٹر تو تھا ہی، ماہر نفسیات بھی کسی طور کم نہ تھا۔ اس کی سرجری ہماری قیام گاہ سے
دور نہ تھی۔ میں مقرر دن کے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر
کو اپنے مسئلے سے وابستہ روتھ، مائیکل اور اپنے متعلق ہر پہلو تفصیل میں بیان کر
دیا۔ وہ دیر تک خود میں گم رہا۔ کبھی کبھار وہ مجھ کو آنکھ بھر کر دیکھ لیتا۔ شاید وہ مسئلے کا
کوئی حل تلاش کر رہا تھا؟ انجام کار اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی بامعنی مسکراہٹ
ابھری تو میں اس کو سننے کے لئے تیار ہو گیا۔
"تم کو شک تھا۔ لیکن اب یقین ہو چلا ہے کہ تمہاری وائف نے
بے وفائی کی ہے۔ اور وہ بچہ تمہارا نہیں ہے؟"
"ہاں ڈاکٹر۔"
"مگر ایک بات تم سے ضرور کہوں گا؟"
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں جھپکائے بنا میں اُسے دیکھتا
رہا۔ وہ بولا: "عام طور پر ہر بچہ اپنے ماں باپ دونوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے
پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عورت کا ایک ایگ (Egg) اور مرد کا سپرم
(sperm) تحلیل ہو کر ایک خاص سمت میں سفر کرتے ہیں۔ مگر طبی اعتبار سے
مرد اور عورت میں چونکہ لاکھوں جاندار اور کمزور Genes پائی جاتی ہیں۔ ان
کی کوئی بھی طاقتور Gene سات پشتوں تک اپنا رنگ دکھا سکتی ہے۔ یعنی ہو بہو کو
دہرا سکتی ہے۔"
"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بچہ اپنی ماں یا باپ کی کسی جاءدار Gene کے تحت اُس کا کوئی مرض، رنگ روپ، شکل صورت لے کر اُس کی ہو بہو ڈپلی کیٹ کا پی بنا دُنیا میں چلا آتا ہے..... اور یہیں سے ہسبنڈ اور وائف کے درمیان شک کی لکیر اُبھرتی ہے؟"

"مگر یہ کیوں کر ممکن ہے؟" میں نے تڑخ کر یہ تڑکی جواب دیا: "میرے پہلے دو بچوں کا رنگ روپ، نین نقش بالکل الگ ہیں۔ اُن کے بال بھی سیاہی مائل ہیں۔ مگر یہ بچہ تو سنہری بال، صاف دودھیا رنگ، سبز مائل آنکھیں اور نین نقش بھی اپنے بہن بھائی سے الگ رکھتا ہے؟"

ڈاکٹر میرا ذہن تاڑ گیا تھا۔ مسکراتے مسکراتے اچانک محتاط ہو گیا۔ بولا: "میرج لائف پارٹنرز کے درمیان یقین اور بھروسے پر چلا کرتی ہے..... لیکن تمہارے کیس میں اگر تمہارا، تمہاری وائف اور تمہارے بے بی بوائے کا بلڈ ٹیسٹ (Blood Test) کروایا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"بالکل تو میں چاہتا ہوں۔"

"تب تمہارا ذہن بھی صاف ہو جائے گا۔" پھر ڈاکٹر نے کرسی پر پہلو بدلا: "اگر دوسرے ٹیسٹ کروانے کی نوبت آئی تو وہ بعد میں ممکن ہیں۔ تمہاری وائف ٹیسٹ دینے سے انکار تو نہیں کرے گی؟" اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں خاموش رہا۔ مگر ڈاکٹر میری خاموشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ "تم اپنی وائف سے پوچھ لو..... اگر وہ ٹیسٹ دینے سے ہچکچائے یا ٹال مٹول کرے یا صاف انکار کر دے تو سمجھ لینا۔ وہ وفادار نہیں تھی۔ اس نے Adulty کی تھی..... تب تک میں ہسپتال میں ٹیسٹ کروانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

چند روز بیت گئے لیکن مجھ میں روتھ سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی اور نہ ہی حوصلہ پیدا ہوا۔ مجھے اُس سے خوف آتا تھا۔ اُس کے چیخنے چلانے اور ہر بد الفاظ سن کر میرا بدن کپکپا اُٹھتا۔ لیکن مسئلہ اپنی جگہ گھمبیر تھا اور روتھ سے جاننا ناگزیر تھا۔

ایک شام ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اور گھر کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے میں نے دل کڑا کر لیا تھا کہ گھر پہنچ کر روتھ سے دریافت کر کے ہی دم لوں گا کہ مائیکل کا اصل باپ کون ہے؟ خواہ اپنی بیت کی لڑائی یا مہابھارت کا یدھ کیوں نہ چھڑ جائے؟ گھر میں داخل ہُوا تو بچے لاؤنج میں کھیل کود رہے تھے۔ انہیں پیار کرتے وقت میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر روتھ کہیں نظر نہ آئی۔ خیال آیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوگی؟ لیکن میں کچن میں داخل ہُوا تو وہ اتفاق سے وہاں موجود تھی۔ میں نے چائے کی کیتلی کا بٹن دبایا۔ اخلاقاً اُس سے بھی چائے کے لئے پوچھا مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور تنی ہوئی گردن اور گھورتی ہوئی نظروں سے مجھ کو دیکھتی چلی گئی گویا مجھ سے کوئی گناہِ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔

سخت لہجہ اختیار کیا۔ بولی: "تم ڈاکٹر سے سرجری میں ملے تھے؟"

"ہاں..... تو؟"

"آج سرجری سے فون آیا تھا؟"

"پھر.....؟"

"رسیپشنسٹ (Receptionist) جاننا چاہ رہی تھی کہ ہم نے بلڈ ٹیسٹ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تو.....؟"

"میں نے کھلے لفظوں میں اُس سے کہہ دیا ہے کہ میں کوئی بھی وقت، کسی بھی لیبارٹری میں، کسی بھی ہاسپٹل میں اپنا اور مائیکل کا خون ٹیسٹ کروانے کو تیار ہوں..... رہا میرا ہسبنڈ تو وہ ڈاکٹر کو خود ہی فون کرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن سے نکل گئی۔ لگا کہ جلد گھر میں طوفان آنے والا ہے؟ دیواریں آپس میں ٹکرائیں گی؟ میں اور روتھ ہاتھا پائی کی نوبت سے بھی گزر جائیں گے؟ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ طوفان آیا، نہ دیواریں ٹکرائیں اور نہ ہی ہاتھا پائی ہوئی۔ لیکن روتھ نے جس جوش کے ساتھ اپنا فیصلہ سنایا تھا، اُس میں اُس کی زخمی روح چیخ اُٹھی۔ آنکھیں اور لہجہ ایک ایک بھی شامل تھا۔ انہوں نے مجھے اتنا جھنجھوڑا، اتنے جھٹکے دیئے کہ میرے شکوک اور میرا یقین متزلزل ہونے لگے۔ مجھے اپنی عمارت کے ساتھ آس پاس کی بلند و بالا عمارتیں بھی ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اچانک یہ خیال بھی کوندا لپکا کہ کسی شخص پر بغیر کسی ثبوت کے شک کرنا ذہنی دیوالیہ پن کی نشانی ہے۔ بلکہ علمِ نفسیات کے نزدیک دوسرے کو روحانی طور پر زخمی کرنا ہے..... تو کیا میں بھی اِن رویوں کے تحت روتھ کو لاحق زخمی کرتا رہا؟ اُسے اذیت دیتا رہا؟ یہ محسوس کرتے ہی میرا ضمیر اور میری ذات چوراہے پر کھڑے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں اپنے ہنستے کھیلتے پریوار کو برباد کرنے پر کیوں تُلا بیٹھا تھا؟ ہر چھوٹے بڑے کی مسکراہٹ چھیننے کے درپے کیوں تھا؟

میں نیند کو آنکھوں میں لئے لاؤنج کے صوفے پر دراز کروٹیں بدل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچتا بھی جا رہا تھا کہ شام میں جب روتھ اپنا فیصلہ سنا کر چلی گئی تھی تو اُس سے بھگوان رام میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھگوان ہوتے ہوئے بھی ایک عام شخص کے روپ میں دھرتی پر آئے تھے۔ وہ بھی اپنے جیون میں شک سے الگ نہیں ہو پائے تھے۔ جب کہ سیتا ماتا کو رام جی نے ہی راون کے چنگل سے آزاد کروایا تھا۔ مگر سیتا ماتا کو اپنی پاکیزگی کا ثبوت اگنی پریکشا کی صورت میں دینا پڑا تھا۔ وہ پتر دیوی جب بلا کسی ڈر اور بھے کے اگنی سے گزر گئی تھی اور اُس کا بال بھی بیکا نہ ہوا تھا تو رام جی کا سر مارے شرم کے سینے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ اُس پل مجھے روتھ کی صورت میں سیتا دکھائی دی۔ پھر دونوں صورتیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں اور دیر تک مجھے ہر سُو سیتا ماتا

ہی دیکھتی رہیں۔

میں بے خبر سو رہا تھا۔ پو پھٹنے کے قریب تھی۔ مائیکل کا رونا سن کر
یکبارگی میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے رونے کی آواز دو
کمروں کی دوری سے آ رہی تھی۔ اُس کی خوراک کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن روتھ ہر
صبح کی طرح بستر سے نہ اُٹھی اور نہ ہی اُس نے مائیکل کے کمرے میں داخل ہو کر
اُسے اُٹھایا۔ اُس کا رونا بدستور دونوں کمروں میں جاری رہا۔ میرے اندر اتھل
پتھل مچ گئی میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ مائیکل کا زار و زار رونا فلیٹ کے ہر حصے
میں گونج رہا تھا۔ میں تیزی سے اُٹھا۔ لاؤنج کے دروازے سے ٹکرایا۔ مگر چوٹ
اور درد کی پروا کیے بغیر مائیکل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں صاف
صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ Cot میں پڑا اندھیرے میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں
چلائے روئے چلا جا رہا ہے۔ میرے پاؤں میں برق تیزی پیدا ہوئی اور میں
نے بڑھ کر اُسے اُٹھا لیا۔ پھر اُس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر اس کی پشت کو تھپکنے
لگا۔ اس عمل کے دوران چند بول اپنے آپ میرے لبوں سے ادا ہوئے:

"بس بس میرے بچے بس۔ روو مت۔ اب میں آ گیا ہوں۔ تیری
ممی بھی آتی ہو گی۔"

اُس کا رونا قدرے کم ضرور ہوا مگر بند نہ ہوا۔ اتنے میں کمرہ
اچانک روشن ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو روتھ ہاتھ میں دودھ کی بوتل لیے
دہلیز پر کھڑی تھی۔ سنجیدہ مُہر بہ لب، چہرہ ہر جذبے سے عاری۔ لیکن اس کی آنکھوں
کی جامد پتلیاں صاف صاف کہہ رہی تھیں: "بہت دیر کر دی لوٹنے میں؟.....
سب کچھ برباد کر کے اب ہوش میں آئے ہو؟" میرے پاس جواب دینے کو کچھ نہ
بچا تھا۔ نہ کوئی دلیل، نہ کوئی منطق اور نہ ہی کوئی جواز۔ میں نے مسکرانے کی شعوری
کوشش کی۔ لیکن میری مسکراہٹ مجھے اپنے ہی گھر میں اکیلا چھوڑ کر جانے کہاں
غائب ہو گئی تھی۔ میں نہیں جانتا۔ مائیکل کا رونا جاری تھا اور میرا ہچکیانا بھی اور
اُسے چپ کرانے کی کوشش بھی۔ میں نے اُسے چوم کر روتھ کے حوالے کر دیا اور
آنکھیں قالین سے اُٹھائے بغیر بولا: "صبح ڈاکٹر کو فون کر دینا۔ ہم اپنا بلڈ ٹیسٹ
بھی کرائیں گے۔"

"یہ کام تم کرو گے، میں نہیں؟" اُس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔ "یہ
کھیل تم نے شروع کیا تھا؟..... ختم بھی تم کرو گے؟"

"ہاں۔" باریک سی آواز میرے گلے سے نکلی۔ "یہ کام مجھ ہی کو کرنا
ہو گا۔"

اور جب میں کمرے سے ایک ٹوٹے پھوٹے شخص کی طرح نکلا تو
محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنا پریوار ضرور بچا لیا ہے لیکن گھر گرہست میں اتنی
دراڑیں ڈال لی ہیں کہ برسوں میں وہ شاید ہی سنبھل پائیں؟

1 انگلش slang میں ماں کو گوگا کہتے ہیں۔ یہ کوڈ کا مخفف ہے۔

# مکمل نامکمل

مشتاق اعظمی

وہ کمرے سے متصل کوریڈور میں آ گیا۔ یہاں تک آنے میں اُسے
بڑی مشقت کرنی پڑی تھی۔ ہر طرف دھند کی تاریک چادر پھیلی ہوئی تھی۔ چاند
بادلوں کی اوٹ میں گم تھا۔ بس ایک ستارہ چمکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔
رات سڑکوں پر بھرپور اداسی لئے پھیل رہی تھی۔ لوگ گرم کپڑوں
میں سمٹ کر چل رہے تھے۔ ہوا میں ابھی خاصی ٹھنڈک تھی۔ سڑک کے کنارے
کھڑے لیمپ پوسٹوں پر بھی ٹھنڈک کا اثر تھا۔ سامنے کے لیمپ پوسٹ کے
نیچے وہ رات کے خالی پن کو بھرنے کے لئے کسی راہ گیر کا انتظار کر رہی تھی۔
تبھی ایک کار رکی اور وہ اس میں سما گئی۔
صبح سویرے تھکی ہوئی عورت نے سو سو کے تین نوٹ اپنے شوہر کی
طرف بڑھا دیئے۔
"میں لے کر کیا کروں گا" شوہر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میں
اپاہج ہوں، تمہیں نہ روک سکتا ہوں نہ منع کر سکتا ہوں۔"
"کل پہلی رات تھی، تھک گئی ہوں۔ میں سونے جا رہی ہوں۔
اب تو ہر رات جاگنا ہوگا" بیوی آنسو ضبط کرتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔
شوہر کی آنکھیں خلا کو تک رہی تھیں اس کا ماضی شاندار تھا۔ لیکن
حال کتنا کرب انگیز ہے اور مستقبل کتنا بھیانک ہوگا.....! وہ پی ڈبلیو ڈی آفس
میں کلرک تھا۔ جائز ناجائز ملا کر اچھی خاصی رقم کما لیتا تھا۔ شادی کو ڈیڑھ سال ہی
ہوئے تھے اولاد کا مسکراتا ہوا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن ٹھیکیدار کے بنگلے
میں آ کر اس نے شراب پی لی۔ بار سے نکل کر گھر کی طرف جا ہی رہا تھا کہ
اچانک ایک تیز رفتار ٹرک نے دھکا دے دیا۔ ٹرک کے پیچھے ایک کار آ رہی تھی۔
کار کے پہیے اس کے آدھے دھڑ کو بیکار کر گئے۔ اُسے اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ
اپنے آپ کو سنبھال سکتا۔ ایک ہاتھ بھی بری طرح مجروح ہوا تھا۔ اُسے ہوش
اسپتال میں آیا۔ لیکن اس وقت تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بیوی نے شادی کے
سارے زیور بیچ ڈالے گھر کی جمع پونجی بھی علاج میں لگا دی تھی۔ لیکن اب وہ محض
گوشت کا لوتھڑا رہ گیا تھا۔ مدد کے نام پر کوئی ہاتھ بڑھانے کو تیار نہیں تھا۔ سبھی اپنے
بیگانے ہو چکے تھے۔ وہ مل ڈول کر ہاتھ کے سہارے کسی طرح کوریڈور میں
آ جاتا تھا۔ اس سے زیادہ کی صلاحیت نہیں تھی اس میں۔

بیوی نے ہر طرف سے ناامید ہو کر وہ سوچا جو اسے نہیں سوچنا
چاہئے تھا۔ مگر بے بسی نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ رات کا تجربہ پہلا تھا اور
اسے تین سو روپے ملے تھے!
سو کر اٹھنے کے بعد وہ پھر لیٹ گئی۔ زندگی کے خالی پن پر اس نے
غور کیا۔ نظر گھما کر دیوار کو، چھت کو، سامان سے خالی کمرے کو دیکھا۔ اس کی زندگی
بھی تو سونی ہے۔ بغیر اولاد کے عورت مکمل نہیں ہوتی۔ ادھورا پن جیسے اس کی
قسمت ہے۔ دو کمرے کا یہ سسرالی مکان گویا اس کے لئے کوئی قبر ہو! قبر میں بند
وہ اور بے مصرف اس کا شوہر۔ موت سے بھی بدتر زندگی جیتا ہوا۔
وقت کافور کی طرح اڑتا رہا۔ ہر دو تین روز پر کسی بدروح کی طرح
وہ قبر سے نکلتی اور رات گزار کر صبح سویرے آ جاتی۔ دن بھر سوتی۔ اگلے دن گھر کا
سامان لاتی۔ شوہر کے لئے دوائیں لاتی۔ پھل لاتی اور خالی کمرے کو سامان
سے بھرنے کی کوشش کرتی۔
دونوں نے وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا کہ زندہ رہنا اور کھو پانا
ہے بلکہ کھونے سے زیادہ زندگی کو جینا ہے جو ان کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کر رہی
تھی۔
ایک دن بیوی نے گھٹن کے ساتھ سوچا..... "یہ بازی کب تک
چلے گی۔ خود کو کب تک ہارتی رہوں گی۔ جینے کی چاہ آخر کس کے لئے ہے۔
سارے مہرے پٹ کر مر گئے ہیں۔ بساط کا رخ تبدیل کیسے ہو۔ اپنے گھر
میں دونوں فرد سلامت کہاں ہیں۔ زندگی کی بساط پر اس بازی کا اثر کیا ہو
گا.....؟" اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر بھی کسی سوچ میں گم تھا۔
خاموشی کو توڑتی ہوئی وہ بولی "مجھے بتاؤ جہاں سوچ کے اوقات اور
لمحے ایک ہو جائیں، جہاں احساس مردہ ہو جائے، جہاں چار آنکھوں میں آنسو
ایک ساتھ اتریں، جہاں درمیان میں جدائی کا لفظ آ جائے تو.....!"
"کیا مطلب؟" شوہر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"میں ابھی تک لمحہ لمحہ، سانس سانس اور قدم قدم تمہارے ساتھ
ہوں، لیکن اب جدائی کی لکیر کی لمبائی میرے ذہن میں ڈولنے لگی ہے۔"
"یعنی؟" وہ خوف سے کانپ گیا۔
"تمہاری آنکھوں میں خوف آ گیا ہے۔ یعنی تم وہ سمجھ گئے جو میں
کہہ رہی ہوں۔"
"پھر؟"
"وقت میرے لئے پل پل جابر ثابت ہو رہا ہے۔ اس الجھے
پیچیدہ جال سے مجھے بھی نجات دلا دو۔"
گھٹن سے چور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کتنے ہی دن قتل ہو

گئے۔ وقت کی خانہ پری ہوتی رہی۔

تبھی ایک دن وہ چونک گئی..... اس دن اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے پیڑو پر ہاتھ پھیرا۔ کسی کا احساس اس کے وجود میں جیتا ابھر گیا!

ایک عجیب و غریب کیفیت کے ساتھ اس نے سوچا..... کیا میں مکمل ہو رہی ہوں؟ لیکن اس کا باپ؟ اس کی نگاہوں کے سامنے گذشتہ راتوں کے کئی چہرے گھوم گئے۔ مگر کوئی ایک چہرہ اس کے خیال کی حد میں نہیں آسکا۔

ہفتہ..... دو ہفتہ.... مہینہ گزر گیا۔ بے خود ہو کر جینے کی تمنا اس میں ہلکورے لینے لگی تھی۔

تب اس نے اپنے شوہر کو بتایا ’میرے اردگرد خوشبوئیں لپٹ گئی ہیں۔ میری روح نا قابل فہم قسم کے لذیذ جذبات اور خوبصورت احساسات کے ٹھنڈے آبشار سے سرشار ہے۔ میں اپنے اندر جس قرب کو محسوس کر رہی ہوں وہ تصوری امرت سے بڑھ کر ہے۔ میں سر سے پاؤں تک مسرت کے لمحات سے سرشار ہونے لگی ہوں۔ اور یہ کہ جینے کی چاہ بڑھ گئی ہے۔“

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں تم ماں بننے والی ہو!“

”ہاں۔“

”لیکن اس کا باپ میں نہیں ہوں۔“

”اور نہ کبھی بن سکتے ہو۔“

”میری مجبوری تم جانتی ہو۔“

”اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں اس کے باپ کو نہیں جانتی۔“

”اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اس پاپ سے چھٹکارا پا لو۔“

”کیا یہ پاپ نہیں ہے کہ میں ہر رات غیر مرد کے ساتھ گزارتی ہوں اور اسی پاپ کی کمائی سے تم اپنی سانس قائم رکھے ہوئے ہو۔“

”لیکن میں ناجائز بچے کو برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اور میں مکمل عورت بننا چاہتی ہوں۔“

دونوں نے اجنبیت کی چادر اوڑھ لی۔

اگلی صبح ابر آلود تھی۔

اس نے چادر ہٹا کر دیکھا..... اس کے شوہر کو چار کندھے کی ضرورت تھی۔

وہ روئی نہیں۔ آنسو تو کب کے خشک ہو چکے تھے اور اعتماد کی مضبوط گرفت کا سرا بھی اب باقی نہیں بچا تھا۔

سارے مرحلے سے گزرنے کے بعد کمرے سے متصل کوٹھے میں بیٹھ کر اس نے طمانیت سے سوچا..... اب میری کمائی آنے والے بچے کے لئے ہوگی جو متحرک ہوگا اور میری چاہت کو آگے بڑھائے گا۔

# فردوس بریں

## گلزار جاوید

پہلے پہل لوگوں کو اپنی سماعت پر شک گزرا، بڑے بوڑھوں نے نظر کے چشموں اور معتبر شخصیتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جنبش دیتے ہوئے خواتین نے منہ میں دبے پان اور سروں سے ڈھلکے دوپٹے سنبھالتے ہوئے نوجوانوں نے بکھری زلفوں اور پھولی سانسوں میں سمجھے سمجھے، ایک دوسرے سے سرگوشیوں کے انداز میں تصدیق کرتے ہوئے، ہونٹوں چڑھی کوٹھوں چڑھی کے مصداق پورے محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ جو لوگ اپنی سماعت کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے وہی لوگ اپنی بے بسی کا ماتم کرنے پر مجبور تھے۔ ہر کوئی ایک سے زائد بار قاضی صاحب کے فیصلے کی بابت مستند ذرائع سے تصدیق کرتا پھر افسوس اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں قاضی صاحب کے رویئے میں اچانک تبدیلی پر حیرت میں مبتلا ہو جاتا!

بات کسی مخبر یا مخبرا کے ذریعے اُن تک پہنچی ہوتی تو اس کی بابت شک شبہے کی گنجائش موجود تھی۔ بدھو صاحب جیسے متقی، پرہیزگار اور عالم فاضل شخص کی بات کو جھٹلانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ بدھو صاحب کی بابت پورے محلے کا اتفاق تھا کہ اُن جیسا شریف النفس، قناعت پسند اور صاحب کردار آدمی اُن کے محلے میں کیا دور دور تک نا پید تھا۔ گھر میں فاقے کی نوبت کے باوجود اُن کے چہرے پر ملال، شکوہ یا زود رنجی کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ رزق حلال پر یقین رکھتے تھے۔ خدا کے دیئے ہوئے علم، بصیرت اور بصارت کو کسی قیمت پر ذریعۂ معاش بنانے پر تیار نہ تھے۔ مسجد کی امامت اور دیکھ بھال کے عوض کسی طرح کا مالی تعاون، کسی شکل میں بھی قبول نہ کرتے تھے۔ اُن کے گزر اوقات کا ذریعہ فنِ کتابت تھا جو انھیں وراثت میں ملا تھا۔ اُن کے آبا کئی نسلوں سے فنی خطاطی اور فنی کتابت سے منسلک تھے۔ اس فن میں انھیں اس قدر کمال حاصل تھا کہ شاہی دربار تک اُن کی رسائی ممکن ہو چکی تھی۔ بڑے بڑے شعرا، ادیب سالار اُن کے خاندان کے فن کی مداح سرائی کیا کرتے تھے۔ بدھو صاحب کے پاس بھی بڑے بڑے عالم، شاعر اور ادیب اپنے مسودوں کی کتابت کے لئے پیشگی وقت لیا کرتے تھے۔ کبھی ہفتوں اور کبھی مہینوں انھیں اپنے مسودوں کی کتابت کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ بدھو صاحب کا شروع سے معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد کام شروع کر دیتے، گیارہ بجے چاشت کی نماز کا وقفہ اور ایک بجے کھانے اور ظہر کی نماز کا وقفہ کیا کرتے تھے۔ کچھ دیر قیلولے کے بعد کام شروع کر کے عصر کی نماز تک کام جاری رکھتے تھے۔ بعد از عصر، گھریلو کام کاج اور سودا سلف لانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اُن کے کوئی پرانے عزیز، کرم فرما، دوست یا مداح کسی مجبوری کے تحت عجلت کا اصرار کرتے تو بدھو صاحب مغرب کی نماز کے بعد سے عشا کی نماز کے دوران کا وقت اس اضافی کام کے لئے وقف کر دیتے اور اُنہیں وقت کی مہلت مانگ لیتے جتنے وقت میں وہ یہ اضافی کام اضافی وقت میں پورا کر سکتے۔ کبھی کسی صاحبِ قلم کو بدھو صاحب سے وعدہ خلافی کا گلہ یا کام میں کسی طرح کی شکایت نہ ہوتی۔ وقتِ مقررہ پر شخص مذکور کو آتا دیکھ کر بدھو صاحب اُن کا اصل اور کتابت شدہ مسودہ لے کر کھڑے ہو جاتے۔ اکثر اوقات تمام اُمور کھڑے کھڑے ہی انجام پا جاتے اور بدھو صاحب کسی قدر شرمندگی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ اپنے مہمان کی تواضع بھی نہ کر پائے۔ شہر کے اکثر ناشرین بدھو صاحب کو اپنے ادارے سے منسلک کرنے کے خواہش مند تھے۔ بدھو صاحب کا کہنا تھا کہ یہ لوگ معیار سے زیادہ مقدار پر اصرار کیا کرتے ہیں۔ آنے والوں سے زیادہ رقم وصول کر کے کاتب کو ادائگی کم کرتے ہیں جبکہ گاہک کے روبرو پوری رقم کی وصولی کا جھوٹ بلوانے پر مصر ہوتے ہیں۔

جب سے کمپیوٹر کا دور دورہ اور اُس کے ذریعے مصنفین کو مفت کی سہولتیں ملنا شروع ہوئی تھیں تب سے بدھو صاحب کے پاس پہلے سے وقت مقرر کرنے اور اضافی وقت میں کام کروانے کا رواج نہ رہا تھا۔ صرف پرانے قدردان ہی گاہے گاہے آیا کرتے تھے جس کے باعث گھریلو اخراجات کا پورا کرنا بدھو صاحب کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ کبھی کسی شخص نے اس کڑے وقت میں بدھو صاحب کو گلہ، شکوہ یا دستِ سوال دراز کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے خاندان کی بہتر کفالت کے لئے بدھو صاحب نے ملک سے باہر معاش کی تلاش کا ذریعہ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ اسی تلاش کے دوران بدھو صاحب نے قاضی صاحب کو کاغذات کا پلندہ بغل میں دبائے لمبی قطار میں کھڑے دیکھا تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا!

قاضی صاحب بدھو صاحب کی طرح سفید پوش تھے نہ غم روزگار میں مبتلا پریشان حال درمیانہ طبقے سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ رئیس ابنِ رئیس نہ رہے تھے پھر بھی اُن کا اور اُن کے خاندان کا شمار خوشحال گھرانوں میں ہوا کرتا تھا۔ نسلوں سے اُن کے گھرانے کا چلن علم کی ترسیل اور نگہبانی تھا جسے پروفیسری کی شکل میں ایمانداری، جفاکشی اور لگن سے نبھا کر قاضی صاحب نے روشن مثال قائم کی تھی۔ شہر بھر میں اُن کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ اسی سے اگلی مہرے پر اُن کے شاگردوں کی قطار در قطار لگی ہوئی تھی۔ محلے، پڑوس کے علاوہ دور دراز کے رشتہ دار اور تعلق دار اکثر اُن کے پاس سفارش کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا ہر آنے والے سے ایک ہی سوال ہوا کرتا! ”میاں اگر آپ کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی یا نا انصافی ہوئی ہے تو میں آپ کی ضرور کچھ نہ کچھ خدمت کروں گا بصورت دیگر کسی حقدار کی حق تلفی کی اُمید مجھ سے ہرگز نہ باندھیئے گا۔“ یہی وجہ ہے عرصے سے قاضی صاحب کے پاس حاجت مندوں کی آمد ختم ہو چکی تھی۔ جب بھی کوئی شخص کسی حاجت مند کو قاضی صاحب کا حوالہ دیتا تو وہ بڑی بے رخی کی جواب دیتا ”قاضی صاحب کے پاس جانے کا کیا فائدہ؟ وہ تو خود حالات کی تہہ تک پہنچ کر درست نادرست کا فیصلہ کرتے ہیں دوسرے یہ کہ

اپنے مطلب کو واضح الفاظ میں تاکید کرتے ہیں کہ کام درست اور جائز ہونے کی صورت میں حاصل رقبہ جو ان کی مدد کی جائے مگر نہ اس رقبہ کو غیر اہم جان کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔"

قاضی صاحب کو یہ مثالی عادات و خصلات وراثت میں ملی تھیں۔ وہ جعلی یا خود ساختہ قاضی نہیں تھے نہ قیام پاکستان کی شکل میں ذلت اور تجربے بڑھانے والوں سے انہیں کوئی نسبت تھی۔ ان کے والد اپنے والد کی وفات کے بعد شہر قاضی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔ کئی نسلوں سے ان کے خاندان میں پیڑھی در پیڑھی یہ عہدہ منتقل ہوتا آیا تھا اور آج بھی اس کا تسلسل جاری نہ رہنے کی کوئی وجہ اور جواز نہ تھا۔ قاضی صاحب کے والد نے اپنے بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اہم فقہی مسلکی اور دینی مسائل کے ساتھ انسانی فلاح کے بے شمار کارنامے انجام دیئے تھے۔ تعلیم کے حوالے سے قاضی صاحب کے خاندان کا سابقہ ریکارڈ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ دینی تعلیم کے کئی مراکز کے علاوہ لڑکوں کے لئے پرائمری اور ہائی سکول قاضی صاحب کے بزرگوں کی مساعی کا نتیجہ تھے۔ لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کے لئے ہائی سکول بعد میں کالج کی بنیاد قاضی صاحب کے والد کے زمانے میں ڈالی گئی تھی۔ قاضی صاحب کے والد لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کے پرجوش حامی تھے۔ وہ پڑھے لکھے باپ بھائی کے ساتھ پڑھی لکھی ماں، بہن پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ بہت سے یتیم، بے سہارا اور غریب بچوں کی پڑھائی کا ذمہ بھی قاضی صاحب کے خاندان کی روایت کا حصہ تھا۔ ان کے ہاں بلا امتیاز رنگ و نسل، مذہب اور فرقے کے لوگ قانونی، اخلاقی، مالی، مادی اور معاشرتی امداد و تعاون کے لئے آیا کرتے تھے۔ پولیس تھانہ، عدالت، کچہری حتیٰ کہ کلکٹر صاحب کے دفتر تک قاضی صاحب کے خاندان کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کے خاندان کی گواہی یا طرفداری حق و انصاف کی طرفداری گردانی جاتی تھی۔ عیدین، شب برات، محرم، ربیع الاول، وفات اور ماہ رمضان میں قاضی صاحب کے گھر کی رونق دیدنی ہوا کرتی تھی۔ منتیں، مرادیں پوری کرنے کے لئے، بچوں کو تقریب بنانے کے لئے قاضی صاحب کے ہاتھوں گنڈا بندھوایا جاتا۔ نومولود کے کان میں اذان دلوانے کے لئے قاضی صاحب سے درخواست کی جاتی۔ ڈھول تاشے اور گدکے والے قاضی صاحب کے پیروں کو چھو کر، کانوں کو ہاتھ لگاتے پھر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ نماز تراویح اور ختم قرآن پاک کا خصوصی اہتمام قاضی صاحب کی نگرانی میں ہوا کرتا۔ عیدگاہ و قبرستان کی تعمیر و مرمت اور دیکھ بھال قاضی صاحب کے خاندان کی نگرانی میں ہوا کرتی۔ محرم کے تعزیوں اور ماتمی جلوسوں کا اہتمام بھی قاضی صاحب کی ترتیب دی گئی کمیٹیوں کی نگرانی میں ہوا کرتا۔ ہندو مسلم فسادات کے دنوں میں بھی مرکز ثقل قاضی صاحب کا گھرانہ ہی ہوا کرتا۔ قاضی صاحب کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوا کرتا۔ کسی کو کبھی قاضی صاحب کے خاندان سے ناانصافی یا دروغ گوئی کا گلہ نہ ہوا۔ قاضی صاحب کے خاندان کے قول و قرار کے بھی قائل تھے کیا ہندو کیا مسلمان سب کو ان کے خاندان کی ایمانداری اور راست گوئی کا کامل یقین تھا۔

البتہ ایک فیصلہ قاضی صاحب کے والد گرامی کی ذات سے ایسا بھی منسوب ہے جسے غیر مسلم قاضی صاحب کی جانبداری سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ محرم کی نویں، دسویں تاریخ کو نکلنے والے تعزیوں کی تیاری کا سلسلہ پورے سال جاری رہا کرتا تھا۔ قصاب برادری اور چلّے داروں میں ہر سال مقابلہ زوروں پر رہا کرتا۔ ایک سال قصاب برادری نے تو ہوائی بارہ کی چوکی بنائی ہے دوسرے سال چلّے داروں نے ہوائی چودہ کی چوکی بنا ڈالی ہے۔ اس طرح چوکیوں کی بناوٹ میں استعمال ہونے والے کاغذ، پنّی، گوٹا، کناری، سلمیٰ، ستارے، بلب، قمقمے، جھومر، ہار، پھول اور پھندنے کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ چلّے داروں نے بجلی یا قصاب برادری کو نیچا دکھانے کے لئے چوکی میں روشنی کا اہتمام کیا تھا۔ علاقے کے لوگوں کے لئے یہ بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ تیل گاڑی کے اوپر رکھی ہوا دم چوکی کے قمقموں کو روشن کرنے کے لئے بہت لمبے بجلی کے تار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس سڑک یا گلی سے چوکی کا جلوس گزرتا اس کے کسی بڑے گھر کی بیٹھک میں موجود بجلی کے ساکٹ میں چوکی کے قمقموں کا سوئچ لگا کر دیا جاتا۔ جہاں تار کی لمبائی جواب دے جاتی فوراً چند مستعد نوجوان چوکی سے آگا آگے نکل جاتے جتنا چوکی کے قمقموں کو روشن کرنے والی تار رکھی ہوا کرتی۔ پھر کسی گھر کی بیٹھک میں موجود بجلی کے ساکٹ میں چوکی کو روشن کرنے والے تار میں لگے پلگ کو گھسیڑ دیا جاتا اور چوکی پھر سے روشن ہو جاتی۔ چوکی کی تیل گاڑی اپنا سفر پھر شروع کر دیتی۔ اس طرح ساری رات چوکی کا گشت جاری رہتا۔ راستے میں جہاں جہاں کوٹھوں اور چھجوں پر تعزیے دیکھنے والی خواتین کا ہجوم ہوا کرتا، فوری طور پر تیل گاڑی کو ترچھا کر کے چوکی کا رخ خواتین کی جانب کر دیا جاتا جسے دیکھ کر خواتین اور بچیاں خوشی سے تالیاں بجایا کرتیں۔ کچھ خواتین جذبات سے مغلوب ہو کر دو تین، منتیں ہوتیں اور آٹے پاجامے کے ازار بند میں بندھے پیسے نکال کر چوکی پر نچھاور کیا کرتیں۔

چلّے داروں کی برتری نے قصاب برادری کے بڑوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ بڑے غور و خوض کے بعد آمدہ سال کے لئے قصاب برادری کے بڑوں نے ایک کرنٹ پروگرام ترتیب دے ڈالا۔ چوکی کا سائز بڑا اور بناوٹ دیدہ زیب ہونے کے ساتھ بجلی کے نظام میں مزید بہتری اور جدت پیدا کی گئی تھی۔ بھاگ دوڑ کر کے گھر گھر سے بجلی کا کنکشن حاصل کرنے کے بجائے ایک تیل گاڑی پر چوکی جبکہ دوسری پر بجلی پیدا کرنے والا جنریٹر چوکی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس انقلابی تبدیلی سے قصاب برادری نے اپنی برتری منوالی تھی۔ ان کی یہ خوشی اس وقت کھٹائی میں پڑ گئی جب اللہ دوا کاتھ کے چھجے کے سامنے پہنچ کر قصاب برادری کی چوکی پھنس گئی۔ "آپ خود سوچ لو! چوکی ہر سال بنتی ہے مگر زندگی میں ایک بار بنتا ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا! آپ کی مرضی ہے چوکی کاٹ کر نکالو یا واپس لے جاؤ" اللہ دوا کاتھ کے کہنے سے

جواب نے قصاب برادری میں اشتعال پھیلا دیا تھا۔ نوجوانوں نے لاٹھیاں، سوٹیاں اور لوہے کے سکے تھیلی کر لالہ دوارکا ناتھ کو سبق سکھلانے کی ٹھان لی تھی۔ لالہ دوارکا ناتھ نے پولیس طلب کر کے حالات کی نزاکت کو اس کے سپرد کر دیا تھا۔ پولیس نے لالہ دوارکا ناتھ کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر کر قصاب برادری کو آگے بڑھنے یا قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سخت ایکشن لینے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ قصاب برادری کے بڑے بوڑھوں نے نوجوانوں کو اپنی زبان میں چند موٹی موٹی گالیاں دے کر خاموش رہنے کی تلقین کی اور وفد کی شکل میں فریاد لے کر قاضی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ پہلے قاضی صاحب قصاب برادری کے بڑوں کی زبانی واقعہ کی تفصیل تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے پھر ایک دو مرتبہ ٹیلیفون گھما کر اونچی آواز میں دوسری طرف والوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ جواب حسب منشا نہ پا کر قاضی صاحب کے چہرے پر فکرمندی نمودار ہونے لگی۔ قصاب برادری کے بڑوں نے نوجوانوں کے اشتعال اور شہر میں کشیدگی پھیلنے کا اندیشہ ظاہر کیا تو قاضی صاحب نے اندر سے اچکن منگوا کر پہنی اور قصاب برادری کے بڑوں کے ہمراہ ہو لئے۔ قریب چار گھنٹے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، کوتوال صاحب اور کلکٹر صاحب کے ساتھ بحث و تمحیص کے بعد قاضی صاحب لالہ دوارکا ناتھ کے گھر کا محاصرہ اٹھوانے کا حکم نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یوں رات دس بجے شروع ہونے والا ہندو مسلم تنازعہ قصاب برادری کے خیال میں مسلمانوں نے جیت لیا تھا۔ رات دو بجے لالہ دوارکا ناتھ کا جھٹکا کٹنے کے بعد چوکی کا سفر پھر شروع ہوا جو صبح سورج نکلنے تک جاری رہا۔

والد صاحب کی ناموجودگی میں، قاضی صاحب کو ہی اپنے والد کا چھوڑا ہوا منصب سنبھالنا تھا۔ بڑے قاضی صاحب کو اپنے لائق، ہونہار اور بردبار فرزند سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ صاحبزادے کی اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی نے اُمیدوں کے افق کو وسعت دے کر کرن کرن پھیلا دیا تھا۔ قاضی صاحب نے مادر وطن کی محبت میں سب کچھ تیاگ کر ہجرت کا مصمم ارادہ کر کے نہ صرف والد صاحب بلکہ رشتہ داروں، عزیزوں اور نیازمندوں کو ہیجان سے دوچار کر دیا تھا۔ والد صاحب نے قاضی صاحب کو روکنے اور اُن کے شاندار مستقبل سے آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ قاضی صاحب کا ایک ہی استدلال تھا: "نومولود وطن اسلام کے نام پر وجود میں آ رہا ہے، پڑھے لکھے مسلم نوجوان آگے بڑھ کر خدمت کا بیڑا نہیں اُٹھائیں گے تو یہ نیا وطن اپنے پیروں پر کیونکر کھڑا ہو گا؟ قوم کی آرزوؤں، اُمیدوں اور کھوئی ہوئی شناخت کو کس طرح تلاشا اور تراشا جا سکے گا؟"

والد صاحب نے قاضی صاحب کو رخصت کرتے وقت زادِ راہ کے طور پر معقول رقم پیش کی تو قاضی صاحب نے وہ رقم اپنی ذات کے بجائے اپنے وطن کے نام پر قبول کی کیونکہ وہ نئے وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اسی جذبے کے تحت وطن پہنچتے ہی والد صاحب کے نام پر ایک سکول کی بنیاد رکھی جو

قاضی صاحب کی انتھک محنت اور لگن سے جلد ہی کالج کا درجہ اختیار کر گیا۔ قاضی صاحب نے روزِ اوّل سے اعلان کر دیا تھا کہ یہ ایک عوامی ادارہ ہو گا جس کا انتظام چلانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس کا ہر سال انتخاب ہوا کرے گا۔ قاضی صاحب یا اُن کے اہل خانہ سے کوئی فرد کمیٹی کے چیئرمین کا انتخاب لڑنے کا اہل نہیں ہو گا کیونکہ اس طرح اس ادارے کا عوامی کے بجائے موروثی ادارہ بننے کا احتمال تھا۔ انتظامی کمیٹی کے ممبران اور چیئرمین کے بارہا اصرار کے باوجود قاضی صاحب تمام عمر ادارے کے پرنسپل تک نہ بنے۔ عام پروفیسر کی حیثیت اور انتظامی کمیٹی کے عام ممبر کے طور پر تمام عمر خدمات انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ کر خاموشی سے گھر جا بیٹھے۔ کمیٹی کی تمام پیشکشوں کو قاضی صاحب نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اس طرح ایک حقدار کا حق مارا جائے گا جو اُن کی خاندانی روایت کو کبھی منظور نہ ہو گا۔

ابتدائی دنوں میں بیگم کے زیورات کی فروخت سے جو گھر خرید اتھا اُس سے اپنی رہائش کے علاوہ کرایہ کی شکل میں معقول آمدنی ہو رہی تھی اور قاضی صاحب کے گھرانے کا گذر اوقات عمدگی سے چل رہا تھا۔ قاضی صاحب کو جس چیز کی طلب اور تڑپ تھی وہ قدرت نے بڑی فیاضی سے انہیں عطا کی تھی۔ اُن کے گھرانے کا شمار علاقے کے محترم اور معتبر گھرانوں میں ہوا کرتا تھا۔ عوام کی بہبود کے تمام فیصلے قاضی صاحب کی منظوری اور مشورے سے طے پاتے تھے۔ شہر کی بیشتر علمی اور رفاہی تنظیموں کی سرپرستی اور رہنمائی کا بار قاضی صاحب کے کاندھوں پر تھا۔ بیشتر سیاسی فیصلوں میں قاضی صاحب کا فیصلہ ویٹو پاور کی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی بار شہر کی نظامت، اعلیٰ ایوانوں کی ممبری اور بیرون ملک سفارت کاری کا عہدہ قاضی صاحب کو طشتری میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ قاضی صاحب نے ہر بار معذرت کرتے ہوئے کارکن کے طور پر خدمات انجام دینے میں فخر محسوس کیا۔ بیرون ملک کی بابت سوچنا بھی اُن کے نزدیک کفر کے مترادف تھا۔ قاضی صاحب وطن اور اس کی مٹی کو "محترم و پیارا" سے تعبیر کیا کرتے تھے اور آخری سانسوں تک اس کی خدمت کا عزم کئے ہوئے تھے جس پر انہیں اور اُن کے چاہنے والوں کو بڑا ناز تھا۔ کبھی کوئی لالچ، دھونس، دھاندلی اور دباؤ قاضی صاحب کو اپنی راہ سے نہ ہٹا سکا۔ اس طرح کے کسی بھی عمل کے بعد قاضی صاحب کے ارادے مضبوط اور امنگیں مزید جوان ہو جاتیں۔ قاضی صاحب اپنے گرد و پیش سے ہمیشہ باخبر رہا کرتے۔ اُن کے علم میں کوئی نیا دقیق یا اضافی کا واقعہ آتا تو از خود متاثرین کا در کھٹکا کر انصاف دلانے کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ اس کارِ خیر میں قاضی صاحب نے کبھی کسی مصلحت کو راستے کی دیوار بننے نہ دیا تھا۔ بڑے سے بڑے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق سچ کے لئے لڑنا قاضی صاحب کی شخصیت کا سب سے اہم وصف تھا۔

کچھ دنوں سے شہر میں بےاطمینانی اور بےچینی کی فضا عام ہو چکی تھی۔ خاموش سمندر نے اچانک بپھری ہوئی موجوں کا روپ دھار لیا تھا۔ روشنی

کی جگہ نوعمروں نے سنبھال لی تھی۔ بے شمار عمارتیں مسمار کر دیئے گئے تھے۔ دھیمے لہجے اور اکہری ڈھانچے کے لوگ بھی اونچی آواز میں گفتگو کرنے کے، مارنے مرنے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ تحمل، برداشت، رواداری اور ایک دوسرے کا احترام ناپید ہو گیا تھا۔ ہر طرف جلیعہ منافقت اور حقوق کے بلند و بانگ دعوے ہو رہے تھے۔ کسی کو یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ اس قدر مہذب و شائستہ لوگ کیوں عالم اشتعال میں ہیں؟ کیوں دلائل کی جگہ ہتھیاروں اور اوزاروں سے بات کی جا رہی ہے؟ تجربہ کار، پرانے، سیانے اور آزمودہ کار لوگ کیوں ناکارہ ٹھہرائے جا رہے ہیں؟ اس تمام افراتفری، بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا میں شہر کا انتظام نوجوانوں نے سنبھال لیا تھا۔ بظاہر حالات پرسکون کر دیئے گئے تھے مگر یہ سب کچھ زمین کے اوپر تھا۔ زمین کے نیچے آتش فشاں کھول رہا تھا۔ ایک ایسا آتش فشاں جس کی ہولناکی سے سبھی بے خبر تھے!

اوّل اوّل قاضی صاحب نے نامساعد حالات سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کیا۔ اپنے علم، عمل اور تجربہ کو کام میں لا کر نئی راہیں کھوجنے کی پوری کوشش کی۔ قاضی صاحب کی ہر کوشش کے جواب میں، بند گلی کی دستیابی نے قاضی صاحب کو بے بس مردہ بنا دیا تھا۔ ذہن میں اُٹھنے والے خیالات اور دل میں ابھرنے والے احساسات کی نسبت خود کو بے بس پا کر قاضی صاحب سخت اُلجھن میں گرفتار ہو گئے تھے۔ پہلا سا خلوص، جوش، جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ مایوسی تیزی سے احاطہ کر رہی تھی۔ مطالعے اور عبادات کا وقت پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ دیگر ہم عصروں کی طرح سمجھوتے نہ ہم رکاب ہوئے نہ مخالفت کا روگ پالا نہ مفاہمت سے دوچار ہوئے۔ خاموشی سے کنارا کش ہو کر چپ کی چادر اوڑھ لی۔ کسی سے کوئی غرض تو تھی یا اُمید باندھنے کے بجائے اپنے خدا سے لو لگائی۔ دوسروں کے لئے قاضی صاحب کا یہ عمل، شاید گستاخی یا بغاوت کے مترادف تھا۔ وہ قاضی صاحب جیسے متلاطم سمندر کی خاموشی کو نئے طوفان سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا عمل اوروں کے لئے مثال بنے کا اندیشہ بھی موجود تھا چنانچہ قاضی صاحب کی جانب سے مایوس ہو کر انہوں نے قاضی صاحب کو راہ راست پر لانے کی ٹھان لی!

چند یوم قاضی صاحب سکتے کے عالم میں رہے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن جیسے باعزت اور باوقار شخص کے ساتھ اس طرح کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر گال پر چٹکی لے کر یا ہاتھ پر ہاتھ مار کر زندہ ہونے اور جاگنے کا یقین کرتے۔ اکثر اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کاش! یہ سب کچھ خواب ہوتا۔ ایک بھیانک خواب جسے سنا کر وہ لوگوں کو نیکی کی جانب مائل کرتے۔ اپنے عمل کی بابت غور و فکر کرتے۔ جو نیک ارادے باندھ کر وہ بھول جاتے تھے انہیں جلد پایۂ تکمیل تک پہنچاتے! قاضی صاحب کے اس طرح خاموش، لاتعلق اور گم ہونے پر قاضی صاحب کے اہل خانہ کو سخت فکر تھی۔ بارہا اہلیہ نے تنہائی میں قاضی صاحب کے گھٹتے وزن اور خاموش رہنے پر فکرمندی کا اظہار کیا۔ کئی بار قاضی صاحب کا دل بھر آتا، زبان الفاظ ادا کرنے کے لئے جتن سے جو تم بیزار ہو جاتی۔ کئی بار، خود پر گزرنے والی قیامت بیان کرنے کے لئے دل بے چین ہو جاتا۔ ہر بار، قاضی صاحب بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھ پاتے۔ کس منہ سے، کس زبان، حوصلے، ہمت اور کون سے الفاظ میں خود پر گزرنے والی قیامت کا بیان کرتے! قاضی صاحب تمام مراحل سے 'آگ کا دریا'، تلوار کی دھار، روز محشر جان کر گزر بھی جائیں، اس کے بعد کیا ہوگا؟ اُن پر گزرنے والی قیامت کا ازالہ ہرگز ہرگز نہ ہوگا۔ گھر والے البتہ! بے بسی اور بے توقیری کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے! قاضی صاحب کا دماغ طرح طرح کے خیالات، منصوبوں اور حکمت عملی کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ کبھی دل چاہتا سب کچھ بھول جائیں، کبھی رات کی سیاہی میں گم ہونے، کبھی سمندر کی لہروں میں غرق ہونے، کبھی سمندر پار بھاگنے کی ترکیبیں سجھائی دیتیں! کبھی اُن کا بچپن، نوجوانی، جوانی اور اُن کی خاندانی امارت، انہیں پکار پکار کر اُن کی بے وقعتی کے طعنے دینے لگتیں۔

ایک راستہ! ایک راستہ ابھی بھی قاضی صاحب کے پاس موجود تھا جس سے اُن کی کھوئی ہوئی عزت تو واپس نہ آتی البتہ! مستقبل کے اندیشوں سے محفوظ ہوا جا سکتا تھا! کچھ تدارک، خود پر گزرنے والے سانحہ کا، ذہنی، اور سنجیدہ کی صورت میں کیا جا سکتا تھا! ہمارے معاشرے میں اُستاد کو جس قدر عزت و ولایت حاصل ہے اس کے پیش نظر اُمید کی ایک کرن، ابھی بھی قاضی صاحب کو حوصلہ بخش رہی تھی۔ قاضی صاحب اُمید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھے! کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے والی کیفیت نے اُن کا احاطہ کیا ہوا تھا! چند دن سوچ بچار، غور و فکر اور گومگو کی کیفیت میں گزرے۔ بالآخر تخریب کو تعمیر سے شکست ہوئی۔ قاضی صاحب نے ماضی پر نظر دوڑا کر، سعادت مندی اور احترام کو پکار کر دل کو تسلی دی۔ اطمینان کی کیفیت پا کر بیتاب، آخری راستے کو آزمانے کی ٹھان لی۔ اس فیصلے کے بعد قاضی صاحب کو دل، دماغ سے بوجھ ہٹا محسوس ہوا۔

قاضی صاحب کو جس احترام اور عقیدت سے خوش آمدید کہا گیا، بیٹھنے کے لئے جس گرمجوشی سے کرسی پیش کی گئی تواضع کے لئے جس اصرار سے دریافت کیا گیا اس کے بعد قاضی صاحب کے دل میں پلنے والے اندیشوں کے جراثیم، چپ چاپ اپنی موت مرنے لگے۔ گھر سے چلتے وقت، طاری گھبراہٹ، بے چینی اور بے چینی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ ایک بات ابھی بھی قاضی صاحب کو پریشان کئے ہوئے تھی۔ وہ متاثر، حالات و واقعات سے باخبر ہو کر بھی بے خبری کا احساس کیوں دلا رہا ہے؟ کیوں اتنی دیر سے اُن کی اور اہل خانہ کی خیریت دریافت کئے جا رہا ہے؟ اگر یہ اُن کی غرض مدعا کیا ہوتا تب شک کی گنجائش موجود تھی! کسی دوسرے شخص کے توسط سے معلوم ہوا ہوتا تب بھی کچھ سمجھ آتا! خود پر گزرنے والی قیامت، اپنی زبان، اپنے الفاظ، اپنے احساسات کے ساتھ قاضی صاحب نے ٹیلی فون پر خود گوش گزار کی تھی جس کے رد عمل میں قاضی صاحب کو

طلب کیا گیا تھا۔ چشمِ تصور میں قاضی صاحب اپنے ساتھ گزرنے والے سانحہ کا
"ری پلے" دیکھ رہے ہیں جس میں حتیٰ کہ تر قد وہ شخص کوئی اور ہے ہاتھ جوڑ کر
وہ شخص گڑگڑا ابھی رہا ہے اور زار و قطار روئے بھی جا رہا ہے بار بار اپنے عمل پر
ندامت کا اظہار کر کے معافی کا خواستگار ہو رہا ہے۔

قاضی صاحب کے خیالات کو اُس وقت شدید جھٹکا لگا جب شخص
مذکور عزت کے ساتھ اُن کے روبرو پڑی کرسی پر آ کر براجمان ہو گیا۔ اُس کے
چہرہ پر ابھی بھی اپنے عمل کی بابت کسی طرح کی شرمندگی یا ملال کے بجائے قاضی
صاحب کی نسبت ہتک آمیز رویہ تھا جس کا اظہار اُس نے کمرے میں موجود
تیسرے شخص کی تعظیم و قاضی صاحب کی جانب استہزائیہ نظروں سے کیا۔

"جی قاضی صاحب یہی شخص ہے وہ جس کے خلاف شکایت
لے کر آپ تشریف لائے ہیں۔" لفظ شکایت پر قاضی صاحب کے جسم پر رعشہ
طاری ہو گیا۔ اُن کے چہرہ کی رنگت سرخ اور دانتوں میں تکرار ہونے لگی۔ قبل
اس کے قاضی صاحب لفظ شکایت پر احتجاج اور خود پر گزرنے والی قیامت لفظ بہ
لفظ بیان کرتے قاضی صاحب کے کان پھر معروف ہو گئے۔ "قاضی صاحب!
بڑی حیرت کی بات ہے کم از کم مجھے آپ سے اس عمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ آپ تو
ہر وقت ہمیں اخلاقیات کا درس دیا کرتے تھے آپ اُس کی خلاف ورزی کے
مرتکب کیونکر ہوئے؟" قاضی صاحب کے لئے خود پر قابو رکھنا مشکل تر ہوا جا رہا
تھا"... میاں! میرا مطلب ہے... بھائی! میں مجرم کی حیثیت سے نہیں مظلوم
کی حیثیت سے داد رسی کے لئے آیا ہوں!"... "خدانہ کرے آپ غریب خانہ
پر مجرم کی حیثیت میں کبھی تشریف لائیں..." قاضی صاحب کے جسم کے
ارتعاش کو فراموش کرتے ہوئے "آپ ہمارے اُستاد ہیں آپ کا احترام ہم پر
لازم ہے آپ ہی سے ہم نے بڑوں کا احترام کرنا سیکھا ہے آپ نے خود اس کی
خلاف ورزی کی ہے جس کا مجھے افسوس ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو کچھ
آپ کے ساتھ ہوا میں اُس پر خوش ہوں مجھے اُس کا بھی افسوس
ہے... مگر..." قاضی صاحب نے مگر کے وقفے میں بولنے کی کوشش کی جسے
ہاتھ کے اشارے سے ناکام بنا دیا گیا۔ "بڑوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں قاضی
صاحب... دیکھئے...! جس طرح خطیب کا امام کا عمر رسیدہ و عالم کا عمر کی لحاظ
کے بغیر احترام لازم ہے اسی طرح لیڈر و رہنما کا عمر سے کوئی تعلق نہیں
ہوتا... وہ جس عمر کا بھی ہو لائقِ تعظیم ہوتا ہے آپ اپنے لیڈر..."
"لیڈر...؟" "جی ہاں...! لیڈر..." قاضی صاحب کو ایک بار پھر ہاتھ کے
اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے... "جس طرح بطور اُستاد
آپ کی ہم پر تعظیم لازم ہے اسی طرح بطور لیڈر ان کا آپ پر احترام لازم
ہے...! مگر وہ علیک سلیک کے بجائے آپ منہ پھیر لیتے ہیں... ان کے
طلب کرنے پر جاتے نہیں... ان کی تحریک پر متحرک نہیں ہوتے... چندہ
طلب کرنے پر سخت سست سناتے ہیں... پولنگ کے دن گھر میں بند ہو کر بیٹھ
جاتے ہیں... آپ ہی بتلائیے! یہ اشتعال میں نہ آئیں تو کیا کریں...؟ ان
کی جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے...؟" "... میں ہرگز..." "... مجھے علم
ہے آپ کا عمل کیا ہوتا...؟"... قاضی صاحب کی بات درمیان سے کاٹ کر
لہجہ بلند کرتے ہوئے"... قاضی صاحب قاضی... سمجھنے کی کوشش کیجئے...
زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا... آپ اپنے علاقے کے لیڈر کی عزت نہیں کریں
گے... ان سے تعاون نہیں کریں گے تو ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا سوائے
اس عمل کے جو انہوں نے آپ کے ساتھ روا رکھا... دیکھئے...! آدمی کے سر
پر ٹوپی سے لے کر پیروں میں پاجامہ بھی ہوتا ہے...! انہوں نے آپ کا بہت
لحاظ کیا ہے... انہیں علم تھا کہ آپ میرے استاد ہیں ورنہ یہ ٹوپی پاجاموں تک
محدود رہنے والے نہیں...!

بہت دنوں کی خاموشی اور گمنامی کے بعد قاضی صاحب نے اہلِ
محلہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے... بڑے بوڑھوں نے نظر کے چشموں اور
مصنوعی بتیسیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جنبش دیتے ہوئے خواتین نے منہ
میں دبے پان اور سروں سے ڈھلکے دوپٹے سنبھالتے ہوئے تو جوانوں نے بکھری
زلفوں اور پھولی سانسوں میں سمٹے سمٹے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں
دریافت کرنا شروع کر دیا ہے...؟

کیا ایسا ممکن ہے...؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے...؟ کیا ایسا ہو چکا
ہے...؟ قاضی صاحب نے واقعی کھلی فضا میں سانس لینا شروع کر دیا ہے...؟
قاضی صاحب کی لگائی ہوئی خیرہ واقعی چمن کا روپ دھار رہی ہے...؟ قاضی
صاحب نے سچ مچ ایک اور "نئی تحریک" آباد کر لیا ہے...؟ نئی نسل کی بڑی
تعداد قاضی صاحب کی ترغیب پر اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کی
جانب لوٹ رہی ہے...؟ کالی اور سانولی رنگت کے کچھ نوجوان بھی اپنے ہم
عصروں اور ہم جولیوں کے ہمراہ قاضی صاحب کے سحر میں گرفتار ہو رہے
ہیں...؟ اس بار بھی قاضی صاحب نے پرنسپل اور چیئرمین بننے سے انکار کر دیا
ہے...؟ کیا واقعی اُن کے ادارے کا پرنسپل اور چیئرمین ایک شریف النفس قناعت
پسند اور صاحب کردار آدمی ہے...؟ کیا واقعی وہ شخص ابھی بھی نمازِ فجر سے لے
کر نمازِ مغرب تک معروف کار رہتا ہے...؟ کیا ابھی بھی اُس شخص کے چہرہ پر
فاقے کے باوجود ملال یا شکوہ یا زود رنجی نظر نہیں آتی...؟

اہلِ محلہ عجب گومگو اور تحیر کی کیفیت میں مبتلا ہیں...؟ اُن کی سمجھ
میں نہیں آ رہا کہ وہ قاضی صاحب کی خوش قسمتی پر رشک کریں یا حسد...؟ اپنے
حال پر کڑھیں یا مستقبل کی بابت فکر مندی سے دوچار ہوں...؟ اپنے وطن کی
خوش قسمتی کو یاد کر کے فخر سے سینہ پھلائیں یا اُس کی بد قسمتی کا ماتم کریں...؟
دوسروں کی خوش قسمتی پر جلیں کا شاکی ہوں یا کاتبِ تقدیر کی فنکاری و ہنرکاری کی داد
دیں...؟ کچھ تدارک کی بابت سوچیں یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے
رہیں...؟؟؟

## ستیہ پال آنند

### موت کا چہرہ

موت سرہانے کھڑی ہے
استخوانی جسم پر اک کھوپڑی سی
وارڈ کی دھندلی فضا میں
ایک لمحے کو ابھرنا اور پھر تحلیل ہونا
ایسا ہیبت ناک چہرہ..... مجھ کو ایسے لگ رہا ہے
میرے ازلی ذہن میں جیسے یہ چہرہ
لاکھ برسوں سے کسی دیوار پر تصویر سا لٹکا ہوا ہے

اور وہ جس کے لیے یہ
استخوانی جسم پر اک کھوپڑی سی
وارڈ کی دھندلی فضا میں دندناتی آ گئی ہے
امن سے، سکھ شانتی سے ہلکے ہلکے سانس لیتی
نیم بےہوشی میں گم صم سو رہی ہے

چونک کر کرسی سے اٹھتا ہوں تو وہ آہستگی سے
اپنی آنکھیں کھولتی ہے..... میری جانب دیکھتی ہے
ایک ہلکی سی مسکراہٹ
اس کے ہونٹوں پر یونہی دو چار لمحے کھیلتی ہے
اس کے لب ہلتے ہیں، وہ کچھ کہہ رہی ہے
"وہ جسے آنا تھا، دیکھو آ گئی ہے
کتنی سندر
کتنی راحت بخش میری رازداں، پی سہیلی
مجھ کو لینے آ گئی ہے!"

اور میں جو لرزہ براندام بیٹھا ڈر رہا ہوں
اس کی جانب دیکھ کر پھر
موت کے چہرے کی جانب دیکھتا ہوں
استخوانی جسم پر اک کھوپڑی والا وہ چہرہ اب نہیں ہے
وارڈ کی دھندلی فضا میں
جھلملاتا، لحہ بھر تحلیل ہونا، پھر ابھرنا
موت کا چہرہ تو ماں جیسا ہے، جواب کہہ رہی ہے....
"..... کچھ ذرا سی دیر رک جاؤ
مری بچی، مجھے جلدی نہیں ہے!"
دہائی ہے علی مشکل کشا

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے تیرے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غالب

علی مشکل کشا، اس ستیہ پال آنند کو دیکھو
تمہارے در پہ جو ایسے کھڑا ہے جیسے اک بت ہو
مگر اس بت کی آنکھوں میں کئی ناگفتہ شکوے ہیں
یہ شکوہ بھی ہے جو اشکوں میں ڈھل کر تم سے کہتا ہے
کہ تم نے عرض سننے میں بہت تاخیر کر دی ہے
علی، تم نے تو اپنے در پہ آئے ہر سوالی کو
ہزاروں بار اپنی بخششوں سے یوں نوازا ہے
کہ ان کی مشکلیں آسانیاں بن کر ابھرتی ہیں
تو پھر یہ ستیہ پال آنند، جو اک ٹک نظر گاڑے
کسی بت سا تمہارے در پہ ٹھہرا ہے مہینوں سے
اگر شکوہ کرے تم سے تو کیا جائز نہیں ہو گا؟
تمہارے در کا بھکشا منگا دہائی دے رہا ہے کیوں؟
علی مشکل کشا، اس بے نوا شاعر کی بیوی کو
کرم کی بھیک سے اپنی نوازو، پھر سے صحت دو!

(8 نومبر 2005 مع ترجمہ)

## آندھیوں کی ہم سفر

(عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی کی خدمت خلق سے متاثر ہوکر)

شاہد واسطی

یوں تو بے شک زمین پر ہو تم
آندھیوں کی بھی ہمسفر ہو تم

زیردستوں کے دل کی تم آواز
پیچھے ہٹتے نہیں کبھی جانباز

کس سے الطاف چاہتی ہو تم
صرف انصاف چاہتی ہو تم

کون ان غمزدوں پہ مرتا ہے
زندگی کون وقف کرتا ہے

زیردستوں پہ اشکبار ہو تم
عزم و ہمت کا کہسار ہو تم

کوئی کچھ کہہ رہا ہو کہنے دو
حق تو یہ ہے کہ باوقار ہو تم

بے بدل ہم کہیں وہ رہبر ہو
حق پرستی کا ایک پیکر ہو

اپنے مقصد میں کامیاب ہو تم
سچ یہی ہے کہ لاجواب ہو تم

## ڈاکٹر حنیف ترین

### حساس رتیں مرجھائیں.....

راتیں بے خوابیوں سے رجھاتی رہیں
نیندیں' خوابوں کا بستر دکھاتی رہیں
گردشیں' پیچ پر پیچ کھاتی رہیں
میری خودداریاں روز ڈھاتی رہیں

### پیٹھ کا میل کہاں دکھتا ہے

آئینہ تمثیل بنا ہے
عکس مرا مجھ سے کہتا ہے
چاند پہ کتنا میل جما ہے

### ایک بہت مزے کی بات

رات کی اٹھانوں سے
جسم کے مچانوں سے
وقت کی چٹانوں سے
دن کا نور بہتا ہے

### عشق

پھیکے تھے رنگ سارے
کیا آسماں' ستارے
وجدان کے سہارے
کوندے سے دل کے چھلے
قوسِ قزح کے دھارے
آفاق کے کنارے

## مجھے کچھ بھی نہیں کہنا

قیصر نجفی

مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
میں آخر کہہ بھی کیا سکتا ہوں اس سے
کہ میں مخلوق ہوں اور وہ مرا خالق
مجھے اس نے بنایا ہے
مگر مجبورِ محض انساں
جسے اپنی ہی سانسوں پر نہیں ہے دسترس حاصل
جو یہ تک بھی سمجھ پایا نہیں ہے
کہ اس کی موت ہے یا زندگی منزل

مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
میں آخر کہہ بھی کیا سکتا ہوں اس سے
کہ وہ ہے کاتبِ تقدیر میرا
ازل کے روز ہی اس نے
مری تقدیر کی ہر ہونی انہونی رقم کر دی
مجھے پہنا کے جامہ زندگی کا
مری صد رنگ جھولی
دیدہ نادیدہ کتنے ہی حوادث سے مگر بھر دی

مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
میں آخر کہہ بھی کیا سکتا ہوں اس سے
کہ وہ مختارِ کل ہے
بغیر حکم اس کے ایک بھی
برگِ شجر تک ہل نہیں سکتا
نہ ہو اس کی رضا شامل تو یہ انسان
اپنے آپ سے بھی مل نہیں سکتا

مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
میں آخر کہہ بھی کیا سکتا ہوں اس سے
کہ وہ تو مالکِ ہر دو جہاں ہے
اسی کے حکم سے ساری
زمینی آسمانی آفتیں ہوتی ہیں نازل
ہر اک تغیرِ ہستی سے
جھلکتی ہے اسی کی قدرتِ کامل

مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
میں آخر کہہ بھی کیا سکتا ہوں اس سے
کہ وہ ہے بے نیازِ اوّل
کہ وہ ہے بے نیازِ آخر

## آباد کرنے کو اُٹھو

(8 اکتوبر 2005ء کے قیامت خیز زلزلے کے بعد وقت کی آواز)

صدیق فنکار

زلزلہ زدگان کی امداد کرنے کو اُٹھو
گھر ہوئے برباد جو آباد کرنے کو اُٹھو

زخمیوں کے واسطے مرہم ہی لاؤ ساتھیو
جو اچانک گر پڑے اُن کو اُٹھاؤ ساتھیو

ہر دُکھی کے دل کو اب تم شاد کرنے کو اُٹھو
گھر ہوئے برباد جو آباد کرنے کو اُٹھو

زلزلے نے کر دیئے ہم سے اچانک جو جدا
سارے مل کر مغفرت کی اُب کرو رب سے دعا

اُن شہیدوں کو ذرا تم یاد کرنے کو اُٹھو
گھر ہوئے برباد جو آباد کرنے کو اُٹھو

اپنی کوتاہی پہ نادم ہو کے اب فنکارؔ تو
اُس کی رحمت کو طلب کر مانگ اُس سے پیار تو

گڑگڑا کر رب سے اب فریاد کرنے کو اُٹھو
گھر ہوئے برباد جو آباد کرنے کو اُٹھو

زلزلہ زدگان کی امداد کرنے کو اُٹھو
گھر ہوئے برباد جو آباد کرنے کو اُٹھو

## مختصر نظمیں

(۸ اکتوبر کے تباہ کن و ہلاکت خیز زلزلے کے تناظر میں)

شگفتہ نازلی

وہ جو آنکھیں اُداس رہتی ہیں
جیسے ہو انتظار اپنوں کا
اُن کو آسودگی دلانا ہے!

-

وہ کہ جن کے اُجڑ گئے گھر بار
اُن کی ویرانیاں سمیٹنی ہیں
بستیاں دُور تک بسانی ہیں!

-

وہ جو تعلیم کے اُجالے سے
دُور ہوتے گئے تھے پَل بھر میں
شمعیں اُن کے لئے جلانا ہیں!

-

وہ کہ جو پُرملال رہتے ہیں
بیکسی، بے بسی کے عالم میں
اُن کے وہ غم ہی تو بھلانے ہیں!

-

وہ جو معصوم سہمے سہمے سے
بھولے بھالے سے، اُن کے چہروں پہ
ہم نے مُسکان کو سجانا ہے!

-

وہ کہ جن کے بچھڑ گئے اپنے
اُن سے اپنائیت سے ملنا ہے
جیسے اپنوں سے کوئی ملتا ہو!

## اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

رفتگان کے نام

ماجد سرحدی

تیرے گھر گئیں میرے گھر گئیں
وہ قیامتیں جو گذر گئیں
وہ محبتیں جو بکھر گئیں

تم ان ہی کے حق میں دعا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

وہ جو عبرِ گل کے سفیر تھے
وہ جو اپنے گھر کے امیر تھے
رہِ حق کے جتنے فقیر تھے

اُنہیں یاد کرتے رہا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

وہ کئی درخت چنار کے
کئی سلسلے رہِ پار کے
ہیں گواہ جو میرے پیار کے

میرا پیار اُن سے کہا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

وہ ہر اک کلائی کو موڑ کر
وہ تمام رشتوں کو توڑ کر
وہ چلے گئے ہیں چھوڑ کر

نہ کسی سے کوئی گلا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

جو گئے ہیں سوئے رہِ عدم
جو بکھر گئے ہیں قدم قدم
ہیں اُنہیں اگر تو تمہارا غم

یہی بات سب سے کہا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

جو بچے ہیں ان کا ہے یہ بیاں
کوئی راستہ ہے نہ سائباں
یہاں اب نہیں کوئی کہکشاں

اب اسی زمیں پہ چلا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

ہیں تمہارے عزم ابھی جواں
رہے زندگی بھی رواں دواں
یہی بات کہنی ہے جانِ جاں

تم ہر اِک سے پیار کیا کرو
اُنہیں یاد کر کے جیا کرو

## اندھیرا دیکھا

**غالب عرفان**

دیکھنے والوں نے کہتے ہیں، سویرا دیکھا
ہم نے تو صبح سویرے ہی اندھیرا دیکھا

جب زمیں ہل گئی، گھر گر پڑے چیخیں اُبھریں
مرگِ انبوہ نے شیطان کا پھیرا دیکھا

دستِ قدرت میں ہے ہر جسم کھلونے جیسا
ایک ہی جھٹکے نے اعضا کو بکھیرا دیکھا

شہر کے شہر زمیں بوس ہوئے تھے لیکن
دبے ملبے میں بھی سانسوں کا بسیرا دیکھا

آسماں کے تلے پہنچے جو پناہوں کے لئے!
اُن کی آنکھوں نے بھی موسم کو گھنیرا دیکھا

ہاتھ پھیلائے ہوئے بے سروپا لاشوں کو
زندگی کے لئے ترسا ہوا ڈیرہ دیکھا

کون کس کے لئے کیا مانگے کہ بینائی نے
موت کو زیست کے ہر موڑ پہ گھیرا دیکھا

**علی آذر**

اس نے بڑی ہمدردی سے مجھ سے کیا سوال
کیوں بھی علی آذر بھلا کیا بات ہے کہ تم
اوّل تو محفلوں میں نظر آتے نہیں ہو
اور شاذ آ بھی جاؤ نظر بزم میں کسی
کونے میں یتیم اکیلے کھڑے رہتے ہو سدا
دیوار میں آویزاں ہو جیسے کوئی تصویر

اب کیا جواب دیتا بھلا اُس کی بات کا
کس کو پسند ہوتا ہے دیوار سے لگنا
دیوار سے لگا دیا جاتا ہے میرے دوست
اور اس کا اک طریقہ نہیں سو طریقے ہیں
اے کاش کوئی، تم کو نہ دیوار سے لگائے
لیکن تمہیں دیوار سے لگنا نہیں ہوگا.......

دیوار سے لگاتے ہیں اُس کو اے میرے دوست
جو ہاں میں ہاں ملاتا نہیں
ڈرتا بھی نہیں
جھوٹی انا کے راستے میں خطرہ ہوتا ہے
وہ اس سے خوف کھاتے ہیں
کہ سچ کا کوئی وار
اُن کے بتوں سے ٹکرا کے کر دے نہ پاش پاش
خود ساختہ بتوں کا جنازہ نکل نہ جائے

# LOVE

## پی۔پی۔سریواستو ارِند

آوارہ خیالات نے پھر گھیرا ہے
بہلاؤں اگر دل کو تو دم گھٹتا ہے
پھر آج سلگتا ہے ہوس کا جنگل
اے رِند گناہوں سے عجب رشتہ ہے

اس دھوپ نے غیروں کو بنایا اپنا
سینے سے لگا آ کے پرایا اپنا
کام آ ہی گئی سادہ مزاجی اے رِند
اور سازشیں کرتا رہا سایا اپنا

تنہائی کا اک غول لئے پھرتا ہوں
زیور کئی انمول لئے پھرتا ہوں
سورج ہیں کئی رِند تعاقب میں مگر
میں رات کا کشکول لئے پھرتا ہوں

سایا سا اندھیرے میں جو اک رینگتا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی اپنا ہے
تکتا ہے خلا کو جو مسلسل اے رِند
وہ شخص تو برسوں سے نہیں سویا ہے

ٹوٹے ہوئے خوابوں کی دھمک دل میں ہے
مدہوش زمانے کی بہک دل میں ہے
چہرے کی لکیروں پہ لکھا ہے اے رِند
بیتے ہوئے لمحوں کی کسک دل میں ہے

میلا سا لگا چھت پہ ہے جانا مشکل
کھو جاؤں اگر خود کو ہے پانا مشکل
اے رِند فضا میں ہے عجب سا کہرام
چہرے کے خدوخال چھپانا مشکل

## پروفیسر زُبَیر کنجاہی

زندہ باد
زندہ باد
اے مرے جری صدام
سچ تو یہ ہے
وہی کیا تُو نے
جس کی اُمید جس کا اِمکان تھا
بڑی طاقت تھی فیل کی لیکن
اِک چیونٹی نے اُس کو مار دیا
صرف طاقت بڑی
خُدا کی ہے
اُس سے ڈرتا ہو جو
کوئی بھی ہو
موت کیا زیست پر بھی مرتا نہیں
کسی دُشمن سے بھی وہ ڈرتا نہیں
اُس نے جھیلی ہوں سُنوں بارود
عزم اُس کا دفاع لامحدود
ترے اچھے عمل پہ نازاں ہوں
تُو کہ اِک کوہِ استقامت ہے
مجھے تجھ سے بڑی محبت ہے

دوڑ دھوپ کے بعد بھی
بدلا نہیں سروپ
دلّی تیرے نصیب میں
دُھول دُھواں اور دُھوپ!

☆

بجھے بجھے چہرے لگے
کوئی نظر آتا نہیں
یہاں بشر شاداب
گاؤں چلو! اس شہر میں
سب کا حال خراب!

## بنیادی نکتہ

مشتاق شبنم

کہیں تثلیث کا بت ہے
کہیں تخصیص کا بت ہے
کہیں تائید اور تردید کا بت ہے
یہ دنیا بٹ گئی ہے
مختلف مخصوص خانوں میں
خیال و خواب کے رنگیں بیانوں میں
مگر ان خال و خط کے پیش و پس
بنیادی نکتہ
جانے کس وحشت اثر ساعت میں گم ہے
بازیابی جس کی
امکانات کی حد میں ابھی ہے
اگر ہم چاہتے ہوں تو.......!

## بیچ بُجھی (دوہے)

بھگوان داس اعجاز

دلّی ڈالا جھونپڑا
پہلی بارش رو پڑا
چھت ڈالی ترپال
گہنے لتے بیچ کر
اک رکشا لی ڈال!

☆

بچے بیوی بھی تھکے
پانی آتا دو بجے
جاگو آدھی رات
اور بجلی کیا پتہ
روٹھے کرے نہ بات

☆

ہم جب تک تھے گاؤں میں
تھے چیتی کے پاؤں میں
سولہ چھ کے ساتھ
دلّی آ کر پڑھ گئے
سولہ دونی آٹھ!

☆

بسی بہت پھولی پھلی
اب تک اس کے پیٹ میں
گئے چار سو گاؤں
اور پسارے گی ابھی
دلّی اپنے پاؤں!
وہلا ڈولا زوں پلی
لڑکی دلّی کی چلی
پیرس لندن روم
جائے وہ اُس گاؤں میں
ماما ہری اوم

☆

پگڑی بنتاؤں کی

## دُکھ درد کا یہ لمحہ

سجاد مرزا

وہ لوگ جو پیارے تھے
جو چاند ستارے تھے
الفت کے اشارے تھے!
اس دل کے سہارے تھے

ان سب کی جدائی میں
ہم چاک گریباں ہیں
آنکھوں میں اداسی ہے
سینے میں دھواں سا ہے
ہونٹوں پہ دعائیں ہیں
خاموش فضائیں ہیں

اے چارہ گرِ دوراں!
ان سب کی جدائی میں
ہم لوگ پریشاں ہیں

کچھ اس کا مداوا ہو
دکھ درد بھی کچھ کم ہو
اس دل کو سنبھلنے کو
اک حرفِ تشفی دے
بہتے ہوئے اشکوں کو
ہم روک نہیں پاتے

اے چارہ گر دوراں!
اب اشک یہ تھم جائیں
تیری جو نوازش ہو
دل اپنا سنبھل جائے
دکھ درد کا یہ لمحہ
اچھا ہے کہ ٹل جائے

## یہ روزہ تا قیامت ہے

ندیم ساحل

تشنج چاشت کے پہلو میں اترا
زمیں کی گود مدفن ہو گئی ہے
کفن کا لمس خاکی
ہر اک منظر بھی سنہ کو بیاں صدمات کی ہیں
جزا کے بعد خالی ہچکیاں برسات کی ہیں
شکم کی سیج پہ روزِ قیامت تک زباں نے
افطار کا گھونگھٹ اُٹھایا ہی نہیں ہے
بدن کی ڈیوڑھی دالان میں خیمے لگے ہیں
نئی تعمیر کی بنیاد میں سیسہ نہیں ہے
ہاتھ میں میرے
میرے اعضاء کی ہستی ہے
اجل معراج کرنا چاہتی ہے
مانسہرہ اور بالاکوٹ سے کشمیر سرحد تک
براقِ موت پہ دستِ اجل کی اب سواری ہے
تمدن کے تخیل پر
اجل تہذیب ہے تہذیب کا انکار بھاری ہے
زمیں کی ماتمی کروٹ مکمل ہو گئی ہے
لحد ملبے کی لایعنی میں شاید کھو گئی ہے
کھنڈر ہوں اس لئے تعمیر کا روزہ
مجھے افطار سے پہلے کھلایا جا رہا ہے
میرا ملبہ صحیفوں میں اٹھایا جا رہا ہے

## رباعیات

ڈاکٹر سوامی شیاما نند سرسوتی روشن

بہتر ہے سمجھ چیز ہے کیا بادِ صبا
دیتی ہے حقیقت کا پتہ موجِ وفا
عاقل ہے تو قدرت کے اشاروں کو سمجھ
ہر موجِ بقا دیتی ہے پیغامِ فنا

و ظلم کی آندھی میں بھی آباد رہا
ی اسے کرتی رہی ہے سجدے
,,و سچ کی کسوٹی پہ اترا پہلے کھرا
و سچ کی کسوٹی پہ اترا پہلے کھر
مید کی ہر بیل کو رکھ دل میں ہر
دیکھ حقیقت پہ فنا ہو کے ذرا

کیا کیا نہ زمانے میں پڑا غم سہنا
دشوار تھا ایسے میں تو زندہ رہنا
دیتا ہے گنہگار کو بھی تو روزی
یارب ترے اکرام کا بھی کیا کہنا

میں تیرا ہی آئینہ ہوں اے میرے خدا
پردے سے نکل سامنے آ سامنے آ
موسیٰ نہ سمجھ مجھ کو تو میں روشن ہوں
آ مجھ کو دکھا جلوہ دکھا جلوہ دکھا

## دوہے

کاوش پرتا پگڈھی

دھوپ نگر میں آ گئے، برف نگر کے لوگ
بچہ بچہ کھل اٹھا، خوب ہوا سنجوگ

جم کر بارش ہو گئی، آنگن ہو گیا صاف
بچے اپنے گاؤں کا، کرنے چلے طواف

صرف ہمارا ہی نہیں، ہر گھر زیرِ آب
پیاسا تھا ہر آدمی، اب گھر گھر تالاب

دل میرا کڑھتا رہا، لب پر تھی مسکان
جیون بھر گونگا رہا، رکھتے ہوئے زبان

آیا تھا بھیتر کہیں، زوروں کا طوفان
دل کے ریگستان میں، کہاں گیا مہمان

شہرت کی چڑیا اڑی، اڑ کر گئی بدیس
کھیل کھیل کر آ گئی، پھر وہ اپنے دیس

تنہا کاوش ہی نہیں، اہلِ نظر سب دنگ
اندھے بتلانے لگے، کون یہاں خوش رنگ

## ”آبِ دیدۂ زلزلہ زدگاں پہ رونا چھوڑ دو“

دِل نواز دِل

زمیں پھٹ گئی آسماں شق ہُوا
قیامت تھا اس بار تو زلزلہ
مکاں کے مکاں اس طرح سے گرے
کہ جیسے کھڑے تھے یہ بے آسرا
گرے وادیوں میں یوں آ کر پہاڑ
کہ آیا جو نیچے وہ پھر مٹ اُٹھا
گئے خوں کے رشتے تعلق سبھی
کسی سے رہا نہ کوئی واسطہ
نہ سڑکیں رہیں اور نہ راہیں رہیں
جو کوئی جہاں تھا وہیں رہ گیا
جو اِک کوہ لرزا تو اُسے لغزشو
لرزتا گیا کوہ کا سلسلہ
پلازے کئی آ رہے فرش پہ
زمیں سے تعلق ہُوا عرش کا
سکولوں کے چھت گر گئے ایک دم
جو بچہ جہاں تھا وہیں دب گیا
کئی بچیاں چیختی رہ گئیں
مدد کے لئے کیا دبا شور تھا!
پہاڑوں کو دیکھا جو چلتے ہوئے
تو دم ہر نفس کا جہاں تھا، رکا
زمیں میں دراڑیں پڑیں دُور تک
تھا منہ آسماں کا کھلے کا کھلا
ہزاروں کروڑوں کے گھر گر گئے
رہا نام جو تو خدا کا رہا
ہر اِک پہ گریں بجلیاں بادلو
بلا کا موسم تھا موسم یہ برسات کا
توانا بدن پل میں معذور تھے
اگر ٹانگ ٹوٹی، تو بازو کٹا
تھیں کرب و بلا کی وہ چیخیں سبھی
تھی چاروں طرف ایک آہ و بکا
جگر سوز ہے زندگی کُحت ہے
کہ سازِ دِل و جاں ہے ٹوٹا ہوا

اِس آفت نے اِک کر دیا قوم کو
اسی میں ہے شاید بھلا مُلک کا
سیاست ہے اب بھی بُری کی بُری
کرے گی یہ کیسے کسی کا بھلا!
وہ پیسہ لگا اینٹ پتھر پہ جو
فقط ایک جھٹکے میں ملبہ بنا
دہلتے جو دیکھا پہاڑوں کا دِل
تو سینہ زمیں کا بھی اُس دم پھٹا
جو منزل بہ منزل گریں بلڈنگیں
تو جسم سے رہا خود پہ آ مرگہ
معطر فضائیں تھیں خوشبو سے جو
تعفن ہے اب اُن میں خالی بھرا
تباہی سُونامی کی سب ہیچ ہے
کہ اس سے بڑا ہے یہ اِک سانحہ
مدد کی ہے اپنوں و غیروں نے دیکھ
نہ ان سے شکایت نہ اُن سے گلہ
ہیں معیار دُنیا کے اَب دوغلے
نہ شکوہ کریں تو کریں اور کیا!
کیا قوم نے غیر ممکن تھا جو
نبھایا ہے جو فرض تھا فوج کا
کیا فردِ ملّت نے وہ اجتماع
جو پہلے نہ اس سے کبھی ہو سکا
تر و تازہ پُرجوش، باہوش ہے
ہر اک دل میں ہے اک نیا ولولہ
ہو بچہ، جواں یا کہ بوڑھا کوئی
ہے اُمید کا ایک جلتا دیا
مَنائی ہے سب نے جو یہ عید آج
بڑا تھا دُکھی اس میں پَن عید کا
نہ رنگین تھی اور نہ سادہ تھی عید
کہ خوشیوں میں غم کا مزا اَور تھا
وہ لیڈر جو باہر ہیں بیٹھے ہوئے
کھڑے پاؤں دَردان کے دِل میں اُٹھا
بسائیں گے وہ بستیاں اب کئی
وطن کو جو لُوٹا کئے سالہا
مُخاطب ہیں جو قوم سے فون پہ
بِل اِس کا اَدا قوم نے ہی کیا
اگر چاک دامن ہے گُل باغ میں
تو کیا چاک یہ باغباں نے سیا

کسی کے بھروسے پہ تم مت جیو
کہ ایسے جیا جو وہ مر کے جیا
گھٹائیں و خیمۂ تحائیں نہیں
ہمیں چاہیے تو فقط حوصلہ
ہوا یک دلی کے مرے مُلک میں
ہے سب کچھ مری جاں خُدا کا دیا
سیاست نے پیدا کیا ہے نفاق
کیا غرق بیڑا اسی نے کیا
جو اَب بھی نہ سمجھے یہ لیڈر تو پھر
دُعا ہے کہ ان سب سے سمجھے خُدا
کسی کا بھلا اس میں کیا دوش ہے
ہمارے گناہوں کی ہے یہ سزا
لبوں پہ ہے لانا ہنسی پھر ہمیں
یہ رونا و دھونا بہت ہو چکا
جو کلیاں ہیں بند اور سہمی ہوئیں
ہٹا کچل کے ڈر اُن کا بادِ صبا
پریشان دلؔ دیدے حیران ہیں
اُنہیں آئنہ دل میں صورت دکھا
سرِ شاخ پھر نُور آنے کو ہے
بدلتی رُتوں کا تو سُن لے کہا
جو روتے ہیں وہ نُور کھوتے ہیں دیکھ
یہ کہتا ہے ہر اَشک بہتا ہوا
نہ بھر آہ خالی نہ فریاد کر
فغاں کر نہ اے کوہِ صبر و رَضا
نہ کر یاد تُو اُس بُرے وقت کو
بھلا دے اُسے جو ہُوا سو ہُوا
یہ ندیاںٔ یہ نالے یہ دریا سبھی
تمہارے قصۓ ہیں اور رہیں گے سَدا
بسائیں گے ہم بستیاں پھر نئی
یہ سب بے ٹھکانوں سے وعدہ رہا
پہاڑوں پہ ہونگیں وہی رونقیں
پھر اِن وادیوں پر وہ نُور آئے گا
ابھی وقت ہے اے مُسلماں سنبھل
مصیبت میں ورنہ رہے گا سَدا
محمدؐ کے صدقے مرے مُلک کو
خُدا کا دیا رزق بے حد ملا
اُنہیں پھر ملائے گا رَبِّ کریم
ہوئے ہیں جو اپنوں سے جُدا

ہمارے گناہوں کو کر دے معاف
مرے ربّ اے اللہؐ سب کے خُدا
خُدا کا کرم ہو سَدا ملک پہ
نظر دے رہی ہے یہ دلؔ سے دُعا

ایک دوسرے کے لیے محبت میں تڑپنے اور جنسی لذت پہ منتشر الزام کے قریب دوبارہ
ملنے کا کوئی تصور انجیل قدیم و جدید میں نہیں ہے۔"

چنانچہ خواتین کے اپنے تجزیاتی و ثقافتی معاشرتی معاشی اور لاشعوری
زاویہ نگاہ ہوتے ہیں اور اس کے مختلف انداز اظہار کو ادب میں خود فیمنسٹ ادیبوں نے
نسائی تنقید یا ادب کے نام سے پکارا ہے اس کو Discourse بھی کہا گیا ہے۔

مردوں کا کہنا تھا عورتوں میں موضوع پہ بحث کرنے تجزیہ کرنے اور
بحث کو آگے بڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے میں ذاتی طور پہ سمجھتی ہوں کہ یہ الزام
غلط ہے مگر جب Dale Spender نے Man Made Language
میں بحث کی تو حالات مختلف تھے وہ لکھتی ہے "مغربی اور یورپی زبانیں جس طرح ارتقا
تک پہنچیں اور جس طرح کی وہ ہیں ان کی تحریر، ترویج اور ارتقا میں خواتین کو حصہ نہیں
لینے دیا گیا نہ صرف یہ بلکہ نسائی انداز کو جارحانہ طریقے میں مسترد کر دیا گیا۔

بعد از ساختیاتی تحریک کے دو نقادوں Facaults اور ایڈورڈ سعید
کے خیالات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "صداقت اور سچ کیا
ہے" اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ "اس کا انحصار اس بات پہ ہے کہ کون و طاقت پہ
حاوی ہے" اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے عورتوں کی پیٹیکل بیچ معلوم ہوتی ہے کہ
پدرانہ نظام کی تیرہ و شبیں کی وجہ سے عورتیں مجبور ہیں، انھیں صداقت کے اظہار اور
اظہار کے سچ کا موقع نہیں دیا گیا اس لئے انہیں نے صرف مرد کے نقطہ نظر کا سچ ہی
دکھانا اور بتانا اور اپنی قوت گویائی کے شعور کی شناخت نہ کر سکیں اس لئے وہ زبان
دانی ان کا انجام ہوا۔

روبن لیکاف اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہیں کہ "عام طور پہ عورتوں
کے اظہار کی زبان بہت محدود ہے ان کی گفتگو کے موضوعات بہت محدود ہوتے ہیں۔
ان کے نظریات میں غیر یقینی ہوتی ہے جو چیز یہ پسند کرتی ہیں وہ معمولی، عام، بے
وقعت اور غیر سنجیدہ ہوتی ہیں۔ چونکہ مرد ہمیشہ سے تحریر و تقریر پہ قابض رہے ہیں ان
کے اظہار کی زبان میں وسعت ہے، زور ہے اور قدرت ہے۔ معاشرتی مساوات
حاصل کرنے کے لئے عورتوں کو الگ گروہ بنانے کے بجائے مردوں کا فن زبان
دانی اور طریقہ اظہار کو اپنانا چاہئے۔"

فا کالٹ کا مشورہ معقولیت پہ مبنی ہے اور آج جس قدر فنون کی تعلیم نے دنیا
بھر میں عورتوں کی بہتر علمی کارکردگی اور کامیابیوں نے عورت کی کمتری کو برتری میں
بدل دیا ہے مگر فا کالٹ کے زمانے کی جذباتی اور انقلابی نظریات کی حامل خواتین نے
فا کالٹ کے اس مشورہ کو مسترد کر دیا ہے کہ عورت کی محدود اظہار کی صلاحیت کوئی عیب
نہیں ہے اور بعض فیمنسٹوں نے اسے خوبی بنا کر بھی پیش کیا ہے۔ حالانکہ یہ حماقت زدہ
خیال ہے اور یہی وجہ ہے کہ Lacan اور Christeva جیسی تعلیم یافتہ خواتین
نے معاملہ کو سنجیدگی اور گہرائی سے دیکھا ہے اور عورت کی حرکات اور رویوں کی لاشعوری
تجزیہ کی ہے اور اس نتیجہ پہ پہنچی ہیں کہ "صحیح معانی کے آزادانہ استعمال کے عمل کی
بتدریج حوصلہ افزائی کرتی ہے اور پابندیاں کم ہو گئی ہے وہ یہ نسائی ہے۔

عورت کی انقلابی حیثیت:

اس تناظر میں یہ ثابت کیا گیا ہے مردوں نے عورتوں کی جو تعریفیں کی
ہیں عورت ان میں سے کسی پہ بھی پوری نہیں اترتی۔ اس لئے عورتوں کو اس کی پرواہ نہیں
کرنی چاہیے کہ مرد انہیں کیا سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے بارے میں مردوں کا ہر خیال اور ہر
نظریہ غلط ہے۔

ورجینیا وولف پہلی خاتون نقاد ہیں جس نے خواتین کی تحریروں کا تجزیہ کیا
اور پھر معاشی ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں پہ غور و خوض کیا۔

مارکسی فیمنسٹوں نے بھی ان حقائق کی نشاندہی کی ہے کہ بدلتی ہوئی
معاشرتی صورت حال اور معاشی نظام یقیناً مردوں اور عورتوں کے درمیان طاقت کے
توازن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں گے اور بدل دیں گے۔ آج اکیسویں صدی میں لڑکیوں کی
لڑکوں سے بہتر تعلیمی کارکردگی نے ارباب حل و عقد کو ہلا کر رکھا ہے۔ مارکسی فیمنسٹ
نقادوں کی بات میں وزن نظر آتا ہے انہوں نے اس بات کو بھی مسترد کر دیا ہے کہ عالمی
نسائیت جیسی کوئی چیز کا وجود ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد والی دہائی میں کیٹ ملیٹ اور شیلی برنٹ نے جنسی
سیاست پہ بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سیاسی طاقت کا توازن نہ ہونے کے باعث
طبقہ نسواں کے خلاف حق تلفیاں کی جاتی ہیں۔ اور ان حق تلفیوں اور بے انصافیوں کی
جڑیں بہت گہری ہیں۔ ملیٹ لکھتی ہیں کہ بیٹیوں کو بچپن سے ہی ہر بے انصافی پہ
مفاہمت کرنے کی عادت ڈال دی جاتی ہے۔ وہ بے انصافیاں جو پدرانہ نظام کی دین
ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف پہ انگلستان میں بھی لڑکیوں کے ساتھ مساوانہ سلوک
نہیں کیا جاتا تھا اور ایشیا، پاکستان میں آج اکیسویں صدی میں بھی ان کے ساتھ مساوی
سلوک نہیں کیا جاتا۔ ٹیلیگراف کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ہندوستان میں تیس
سے چالیس ہزار لڑکیوں کے حمل الٹرا ساؤنڈ کے بعد ضائع کروا دیے جاتے ہیں۔
دیہاتوں میں سوکھے تمباکو کا دانہ لڑکیوں کی ناک میں ڈال کر ان کو ٹھکانے لگا دیا جاتا
ہے پاکستان کے بارے میں بین الاقوامی حقوق انسانی کے کارکنوں نے رپورٹ دی
ہے کہ "عزت و وقار کے نام پہ ہزاروں لڑکیوں کو ذبح کر دیا جاتا ہے یا جلا دیا جاتا
ہے بد قسمتی سے اس گناہ کو بھی اسلام کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اس نے ایک اور نکتہ بھی واضح کیا کہ جنس اور صیغے میں فرق ہے جنس
انسان یعنی مرد و عورت دونوں جسمانی ساخت کو اور نسل انسانی کی پیدائش میں ان
دونوں کے اجسام کی کارکردگی کو واضح کرتی ہے وہاں صیغہ تذکیر و تانیث زبان اور
شخصیت کے نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرتی ہے یہ ثقافتی طور پہ حاصل کی ہوئی جنسی شناخت
کا حوالہ ہے اور اس بات کا بھی کسی مخصوص ثقافت میں طبقہ اناث کے لئے رویہ کیا رہا
ہے۔ حالانکہ فارسی میں زبان صیغے اور ناموں میں عورت کی پہچان یا صیغہ مونث کا وجود ہی
نہیں ہے۔

مارگریٹ میڈ جو Anthrougpologist ہے لکھتی ہے کہ عموماً
مغربی مرد، مردوں اور عورتوں کے کرداروں کا تعین معیار یا فلسفہ اپنے معیار سے

کرتے ہیں جبکہ بعض معاشرے ایسے بھی موجود ہیں جن کے مرد تھکے، کاہل، ڈرپوک
اور جارح نہ ہوں اور عورتیں محنت کش، بہادر اور جنگجو ہوں ان معاشروں میں بھی عام مرد
عورتوں کو پیٹنے کی جرأت نہیں کرتے ہوں گے۔ ملٹ نے بڑے سخت اور تلخ لہجے میں
معاشرتی سائنسدانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے "صدیوں کے طوطے کی طرح رٹے
رٹائے اصولوں سے عورت کی حیثیت متعین کرنا اور انہیں کمزور و نااہل بتانا کوئی
معروضی نکتہ نظر نہیں ہے۔"

اس کی مزید تفصیل وہ اس طرح بیان کرتی ہے کہ طاقت کے ہر منبع اور
حکومت کے ہر چشمے پر قابض ہونے کا اہل صرف مردوں کو دکھایا جاتا ہے پھر صحافت اور
ذرائع ابلاغ کے ذریعے پر بھی مرد قابض ہیں اور ڈرامہ وغیرہ میں عورت کو لذت
حاصل کرنے کا ذریعہ اور شے کے طور پر بھی دکھایا جاتا ہے جو مثبت رویہ نہیں ہے کیونکہ
اس رویہ کی جنسی سیاست کا مظہر ہے۔

مارگریٹ اور کیٹ ملٹ کی تائید میں ایک مثال دینا چاہوں گی عورتوں
کے لباس، فیشن اور سنگھار کے سامان کی ساری صنعت مردانہ ہاتھوں میں ہے جس طرح
طرح کے بازاری اور عریاں لباس فیشن میں لائے جاتے ہیں اور خواتین بغیر کسی جبر و
تشدد کے مردوں کی لذت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ انہیں جنسی
لذت کی شے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے مردوں کی خواہش پر رنگوں ہیں کیونکہ ان کے
پاس اس احساس و شعور کو سمجھنے کا کوئی اخلاقی نظام نہیں ہے اور یہ لاشعوری طور پر تمام
تر آزادی کے دعوے کے باوجود مرد کی نفسیاتی خواہش کی غلام ہیں۔ اگر خواتین
جانوروں کی طرح مقابلہ حسن میں شریک نہ ہوں تو کون ان کا جسم کریدنا چاہے آئے
گا۔ ایک مثال اور ہے پال روم ڈانسنگ اور برف پر رقص کا مقابلہ ہو یا میدان کے
ٹینس کے میدان میں مقابلہ ہو، مردوں کا لباس جسم ڈھکا ہوتا ہے جبکہ خواتین کھیلنے
والیوں کو صرف دو گز جسمی چڈی ہی پہننی پڑتی ہے۔ کچھ حلقوں کی طرف سے خواتین
کے لئے سفید پتلون پہننے کی اجازت کا مطالبہ کیا گیا تھا تو میدان ٹینس کے کرتا دھرتا
لوگوں نے یہ کہہ کر مطالبہ مسترد کر دیا کہ "اکثریت کو اس لباس پر اعتراض نہیں"۔

"چڈی اور فراک میں عورتوں کی ٹانگیں اور جسم زیادہ اچھا لگتا ہے" تاہم
اس قسم کے استحصال کو ذہن میں رکھ کر گرین گریئر اور مصری ولی نے خواتین کے شعور
اور احساس جگانے پر زور دیا کہ انہیں احساس ہو کہ جو چیز بظاہر معمولی نظر آتی ہے جیسے
عریاں لباس کو رواج کرنا وہ درپردہ طور پر ایک گہری استحصالی سازش کا ذریعہ ہے۔
مردوں کی استعماریت اور استحصال کو فرانسیسی نقاد جیس لی بوئر نے عورتوں کو بے
نصیب لوگوں یعنی تیسری مغلوک الحال، مزدوروں، کالے حبشی اور اچھوت لوگوں کے زمرے
میں شمار کیا ہے یہ سب محروم گروہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر لی بوئر نے یہ بھی سوال اٹھایا
کہ آخر ایسا کیوں ہو گئی ہے۔

(۱) کالوں کی طرح عورتیں غلام بن کر نہیں آتی ہیں یعنی درآمد نہیں کی
گئی ہیں۔

(۲) پرولتاریوں کی طرح عورتیں تاریخی حالات سے وجود میں نہیں
آتی ہیں۔

لیکن کالوں اور مزدوروں کو کچلنے کے لئے جہاں قانون کے سہارے طاقت سے کچلا
جاتا ہے وہیں عورت کو آئیڈیالوجی کی مار اور مذہب کی آڑ سے کچلا جاتا رہا ہے اسی
لئے کالوں کو نسل پرست اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں نے کچلا۔ مزدوروں کو سرمایہ داروں
اور کسانوں کو جاگیرداروں کے تشدد نے مارا اور خواتین کو پدرانہ نظام کی آئیڈیالوجی
کے استحصال نے زیر تسلط رکھا۔ مردوں نے عورتوں کی کمزوریوں کو معاشرتی اور نفسیاتی
توجیہ کو ان کی تخلیقی کمزوریوں کا ثبوت بنا کر اچھالا اور اس ضمن میں سائنسی تحقیقات پر
بھی بھروسہ نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے کمتر ہونے کی دلیل میں اس قسم کی مضحکہ خیز دلیلیں
بھی دی گئیں کہ مرد تو مہینے میں ہزاروں بچوں کا باپ بن سکتا ہے اور عورت نو ماہ میں
صرف ایک بچہ پیدا کرتی ہے۔ اس میں تحریر و تقریر کی صلاحیت نہیں ہے وہ بیت الخلا
میں زیادہ دیر لگاتی ہے اس لئے کمتر ہے یا اس کو ماہواری ہوتی ہے اس لئے وہ انسان
نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ ملٹ اور گلبرٹ کے علاوہ اس دور کی دوسری اہل قلم خواتین
نے ردعمل کے طور پر خود بھی اسی طرح کے غیر منطقی دلائل دینے شروع کر دیئے جتلایا کہ
مردوں کا لکھا ہوا تمام تخلیقی ادب ردی ہے، رد کرنے کے لائق ہے۔ بعض خواتین نے بعض
مردوں کی لکھی کہانیوں کو عورتوں کے نقطہ نظر سے الگ کر کے ثابت کیا کہ کس طرح تحریریں
دھیرے دھیرے زہر کی طرح تعصب کو بڑھاتی ہیں۔ انہوں نے مردوں کے خلاف
محاذ قائم کر لیا۔

نسوانی تحریک سے وابستہ خواتین نے ادب اور تنقید کے بارے میں نئے
معیار مقرر کرنے کی کوشش جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے ایک تحریک سے وابستہ نقادوں
نے خصوصیت سے دو نکات کا ذکر کیا۔

(۱) ادبی فن پارہ

(۲) ادبی فن پارہ کی قدر و معیار مقرر کرنے کے اصول۔

فن پارہ کے بارے میں انہوں نے کہا کہ مردوں کے لکھے ہوئے
ناول، پرانا ادب یا ایسے لکھے گئے ہیں جیسے صرف مردوں کے لئے لکھے ہیں۔
ہیروئن میں وہ خوبیاں اور خصوصیات پیدا کی جاتی ہیں جو مردوں کی پسندیدہ ہیں۔
ہیرو کو ہیروئن میں وہی خصوصیات پسند کرتی پائی جاتی ہے اس طرح جو مردانہ پسند اور
مردانہ استعماریت کا پرچار کرتے ہیں۔ کیٹ ملٹ نے اس ضمن میں ڈی ایچ لارنس،
نارمن میلر، ہنری ملر اور جین جینے کو خاص طور پر مورد الزام ٹھہرایا۔ جبکہ بعض دوسری
ناقدین نے جیفری چاسر کی مثال دے کر کہا کہ تمام اول نقادوں نے نیا استعماری رویہ
روا نہیں رکھا جیفری چاسر کو نہیں سامنے رکھنا چاہئے جس نے استعماری رویہ نہیں اپنایا
ہے۔

اصل میں ملٹ اور شولاٹ فائرسٹون کی خواہش یہی تھی کہ مردانہ استحصال
کا تاریخی حالات اور معاشرتی شکست و ریخت کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے جنسی محاذ
قائم کر کے اسے طبقاتی محاذ کا نعم البدل بنایا جائے اور اس سے ایک تحریک شروع ہو۔
لیکن خیال پائیدار ثابت نہ ہوا۔ خود ان کی تحریک سے متعلق ادیبہ شیلی روشنے جوابا

بارے میں لکھا ہے۔ رابرٹ براؤننگ کی بیوی ایک اچھی شاعرہ تھی۔ رابرٹ پہلے اس
کی شاعری پر مرمٹا پھر اس پہ...... اتنی مصیبتوں کے بعد شادی ہوئی مگر رابرٹ
براؤننگ پر کیا گزری وقتوں کسی کو خبر نہ ہوئی۔ خواتین کے پریس نے حال میں ایک
کتاب چھاپی ہے Aurora Leigh اور Kopna Copland نے
اسے ترتیب دیا ہے۔ اس نے تعارف میں لکھا ہے۔ رابرٹ براؤننگ کی نسائیت رومانی
اور یوٹوپیائی تھی کیونکہ مسز براؤننگ یہ خواب دیکھتی رہی تھی کہ نسوانی حالات اور ان پہ
جبر محبت، مسابقت اور تقدیر سے بدل جائیں گے مگر ایسا نہ کبھی ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے
ہمارے ہاں ممتاز شیریں اردو ادب کا درخشندہ آفتاب تھیں۔ خصوصاً تنقیدی ادب میں
ان کا آج بھی ثانی نہیں۔ رابرٹ براؤننگ کی طرح انہوں نے بھی سمجھا تھا کہ شوہر سے
محبت کی بہتات سے سارے ملال دور ہو جائیں گے اور محبت کی شادی مسرت کا جام
پیتے گزرے گی۔ میری نگیا کے فسانے اس کا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کا
نام بلند رکھنے کے لئے انہیں ایک بہت ہی معیاری رسالہ نکالنے پر لگا دیا اگرچہ اس کام کو
سنبھالنے کی ان میں صلاحیت بھی تھی مگر مقصد یہ تھا کہ ان کی انا کا جھنڈا اونچا رہے
انہوں نے تھک کر اپنا قلم توڑ دیا کیونکہ وہ صحرا میں جنگل کا پودا لگا رہی تھیں وہ ناکام ہو
گئیں۔ اس لئے گھٹ گھٹ کر مر گئیں جو لوگ کہتے ہیں دیکھئے کیا نامور تھیں ممتاز شیریں غلط ہے۔

رابرٹ براؤننگ اپنی شہرت پہ ندامت کا اظہار کرتی ہے کہ اس ادب
کے میدان میں شادی، بچوں کی پرورش اور گھر کی ضائع ہو جانے کی کمزوری کی وجہ سے
پیچھے رہ جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ ذکر کو دوری اور گونگی دیتی ہے وہ اپنی گلی کو
گھستی ہے

"میں شاعری کی کتاب ختم کرنے میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں مگر رابرٹ
کہتا ہے کہ جب ہم کتاب کی اشاعت کے لئے لندن جائیں گے تو چاہے کچھ بھی ہو
میری کتاب اشاعت کے لئے تیار ہوگی مگر میری کتاب شائع ہوگی موسم بہار تک بھی ختم
ہو جائے تو بڑی بات ہے..... شاید اس میں بہتری ہے کہ ہم دونوں کی کتابیں ایک
ساتھ شائع نہ ہوں..... یہ دوسری بات ہے کہ میری کتاب تیار ہوتی تو شاید میں ایسے
صبر نہ کر پاتی۔"

۱۹۸۳ء میں فلورنس ہائٹ ڈنگل خود نوشت قسم کے ایک مضمون میں
ان خیالات کا اظہار ہے کہ نسائی خود آگہی چھوٹی میں ڈھکی کھلنے ڈال جاتی ہے مگر
خود آگہی کا شعوری ذکر ایک دن چراغ بن کر راستہ دکھائے گا اس نے سکون سے تخلیق
کرتی ہوئی کم علم اور نچلے اور متوسط طبقے کو مخاطب کر کے اقبال کے الفاظ میں یہ کہا ہے
خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے وہ کہتی ہے میدان میں آؤ آگہی کے ذکر کا سامنا
کرو اور باشعور بہنوں کے ساتھ شامل ہو کر جدوجہد کو آگے بڑھاتی آگے کہتی ہے
"ہمیں ہمارے ذکر کو نا ہم دل سے اللہ تعالیٰ کے سامنے روئیں گے اور آگہی
اور تلخی اور بے حسی سے کہیں بہتر ہے درد اور توبہ کے احساس سے علاج کا راستہ
ڈھونڈا جا سکتا ہے جو مفلوج ہونے سے بہتر ہے سینکڑوں کوششیں تلخیاں قربانیں
دوسرے اور مرنے کے بعد کوئی ایک انسان نئی دنیا کے ساحل تک پہنچا ہے

فلورنس ہائٹ ڈنگل 1983

ہائٹ ڈنگل نے اپنی تخلیقی کو اپنی زندگی میں سچ ثابت کر دیا اور
اسے اپنی کوشش اور صلاحیت سے میڈیکل پیشے میں اونچا مقام حاصل کرنے کا موقع مل
گیا مگر وہ مجموعی طور پہ پورے معاشرے سے مخاطب ہے جس کا استعارہ اس دور کی
فسانوی ہیروئن تھی جو زندگی سے شکست خوردہ ناکامی کی دوسرے میں گھٹ گھٹ کر مر
گئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عورتوں کے اس دکھ کو مردوں اور عورتوں دونوں نے
فراخدلی سے استعمال کیا۔ حقیقت کے احساس اور کہانیوں میں عورتوں کے اس درد و غم پہ
ریکا ویسٹ تبصرہ کرتی ہے 'اب بھی زیادہ تر کہانیوں میں ناول ہو یا افسانہ درد و غم ہی
اصل کہانی ہوتا ہے۔ ناولوں میں خودکشی اور خود آزاری کا رجحان عام ہے۔ بہت سے
لوگ ان کہانیوں کو نسوانی بھی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ
لکھنے والوں نے غم کو ہی مقصد بنا لیا ہے مگر میں سمجھتی ہوں (جو مشورہ ہے) کہ خواتین
کے ادب کو اب پاگل پن اور موت کی منزل سے آگے بڑھنا چاہئے..... مگر آج کے
مرکزی نسائی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسوانی اور ایک خوش آئند
تبدیلی کا پیش خیمہ تھا۔ آج بعض خواتین و شاعرات اس دور کا رخ کا اظہار یوں
کرتی ہیں۔ لیڈربن دہا، عصر حاضر کی ایک نامور شاعرہ کہتی ہے:

میری تنہائی کا باعث شاید یہ ہے
صبح کے کرتے کے اندھیرے میں
صبح کی ٹھنڈی سانسیں جو دو شہر میں چھوڑ رہی ہے
اپنے اندر سمجھ رہی ہوں
میں وہ تنہا فرد ہوں گھر میں..... جو بیدار ہے
جب کہ سارا گھر اب تک..... نیند کی گہری چادر میں لپٹا سوتا ہے

رچ نے اپنی کتاب 'عورت سے پیدا' میں نسائی ادب کے پہلے اور
دوسرے دور کے اس رویے پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ ماں سے نفرت اس دور کا خاصا رہا
ہے جس کا مطلب ہے خود سے نفرت جو ایک حقیقی جذبہ ہے اس نے ماں کی موت کو
گہرے نفسیاتی سانچے سے تعبیر کیا ہے

نسائیت کا دوسرا دور..... ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک

نسائیت کے اس دور میں خواتین کے رویے میں شدت اور احتجاج میں تیزی
آتی گئی۔ فرنچ، آبرا ہو اور Sherne ان میں پیش پیش رہیں۔ suffer
sisterhood get نے فروغ پایا۔ اور Amazonion رویے کے تحت
مردوں سے علیحدگی کا رجحان شروع ہوا۔

شدت جذبات میں اس دور میں بہت سی غیر منطقی باتیں بھی ہونے لگیں
جس سے نسائیت کی ذہانت کم اور حماقت زیادہ ثابت ہوئی۔ اس قسم کی تحریروں نے بھی
اہمیت حاصل کی جیسے ہورن ٹر نے Lewis کو ایک خط میں لکھا تھا کاش آپ مجھے
عورت نہ سمجھتے تو بہتر ہوتا کاش سب یقین کر لیتے کہ گرنر ایک مرد ہے جس طرح
آپ اور دیگر فنکار اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرتے ہاہ ایک فنکار کی حیثیت سے

جب میں کمزوری ہوتی ہوں تو میں اس وقت میں نہ اپنی شخصیت کے بارے میں سوچتی ہوں نہ اس چیز کی مجھے پرواہ ہوتی ہے کہ آپ کمزوری نسائیت میں کون سی شے گنی گئی ہے" کہنے والی شارلیٹ "تنقید اور شعور" میں صفحہ ۳۴ سے ۳۵ میں بھی یہ ہوتے نے شدید احتجاج کیا ہے کہ ادبی نقاد عورتوں کے فن پر ایسے مربیانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہیں جیسے خواتین کا تعلق ادبی تاریخ ادب سے نہیں ہے۔ ورجینیا وولف کو کوئی منطقی وجہ بھی نظر نہیں آتی نقاد بتاتے ہیں اطلاعیہ روش عام ہے یہ وہ لکھتے ہیں اچھی خاتون ناول نگار ہیں۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ اچھی ناول نگار ہیں "خواتین" کی تخصیص لگانا ضروری ہے۔

اس پر مجھے بھی اپنے اسلامی مورخین کی ایک بات بار بار کھلتی ہے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اس روئے زمین پر پہلی مسلمان ہیں اور حضرت سمیہؓ اسلام کے لئے سر دینے والی پہلی شخصیت ہیں مگر مورخ لکھتے ہیں حضرت خدیجہ الکبریٰ پہلی خاتون مسلمان ہیں اور حضرت سمیہ پہلی خاتون شہید ہیں۔

بہر حال نسائیت کے دوسرے دور میں جو عورتوں کو انتخاب میں رائے دہی کا حق ملا اس کے بعد چند دوسرے حقوق حاصل ہو جانے سے عورتیں اس قابل ہو گئیں کہ اپنی نسائیت کے سوال پہ کسی قسم کے سمجھوتے کو مسترد کر دیں۔

ورجینیا وولف اور فرانسس ٹرولوپ نے اپنے ناولوں میں معاشرتی شکست و ریخت و طبقاتی آویزش کو نمایاں کیا و طبقاتی نا انصافیوں کو واضح کیا جدید طرز کی فکر یوں کی ذہن کی بھی بلکہ ان ناولوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ طبقاتی نا انصافی صرف عورتوں کا مسئلہ تھا۔

اسی زمانے میں یہ سوال بار بار اٹھایا گیا کہ دنیا بھر میں معصیت زدہ خواتین کی کیسے مدد کی جا سکتی ہے جبکہ ایزن کی خیالی دنیا بسانے کے خیال کا تصور پیش کیا۔ اس طرح سے کہ نا ممکن کو بدل کر زنانہ اور مردانہ خانوں میں تقسیم کیا جائے اسی قسم کے متعلق نظریات کی وجہ سے فیمنسٹ تحریک خاصی بدنام بھی ہوئی۔ بدنام زمانہ خیالات کی پیش رو تحریکیں ہیں۔ شدت پسندی اور احتجاج کے اس دور میں انہوں نے جارج ایلیٹ کے اس نظریہ کو بنیاد بنایا کہ خواتین کی مردوں کے تسلط سے آزاد ایک دنیا بسائی جائے جس میں صرف خواتین ہوں۔ لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کی شدت پسند خواتین نے اپنی افسانوی دنیا میں اس موضوع کو نظر انداز کی کر خود عملی طور پہ بھی ایسا نہیں کیا۔

نسائی تحریک کا تیسرا دور ..... ۱۹۶۰ء سے آگے

۱۹۶۰ء کے بعد کے دور میں بیسویں صدی کا بقیہ حصہ بھی شامل ہے اس دور میں کچھ عرصہ تک شدت پسندی اور متوازن معقولیت دونوں نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ رفتہ رفتہ خواتین نے تعقل اور احتجاج دونوں کو مسترد کر دیا۔ کیونکہ دونوں یہ دو طرفہ رجحان کی حد تک ہی ہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے نسوانی نفسیات اور زندگی سے متعلق مختلف تجربات کی طرف توجہ دی کیونکہ نسائی فن کا اصلی سر چشمہ بھی یہی ہیں۔ انہوں نے اپنے مباحث کا دائرہ وسیع تر کیا۔ جس میں ثقافت جیسی لطیف اور ادب کی دوسری اصناف شامل ہیں۔

اس دور کی مشہور لکھنے والیاں۔ ربیکا ویسٹ، کیتھرین مینسفیلڈ، ڈوروتھی رچرڈسن اور ورجینیا وولف ہیں۔ ورجینیا وولف نے فن کا نظریہ پیش کیا جب کہ جوائس اور پروسٹ کے انداز میں ڈوروتھی رچرڈسن نے Pilgrimage لکھا جس میں نسائی لاشعور کی کارگزاریوں سے بحث کی ہے۔ مضمون کے دوسرے حصے میں نسائی فنی اور تنقیدی نظریات پر بحث کرتے ہوئے اولین نظریاتی تعارف کیا ہے۔ ورجینیا وولف نے زندگی اور نسائی حقوق پہ سنجیدگی سے غور کیا اور سنجیدگی سے لکھا۔

بعد میں آنے والی یونیورسٹی کی فارغ التحصیل خواتین نے نہ تو نسائی بے اطمینانی کا رونا رویا نہ کسی قسم کی جھجک محسوس کی۔ ان میں نمایاں مندرجہ ذیل خواتین ہیں۔

(۱) As Byatt (۲) Jean Rhyse (۳) Margrate Drable (۳) Chrestene Breakenose

Brigid Brophy نے بے تکلفی سے ہم جنس پرستی اور شادی مردوں سے تعلقات کے بارے میں بھی لکھا۔ اس کے بعد ستر کی دہائی تک جن خواتین کا قلم شعلہ بار رہا ان میں Penelope Mortimar، Moniel Spark اور Doris Lesing کا نام قابل ذکر ہے۔

(۱) چونکہ صدیوں سے عورتوں کو نسائی روح اور اس کی عظمت سے عاری سمجھ کر ان کی تذلیل کی جاتی رہی اس لئے ہر قسم کی حق تلفیوں کے خلاف جو تحریک چلی وہ فیمنسٹ یا فیمنزم کی تحریک تھی۔

(۲) لا امتیازی برتری نے تفصیل سے نسائیت کے خلاف کی جانے والی حق تلفیوں پہ بحث کی۔

(۳) خواتین کے اپنے تجرباتی، وقتاتی، معاشرتی، معاشی اور لاشعور حقائق کو لکھنے اور اظہار کرنے کو فیمنسٹ ادیبوں نے "نسائی نظریہ ادب" کا نام دیا ہے۔

(۴) کا کاٹ اور ڈیوڈ واسیع کہتے ہیں کہ صداقت اور اس کا اظہار کوئی مجرد شے نہیں ہے بلکہ جو واقعات پہ حاوی ہو اسی کا سچ، سچ مانا جاتا ہے عورتیں صدیوں تحریر و تقریر سے بے بہرہ رہیں اس لئے زبان پہ گزشتہ صدی میں حاوی نہیں تھیں۔ اکیسویں صدی میں ایسا نہیں ہوگا۔

(۵) ورجینیا وولف کا مشورہ تھا کہ عورتوں کو اپنی تحریر و تقریری زبان میں وسعت دینی چاہئے۔

(۶) مارکسی فیمنسٹوں نے معاشی نا انصافیوں کو خواتین کی پسماندگی کا ذمہ دار قرار دیا۔

(۷) ڈراموں، کہانیوں، صحافت اور عام اشتہاروں میں مردانہ معاشرہ عورت کو لذت کی شے بنا کر پیش کرتا ہے۔

فیمنسٹ تحریک کا دوسرا ادبی دور = انقلاب۔ احتجاج۔ شعلہ بیانی

فیمنسٹ تحریک کا تیسرا ادبی دور = ۱۹۸۰ء سے بیسویں صدی کے خاتمے تک۔

# گوپی چند نارنگ.... اور.... املا نامہ

علیم صبا نویدی

''املا نامہ'' (سفارشات املا کمیٹی' ترقی اردو بورڈ) کے مرتب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ جو اردو کے ایک مستند و معتبر ادیب ہی نہیں بلکہ ماہر و عالمِ صوتیات بھی ہیں۔ املا کمیٹی کی سفارشات جو ترقی اردو بورڈ کے تحت پیش ہوئی ہیں ان پر تفصیلاً بحث کی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً ان سفارشات میں ردّ و بدل' اتفاق و اختلاف ہوتے رہے ہیں ان کو اس طرح مقدمہ میں پیش کر دیا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ کیا جا چکا ہے وہ ایک تاریخی دست آویز کی طرح صفحات کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں عرصہ دراز پیشتر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب' مولوی عبدالحق صاحب' ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے جو سفارشیں پیش کی ہیں ان کی پوری تفصیل ہمیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں ڈاکٹر عابد حسین' پروفیسر مسعود حسین خان' حیات اللہ انصاری' مالک رام' پروفیسر گیان چند جین' پروفیسر خواجہ احمد فاروقی' پروفیسر محمد حسن' ڈاکٹر خلیق انجم' سید بدر الحسن' شمس الرحمٰن فاروقی' رشید حسن خان' ڈاکٹر نثار احمد فاروقی' خود پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بحیثیت اراکین کمیٹی' اراکین نظر ثانی کمیٹی' اراکین ورکشاپ اردو املا کمیٹی جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔

اردو کو ہند آریائی زبان اور اردو رسم الخط کو عربی و فارسی سے ماخوذ رسم الخط بتاتے ہوئے اس زبان کی جو ساخت اور پرداخت ہوئی ہے اس کا اجمالاً ذکر کرتے ہوئے پیش لفظ طبع اول میں ڈاکٹر عبدالعلیم (مرحوم) سابق چیرمین ترقی اردو بورڈ نے سفارشات املا کمیٹی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پیش لفظ طبع دوم میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو نے بھی اردو تہجی اور صوتیات کی وسعت کی کم اکتفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے املا نامہ کے نئے ایڈیشن کی ضرورت اور اہمیت کو مسلّم قرار دیا ہے۔ مقدمۂ طبع اول و مقدمۂ طبع دوم دونوں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے تحریر کئے ہیں۔ یہ دونوں مقدمات معلومات سے پُر ہیں۔ جن کو پڑھنے سے واقعی احساس ہوتا ہے کہ اردو املا کی طرف کیوں اتنی زیادہ توجہ لازمی تھی۔ اور املا کمیٹی کی تشکیل کی ناگزیریت سمجھ میں آتی ہے۔

اردو دنیا میں اب تک لوگ محض اپنے زمانہ میں رائج طریقۂ تحریر سے کام چلا رہے تھے اور بہت سی باریکیوں کو نظر انداز کرتے آرہے تھے۔ الف' الف مقصورہ' ممدودہ' تنوین' ت' ۃ۔ اور ت' ط' ذ' ز' ژ' ث' س' ص' نون اور نون غنہ' واؤ' ہائے خفی' تصریفی الفاظ' یورپی الفاظ' ہائے مخلوط' ہمزہ۔ اعداد۔ لفظوں میں فاصلہ اور لفظوں کو ملا کر لکھنا' سابقے' لاحقے۔ اعراب و علامات (vowels)' مصوتے' مصوتی اعراب' سنسکرت الفاظ کے جڑواں مصوتے (Diphthongs) مخففات جیسے عناوین کے ذریعہ ان تمام کے سلسلہ میں جو قدیم طریقہ تھا اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے اور کہیں ان سے متعلق پیش کردہ سفارشات کے ردوقبول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور کہیں ان سے متعلق پیش کردہ سفارشات کے ردوقبول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاضل مرتب نے بڑے تسلسل کے ساتھ آسانی سے سمجھانے کے انداز میں تمام باتیں نقل کی ہیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر ایک طرح کی تشنگی مٹتی اور حد درجہ سیرابی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' مولوی عبدالحق اور برجموہن دتاتریہ کیفی کو مرتبِ موصوف نے اپنے مقدمہ میں جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ بجا ہے۔ نیز ہندوستان کے مایہ ناز محققین اور مصنفین مثلاً ڈاکٹر سید عابد حسین' سید مسعود حسن رضوی' امتیاز علی عرشی' قاضی عبدالودود' مالک رام' ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر گیان چند جین کے نام خاص طور پر لیے ہیں جنہوں نے صحتِ املا کی طرف خاص توجہ برتی ہے۔

قابل مرتب نے اردو املا کی طرف پاکستان میں جو کام ہوا ہے اس کا مجمل ذکر کیا ہے۔ اردو میں غنیت' ہکاریت اور ہمزہ کے مسائل کو فاضل مرتب نے پیچیدہ قرار دیا ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی ان پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اسی طرح ذ اور ز کے استعمال میں ردّ و بدل کی طرف اس کتاب میں خاص توجہ دلائی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب اردو دنیا کے لیے بہت ضروری تھی۔ املا کو ایک معمولی بات سمجھ کر اب تک اس کی طرف توجہ نہ دینے والوں کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہر ادیب اور ہر اردو کا طالب علم پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں اس بات کا اعتراف صحیح ہے کہ ''زبان اور رسم الخط میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی کوئی فردِ واحد' کمیٹی یا انجمن یا ادارہ جبراً مسلط نہیں کر سکتا۔ تبدیلیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ زبان کے خاموش عمرانیاتی عمل کے تحت از خود رونما ہوتی ہیں۔ کمیٹیاں اور ادارے صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ کسی مسئلہ کے بارے میں احساس و شعور کو بیدار کر دیں اور آگہی کی فضا پیدا کر دیں تا کہ انتشار دُور ہو۔''

واقعی یہ کتاب اسی احساس و شعور کو بیدار کرنے اور آگہی کی فضا پیدا کرنے میں ممد و معاون ہے اور ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ انتشار دور ہو جائے گا۔

# تخلیقِ عصر

تازہ تخلیقات کا تعارف

عطیہ سکندر علی

## چیری سے چنبیلی تک

جناب محسن بھوپالی اردو شاعری میں اس قدر بلند مقام و مرتبے کے حامل ہیں کہ کوئی تعریف، توصیف اور تحسین اُن کے فن کے مقابل قطعاً کوئی معنی نہیں رکھتی۔ انہوں نے جو بھی کہا، جس قدر بھی کہا، معنی کہا اور بھرپور کہا۔ اُن کے کہے لفظ کی حرمت عام قاری سے لے کر اعلیٰ ایوانوں تک محسوس کی گئی۔ حال ہی میں جاپانی اصناف "واکا اور ہائیکو" پر مشتمل اُن کا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے جس میں جناب محسن بھوپالی کی ساتھ روایات اعلیٰ طریق پر جلوہ گر ہیں۔ انگریزی سے اردو میں منتقل کی گئی چند مختصر جاپانی نظمیں ملاحظہ فرمائیے۔

برکھا نے جیسے پھولوں کو محروم کیا ان کی رنگت سے / میرا جوبن
چھینا بہار ہا کے ان برسوں نے ...... / یہ بیاکل / طوفانوں کا خالق بھی /
توڑے یہ بندھن / اس سے کب مانے گا ہار / تیرا میرا گہرا پیار ...... / کاش
میرے آنسو / برکھا بارش کی صورت / اور جب دیکھے / چھوٹی عمدی چاہت کی /
شاید واپس آجائے ......

چند منتخب ہائیکو ملاحظہ فرمائیے۔

گلشن ہے شاداب / لیکن میں نے دیکھے ہیں / خون آلود
گلاب ...... / دنیا سے چھپ کر / آ" فطرت نے پھیلا دی / کہرے کی
چادر ...... / اے چتے پھولو / سورج آنے والا ہے / بیاں مت بھولو ...... /
جذبہ ہو کامل / پانے والے پاتے ہیں / طوفانوں میں ساحل ...... / اوّل کی تو
گو / دل پر یادوں کی دستک / آنکھوں میں آنسو

اس قدر دل موہ لینے والے کلام کے بعد کسی بھی صاحب دل اور صاحب نظر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ جناب کلیل احمد صدیقی کی اس رائے سے اختلاف کرے کہ جناب محسن بھوپالی مشق سخن کے استاد اور رہنما کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک سو چالیس صفحات کی مختصر با معنی اور باہنر یہ کتاب صرف ایک سو روپے پاکستانی یا دس امریکی ڈالر کے عوض کیوں کیو پبلیکیشنز، کمرشل سٹریٹ نمبر 47-V ڈی ایچ اے کراچی پر دستیاب ہے

## تاریخ پارے

پروفیسر مشتاق اعظمی ماہر تعلیم، نامور افسانہ نگار اور بچوں کے شناسا فنکار کے طور پر منفرد مقام کے حامل ہیں۔ مشتاق اعظمی صاحب کے قلم کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے واقعہ کو مختصر سے مختصر پیرایہ بیان میں جامعیت کے ساتھ بیان کر کے داد حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح چھوٹے سے واقعے کو بڑی نفاست اور مہارت کے ساتھ بیان کر کے بڑے شاہکار میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

"تاریخ پارے" فلسفہ، سائنس، آرٹ، مذہب کے حوالے سے تاریخی حکایات اور مشہور شخصیات سے منسوب ایسے واقعات کا بیان ہے جس میں قاری کے لئے نصیحت بھی ہے، دلچسپی بھی ہے اور ذخیرہ علم بھی ہے۔ کام وقت طلب اور عرق ریزی کا ہے جسے پروفیسر مشتاق اعظمی نے بڑے سہل انداز میں پیش کر کے ایک مختصر جلد میں مقید کر دیا ہے، جس سے ہر عمر اور ہر ذوق کا قاری بہت سی ضخیم کتابوں کا لطف کم وقت اور کم محنت میں حاصل کر سکتا ہے۔ "تاریخ پارے" کے مطالعے کے دوران قاری پر اس وقت حیرت کے در ضرور وا ہوتے ہیں جب وہ پروفیسر مشتاق اعظمی کے قلم کی روانی، شستگی اور صحت الفاظ میں اپنے اسلاف کے قصے ایک نئی چاشنی اور لذت کے ساتھ پڑھ کر خود کو پہلے سے زیادہ باخبر اور باہنر محسوس کرتا ہے۔ "تاریخ پارے" ہمارے دور کی ایسی تخلیق ہے جو ہمارے ماضی کے بہت سے آئینوں کو وا کرتی ہے اور جس میں سیکھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے بہت سے سامان دستیاب ہیں۔ بقول ڈاکٹر عابد ضمیر "تاریخ پارے" پڑھنے کے دوران قاری کبھی زیر لب تبسم، کبھی قہقہہ ریزی پر مجبور ہوتا اور کبھی غور و فکر پر آمادہ ہوتا ہے۔ ایک سو بارہ صفحات کی نہایت صاف ستھری یہ عمدہ و دلچسپ کتاب صرف ایک صد روپیہ کے عوض سفیر بک ڈپو، جی ٹی روڈ، آسنسول، مغربی بنگال بھارت سے حاصل کی جا سکتی ہے

## خواب پرندے

"جدید غزل کا نمائندہ شاعر محمد فیروز شاہ قطعی طور پر ایک منفرد لہجے کا شاعر ہے۔ اسے یہ لہجہ اس جدید حسیت نے بخشا ہے جو عصر رواں کے کرب کو شاعر کی سی حساس مخلوق کی ہڈیوں کے گودے تک میں اُتار دیتی ہے۔ غزل کا شاعر خود کو روایت سے منقطع نہیں کر سکتا مگر علامہ اقبال اور ان کے بعد کے شعرا کی غزل میں موضوع اور لہجے کی جو ہیئت تبدیلی آئی ہے اور محمد فیروز شاہ کی غزل جس تبدیلی کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے وہ اس قدیم روایت سے مربوط بھی ہے اور اس میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ یہ امکانات سے پُر ہے۔ یہ تغیر غزل کی روایتی لفظیات کو بھی متغیر کر دیتا ہے۔ محمد فیروز شاہ کی غزل اس کی بھی ایک عمدہ مثال ہے"....... احمد ندیم قاسمی

ہمارے عصر کے Living Legend جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے اس قدر با اثر و با معنی کلمات حسن کے بعد جناب محمد فیروز شاہ کو مزید کسی تعریف و تحسین کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔ ضرورت اگر ہے تو جناب محمد

فیروز شاہ کے کلام سے آپ کے تعارف کی ہے

اِک چاند شہرِ شب میں جو تشکیل ہو گیا
وہ روشنی کا قطرۂ ترسیل ہو گیا!

☆

ہمارے اندر گناہ و جرم و خطا نے خیمے لگا لئے ہیں
اندھیر زادوں نے ان مکانوں میں اپنے ڈیرے جما لئے ہیں

☆

تو کیا بیٹوں سے مائیں دور ہوتی جا رہی ہیں
کہ ماؤں کی دعائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

☆

استعارہ کہ قیامت کا الم سہتا ہے
شب کے ہم شکل مناظر میں کہیں رہتا ہے

دوصد چھپن صفحات پر محیط ''خواب پرندے'' غزلیات کے ساتھ نظم کے حوالے سے بھی بہت ثروت مند ہے جس میں موضوعات کی ہمہ رنگی معنویت تہہ داری اور شاعری کی دردمندی و اخلاص اپنے جداگانہ اور دیرپا رنگ و آہنگ کے ساتھ آپ کی توجہ کا طلب گار ہے کم از کم دو شہروں میں اس نادر شعری نسخے کی دستیابی با آسانی ممکن ہے جس کے لئے جستجو، اشتیاق و ذوق کے علاوہ مبلغ دوصد روپیہ کا نذرانہ بھی مشروط ہے۔ K/221 ' کا گو سٹریٹ' میانوالی۔ مثال پبلی شرز رحیم سنٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد۔

## کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی

''کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی'' سے قبل محمد امین الدین صاحب کے تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ کر توجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ''کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی'' اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جس کے صفحات کی تعداد ایک سو ستاون اور افسانوں کی تعداد تیرہ ہے۔ جناب محمد امین کی افسانہ نگاری کی بابت خواجہ رضی حیدر صاحب کا فرمان کچھ اس نوعیت کا ہے ''محمد امین الدین ایک پختہ کار افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے اب تک چار مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ تعارف کی اُس منزل کو نہیں پا سکے جو کہ چند افسانے لکھ کر ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں نے پائی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد امین الدین چار افسانوی مجموعوں کی اشاعت اور زبان و تکنیک کے اعتبار سے افسانہ نگاری میں کمال رکھنے کے باوجود کسی ادبی تنظیم یا گروہ سے وابستہ نہیں لہٰذا ان پر تعارف کا کوئی در کھلا ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد امین الدین کے افسانے خود ان کا تعارف بن جائیں۔ میرے خیال میں محمد امین الدین کے بھی افسانے ایک کہانی لئے ہوئے ہیں اور وہ جس معاشرے کے فرد ہیں اسی سے ان کہانیوں نے جنم لیا ہے اس لئے ان میں سماجی حقیقت پسندی زیادہ ہے۔ وہ بیک وقت انسان کی سماجی اور روحانی صورتِ حال پر نگاہ رکھتے ہیں اور پھر اس صورتِ حال کو نہایت خوبصورتی سے ماضی کی روایات کے آئینہ میں ایک وسیع تہذیبی تغیر سے جوڑ دیتے ہیں۔''

بلاشبہ فنکار کی اصل شناخت اُس کی تخلیق سے منسوب ہوا کرتی ہے مگر شخصی عکس کی پیوند کاری سے فن اور فنکار کو جانچنے پرکھنے میں بہت سی آسانیاں میسر ہو جاتی ہیں لہٰذا آپ اور ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ''کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی'' کے مطالعے اور خواجہ رضی حیدر صاحب کی واضح اور دوٹوک رائے کی روشنی میں رائے قائم کرتے ہوئے جناب محمد امین الدین کو اُن کے صحیح مقام و مرتبے پر سرفراز کریں۔ ''کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی'' مبلغ ایک صد پچاس روپیے کے عوض B-135/2 ' بلاک E نمبر 7 ' گلشن اقبال کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

## محبت اور خون

''محبت اور خون'' پروفیسر نذیر کھیاجی کے بیس افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے جس کی بابت مرزا دانبالوی صاحب کا خیال ہے ''محبت اور خون'' کے بیس افسانوں میں پروفیسر نذیر کھیاجی کا مطالعہ اور مشاہدہ تمام کے تمام افسانوں کو رنگینی و رعنائی بخش رہا ہے۔ افسانوں کی زبان اور پیرائیہ بیان اتنا سادہ اور دلکش ہیں کہ بات ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق فوراً دل میں اتر جاتی ہے بعض افسانے تو ایسے ہیں کہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ خود ہماری واردات ہے اور یہی سچے اور کھرے فنکار کی پہچان ہے۔ خود ''محبت اور خون'' کے مصنف کا اقرار نامہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ''میں نہیں جانتا کہ افسانہ کیسے کہتے ہیں اور افسانہ کیا ہوتا ہے میں تو یہ جانتا ہوں کہ جب بھی کوئی حق و اقعہ میرے دماغ کو گرفت میں لے لیتا ہے اور میں اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اُس مشاہدے کو قرطاس پر رقم نہ کر لوں۔ میرے نزدیک یہی افسانہ ہے'' کوئی ایسا مشکل کام نہیں کہ ''محبت اور خون'' کی بابت چند تحسینی کلمات اور کچھ تعریفی الفاظ تحریر کر کے زیرِ نظر تبصرہ کا باوزن کر دیا جائے مگر الفاظ و القاب کی بھی اہمیت ہوا کرتی ہے جب وہ با موقع اور بروقت ضابطۂ تحریر میں لائے جائیں۔ پروفیسر نذیر کھیاجی صاحب معروف شاعر، ماہر تعلیم اور بالغ نظر انسان ہیں اُن کی ذات اور فن کی بابت اُستادانِ فن نے ہمیشہ مثبت جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ ''محبت اور خون'' کی بابت بھی پروفیسر نذیر کھیاجی صاحب اور راقم تحریر اسی احساس اور خوش اُمیدی میں گرفتار ہو جائیں تو یہ مبالغہ ہرگز تصور نہ کیا جانا چاہیئے البتہ حافظۂ خیال کی گنجائش ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہونا چاہیئے۔ ''محبت اور خون'' کی بابت ہم ''چہار سُو'' کے صفحات کے توسط سے ملی

قلم کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں اور جیتی جاگتی حسین تحریر بھی قائم کئے ہوئے ہیں۔ "محبت اور خون" کی ضخامت ایک سو ساٹھ صفحات اور قیمت دو صد روپیہ ہے دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے۔ روزن پبلشرز' روزن بلڈنگ' ریلوے روڈ گجرات۔

## وہ قربتیں یہ فاصلے

ڈاکٹر انور نسیم صاحب عالمی سطح کے سائنسدان' اعلیٰ سطح کے انسان اور قلمی سطح کے ادیب ہیں۔ ادب اور ادیب سے تعلق اُن کے اعلیٰ ذوق اور فطرت کے مظاہر سے عشق حد تک لگاؤ کی دین ہے۔ سادگی' سچائی اور وطن کی محبت اُن کی بے شمار خصوصیات میں سے چند ہیں۔ اُن کا ادب سے تعلق نصف صدی کو محیط ہے مگر پیشہ ورانہ مصروفیات نے انہیں باضابطہ طور پر قلمی برادری سے اس قدر مربوط نہ ہونے دیا جس قدر اُن کے قلم میں قوت اور قلب میں توانائی دستیاب ہے۔ "وہ قربتیں یہ فاصلے" ڈاکٹر انور نسیم صاحب کے سات افسانے اور ایک ناولٹ پر مشتمل ہے جس کی ضخامت ایک سو ساٹھ صفحات نفیس کاغذ اور عمدہ طباعت کے پیکر میں جلوہ گر ہے اور جدید اعتراف جدید اردو افسانے کے معمار ڈاکٹر رشید امجد صاحب عطا کر رہے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کی خاص بات اُن کا تیز مشاہدہ ہے جو انہیں قدرت نے ودیعت کیا ہے اور سائنسی تربیت نے اُسے مزید صیقل کیا ہے۔ ادب ہو یا سائنس دونوں کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ اس بات پر بھی دو رائے نہیں ہیں کہ ادب کے میدان کا رہنورد ہو کہ سائنس کی شاہراہ کا راستے اور طریق کار کے فرق کے باوجود دراصل ایک ہی منزل کا متلاشی ہوتا ہے۔ سائنسدان انور نسیم ایسے کہانی کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو چلتے پھرتے کہانی تلاش کر لیتا ہے۔ اور تخیل کی رنگ آمیزی کر کے اسے ایسی شکل و صورت عطا کرتا ہے جس میں حقیقت اور تخیل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ سائنس سے گہرے ربط و ضبط نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے تخلیقی پہلو کو کئی زاویوں سے جلا بخشی ہے۔ ان میں سے ایک افسانہ کی تکنیک پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت ہے۔ ان کی ہنرکاری کا اعجاز ہے کہ ان کی کہانیاں قدم قدم پر اپنی پرتیں کھولتی ہے اور روانی کے ساتھ قاری کو انجام تک بہائے لے جاتی ہے۔ دوسرا زاویہ حقیقت شناسی اور اشیا و حقائق میں مستور کرده کچھ جاننے کی جستجو و لگن ہے جو اکثر دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوا کرتا ہے۔ یہ لاشعوری بات ان کی کہانیوں اور کرداروں کی نفسیاتی گرہ کشائی کرتی ہے اور مجموعی انسانی کشمکش اور سیاسی سماجی منظر نامے میں معاشرے کا حقیقی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ تیسری اہم بات ڈاکٹر صاحب کے افسانوں میں طرزِ استدلال کی صورت میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے یوں ان میں روحِ عصر کی خوشبو در آتی ہے اور ان کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے۔ "وہ قربتیں یہ فاصلے" صرف ایک صد پچاس روپیہ کے عوض تخلیق کار پبلشرز' راولپنڈی پر با آسانی دستیاب ہے۔

## آنکھ خواب بُنتی ہے

سخن ور ہیں ہماری گفتگو رکتے نہیں پاتی
جہاں خاموش ہوتے ہیں وہاں پھر شعر کہتے ہیں

بے محابا' با اثر اور معنی خیز گفتگو کرنے والے شہباز خواجہ کو قدرت نے فیاضی کے ساتھ وصفِ شعر و سخن عطا کیا ہے۔ ضرورت بر وقت' برمحل داد اور رہنمائی کی ہے جس کے اندر داخل کیا ڈھال کر شہباز خواجہ کو کندن بنایا جا سکتا ہے

یہ جو میرا رنگ ہے روپ ہے یونہی بے سبب نہیں دوستو
مرے خوشبوؤں سے ہیں سلسلے مری نسبتیں ہیں گلاب سے

☆

وہی معتبر ہے مرے لئے وہی حاصلِ دل و جان ہے
وہ جو باب تم نے چھپا لیا مری زندگی کی کتاب ہے

بات یہاں پر بس نہیں ہوتی شہباز خواجہ کی جولانیِ سخن "آنکھ خواب بُنتی ہے" میں جابجا نسبتوں' خوشبوؤں' چراغوں اور گلابوں سے ہم آغوش خود بھی ہوتے ہیں اپنے قاری کو بھی کراتے ہیں۔

جس شب بھی ہوا اور چراغوں میں ٹھنی ہے
وہ شب ہی نئے عزم کا عنوان بنی ہے

☆

اِک سیلِ جنوں ہے جو ٹھہرنے نہیں دیتا
ورنہ تو تری زلف کی چھاؤں بھی گھنی ہے

فریب کے عنوان سے مختصر نظم اور اس کے تاثر کا لطف اُٹھائیے۔

لو کیا! ایک! اخوبصورت سی آنکھوں میں! چنے جا کے گا وہ چنے کر تعبیر یں جن کی انتظاروں کے دامن میں رکھی ہوتی ہیں! انتظار وہ کسی کے شناسا نہیں! ایسے موسم میں جب کا ہوا تیز ہو

سلسلۂ سخن شہباز ابھی جاری ہے بس ذرا فاصلہ آپ کے اور اُن کے درمیان "نوب سنز پبلی کیشنز' اقبال روڈ' کمیٹی چوک' راولپنڈی" کا ہے جہاں سے فقط ایک سو بیس روپیہ کے عوض اسے دریا رہ جوڑا جا سکتا ہے۔

## سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

اردو کے شعری سرمایہ میں سید وحید الحسن ہاشمی کا گراں قدر حصہ مسلمہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اردو غزل' نعت' منقبت اور سلام کے حوالے سے نہ صرف عشقِ سخن بلکہ عشقِ قلب سے بھی ان اصناف کی ترقی و ترویج کے لئے لائقِ احترام خدمات انجام دی ہیں۔ ہمارے روبرو اس وقت "سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں" ہے جسے ہاشمی صاحب کے لائق فرزند

ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی نے مرتب کیا ہے کتاب کی ضخامت دو صد چالیس صفحات پر محیط ہے جنہیں چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں وحید الحسن ہاشمی ایک تحریک، ایک دبستان، سوانحی کوائف، تصانیف، اعزازات و پذیرائی، وحید شناسی کے مختلف رخ جن میں کم و بیش سترہ اہل قلم نے ہاشمی صاحب کی شخصیت و فن پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ باب دوم میں وحید الحسن ہاشمی کی نعت سے دلچسپی اُن کے نعتیہ اسلوب اور اردو نعت کی تاریخ میں وحید الحسن ہاشمی کا مقام و مرتبہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ باب سوم میں وحید الحسن ہاشمی کی منقبت سے رغبت کے اسباب اور مجموعوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم میں وحید الحسن ہاشمی کی صنف سلام سے دلچسپی اور سلام پر مشتمل مجموعوں اور وحید الحسن ہاشمی کے سلام کے جدید جدید امکان پر گفتگو کی گئی ہے۔ باب پنجم میں سید وحید الحسن ہاشمی سے نعت، سلام اور منقبت کے حوالے سے پُر مغز گفتگو کی گئی ہے جس میں علم و ادب کے بہت سے نئے گوشے وا ہوئے ہیں۔ باب ششم میں وحید الحسن ہاشمی کا نعت، منقبت اور سلام پر مشتمل کلام سے انتخاب شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ایک لائق باپ کے ہونہار فرزند کی قابل ستائش کاوش ہے جس سے ان اہم اصناف سے دلچسپی کے حامل احباب کو فیض حاصل ہوگا اور آنے والے وقتوں میں بہت سے اہم اُمور پر جستجو، تحقیق و رہنمائی کے لئے یہ اہم کتاب اپنا اہم کردار نبھا رہے گی۔ کتاب کی طباعت، جلد اور سرورق بھی عمدہ اور دیدہ زیب ہیں۔ قیمت نہایت مناسب دو صد روپیہ اور دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے۔ الحسن پبلی کیشنز: 253 رحمان پورہ لاہور۔ فون: 042-7580643

سرمایۂ گمان نظری

مختصر تبصرہ و تجزیہ میں تخلیق کے حسن و قبح پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی گنجائش نہ ہونے کے باعث احباب کا یہ گلہ درست اور بجا ہے کہ ہر تخلیق کی بابت سب اچھا اور عمدہ کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب میں سب کچھ تنقید و تنقیص سے پاک ہوتا جا رہا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے کبھی کبھی تخلیق کار کے فنی عیوب و نقائص پر بھی گفتگو کی جانا چاہیے بہ لحاظ نہ کی ہر احتیاط ہی کی مگر اس وقت ہمارے روبرو جس تخلیق کار کی تازہ کاوش موجود ہے اس کی نسبت کوشش اور کاوش کے باوجود اختلافی رائے کا اظہار خاصا دشوار ہے بھلا ان اشعار کے شاعر جناب کرشن کمار طور سے کون اختلاف کر سکتا ہے اور کس طرح کر سکتا ہے

شعبدے جتنے بھی ہیں سب چاک کے ہیں
خاک سے گوندھے گئے تھے خاک کے ہیں
ہے عیاں چہرے سے اپنے خوش خصالی
ہم بھلا پیکر کسی فتراک کے ہیں

جہاں میں عشق کے بے کار جانے کا
مجھے ڈر ہے تو خود سے ہار جانے کا
یقیں شامل ہے کچھ کچھ بے یقینی میں
عجب ہے تجربہ اس پار جانے کا

یہ کار لاشعوری بھی شعوری ہے
محبت جس کو کہتے ہیں ضروری ہے
لگے گا وقت ابھی بننے میں ان کو
جہاں بھی زندگانی بھی ادھوری ہے

اناؤں سے زندگی بھر کے
لوگ رسوا ہوئے ہیں جی بھر کے
روبرو میں جہاں کے ہوتا ہوں
اپنی مٹی میں روشنی بھر کے

اب ذرا چند آفاقی و ملتانی شخصیات کے جناب کرشن کمار طور کی بابت کلمات حسن ملاحظہ فرمایئے۔ کرشن کمار طور کی غزل کی تخلیق میں غیر معمولی شعری قوت اور تخیل کار فرما ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ..... آپ کے اشعار میں ایک نکتہ ہوتا ہے جسے عرف عام میں مضمون آفرینی کہتے ہیں۔ پروفیسر وارث علوی ..... تم سچے اور پیارے شاعر ہو میری اپنی غزل تم سے بہت سے سوال کر رہی ہے میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ بشیر بدر ...... کرشن کمار طور نے دعائیہ لہجہ اپنے داخل سے ابھار کر غزل کو عبادت کے مرتبہ میں داخل کر دیا ہے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید اردو غزل کے خوبصورت درد ہیں اور انہیں کائنات دیگر سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ..... ہندو پور سلسلۂ تخلیق کار سے ہوتا ہوا ادب کے شناوروں کے توسط سے آپ تک آن پہنچا ہے جس کی بابت کوئی بھی رائے قائم کرنے میں آپ کلی طور پر با اختیار ہیں۔ ایک بات ہم شاید پہلے بھی جناب کرشن کمار طور کی تخلیقات کی نسبت عرض کر چکے ہیں اس کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں ان کی تخلیقات کی قیمت انتہائی زیادہ معلوم کیوں ہوا کرتی ہے۔ "سرمایۂ گمان نظری" ایک سو ساٹھ صفحات پر محیط ہے جس کی قیمت دو صد پچاس روپیہ ہندوستانی انتہائی زیادہ اور قاری بالخصوص پاکستانی کے لئے انتہائی نا واجب بھی۔ دستیابی کے پتے مندرجہ ذیل ہیں۔ مکتبہ شب خون، 313 رانی منڈی الہ آباد ... 2، سرمد پبلی کیشنز، 34/E اکھیارا روڈ دھرم شالہ 176215، بھارت۔

## نعتِ محمدؐ

میری خوش بختی ہے کہ میں گذشتہ پچاس برس سے حضرت سرور انبالوی کی شاعری خود اُن کی زبان سے سنتا اور مطبوعہ صورت میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ آپ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ نعت بعنوان "نعتِ محمدؐ" کا اسلوب بھی ہے اور کا تخلیق بھی۔ آنحضورؐ سے اِن کی عقیدت اور محبت اِن کے زیر نظر نعتیہ کلام کی سطر سطر سے بھی پھوٹی پڑتی ہے اور ہر اسلوب سے بھی اُمڈی چلی آتی ہے۔ حضرت سرور انبالوی نے اپنی اس محبت و عقیدت کو شاعری کا پیرایۂ اظہار بخش کر ہماری نعتیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ میں انہیں اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں....

پروفیسر فتح محمد ملک

قلب و نظر نے پائی ترے در سے روشنی
تیرے جمال سے ملی ہے صبح آگہی

زمانہ کب تھا واقف عظمتِ لولاک سے
خرد نے آگہی پائی حضورؐ سے پہلے

گلوں کا رنگ اور بن کر سحر کی روشنی آئی
محمدؐ مصطفیٰ لے کر پیامِ زندگی آئے

حاملِ قرآں خلقِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
طاہر و اطہر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

ایک نعتیہ رباعی ملاحظہ فرمایئے:

جس دل میں محمدؐ کی محبت ہو بسی
سمجھو کہ اُسے مل گئی عالم کی خوشی
خوش بختی پہ کیوں ناز نہ ہو اس کو سرور
کونین میں اس سے بھی بڑی شے ہے بھلی

جناب سرور انبالوی کے شعری مقام و مرتبہ کی بابت ہمارے عصر کے قابل اعتبار ماہر تعلیم ادیب نقاد پروفیسر فتح محمد ملک نے جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کر کے ہمارے لئے کفایت لفظی کی سہولت مہیا کر دی ہے۔ خود سرور انبالوی صاحب کے عقیدت و محبت بھرے نمونۂ کلام نے قلب و ذہن کو آمادۂ بندگی کر دیا ہے تو کیوں نہ اس کیفیت کو برقرار رکھنے کے لئے گلی نمبر ۲ ظہیری حسن آباد راولپنڈی سے رجوع کیا جائے جہاں اپنے دور کا یہ نمائندہ نعتیہ مجموعہ فقط ایک سو پچاس روپیہ کے عوض آپ کے لئے تسکین کا سامان مہیا کرنے کے لئے دستیاب ہے۔

## ترانۂ بیداری

علامہ سیماب اکبر آبادی کی شعری فیوض و برکات برصغیر کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے مربوط ہونے والے یوپی، بھارت کے شہر میرٹھ میں پی۔ ایس جین جوہر کے نام سے کم و بیش ساٹھ پینسٹھ برس سے علامہ کی روشن کردہ شمع ہوئی آب و تاب سے روشن بھی ہے اور نمایاں بھی۔ جناب جین جوہر نے اردو شاعری کو کل وقتی مصروفیت کے طور پر اپنایا ہوا تو اُن کا شمار برصغیر ہند و پاک کے اُن بلند قامت شعرا کی فہرست میں نمایاں مقام کا حامل ہوا جنہوں نے جنگِ آزادی میں قلمی جہاد کے ذریعے ہر اول دستے کا فریضہ انجام دیا بلکہ اردو غزل کے گیسو سنوارنے میں بھی پیش پیش رہے۔ ہمارے پیش نظر جناب جین جوہر کا تازہ شعری مجموعہ ہے جی تو چاہتا ہے کہ تمام مجموعہ ہی نقل کر کے آپ سے اہلِ ذوق کی سند حاصل کریں۔ دقت درپیش قلتِ صفحات کی ہے جس کے خوف سے آپ کے روبرو جناب جین جوہر کے کلام سے چند قاشیں تبرک پیش کر کے آپ کی توجہ جناب جین جوہر کے بامعنی و بااثر کلام کی جانب مبذول کرانا چاہیں گے۔

ہائے وہ ایامِ طفلی کی بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپن کی نرم کلیاں وا ہوئیں

اگر آدمی کچھ سمجھ دار ہو
تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہو
مصیبت میں کوئی مددگار ہو
تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہو

ترا حسن کافرانہ مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی نہ مرا کوئی ٹھکانہ
کہیں پہ قدم رکھنا، کہیں سے نظر چرانا
وہ بہ انتہائے قربت بھی سلوک عامیانہ

تمام تر کوشش کے باوجود جناب جین جوہر کے کلام سے ہم کوئی نظم نمونۃً پیش کرنے سے معذور ہیں کہ ہر نظم ایک شاہکار اور پورے جوبن و جوانی کے ساتھ آپ سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہے جس کے لئے ہماری اوسط درجہ کی محدودات آڑے آ رہی ہیں البتہ شاعری اور دوسرا جنم کے عنوان سے دو قطعات ہم ضرور آپ کی نذر کرنا چاہیں گے۔

ذہن میں میکدہ خیالی ہے
ہاتھ میں جام ہے نہ پیالی ہے

ہم نے بس زندگی کے ملکوں میں
شاعری کی شراب ڈھالی ہے

زندگی کتنی بے وفا نکلی
موت کی بھی وہ آشنا نکلی
کر کے ہم کو سپردِ خاک و کفن
گھر کسی غیر کے وہ جا نکلی

ترانۂ بیداری کی خاص اور اہم خوبی اس کا اردو اور دیوناگری میں ایک ساتھ شائع ہونا بھی ہے۔ جس کے باعث کتاب کی ضخامت دو سو بہتر صفحات کو چھو رہی ہے۔ قیمت انتہائی مناسب دو صد روپیہ اور دستیابی A-259' پاکٹ 1' مجور وہار فیز نمبر 1' دہلی-110091 اور B-7 انڈسٹریل اسٹیٹ بریلی پور 250103 میرٹھ یوپی انڈیا سے ممکن ہے۔

شگفتہ بیانیاں

محترمہ شگفتہ نازلی اردو شاعری میں بڑی برق رفتاری سے اس منزل کی جانب گامزن ہیں جہاں پہنچنے کی تمنا تو کی جا سکتی ہے مگر ہر کس و ناکس کی دسترس میں منزل کا نشان بھی مشکل سے ہی آتا ہے۔ حال ہی میں محترمہ کے لطیف و بے نظیر انشائیوں کا مجموعہ "شگفتہ بیانیاں" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ شگفتہ نازلی صاحبہ کے انشائیوں کی بابت ہمارے دل، دماغ اور قلم میں کہنے کے لئے کافی کچھ دستیاب ہونے کے باوجود ہماری خواہش فنِ انشائیہ کے بلند جاروں کے افکار آپ کی نذر کرنے کی ہے جو محترمہ شگفتہ نازلی کے انشائیوں کی نسبت خصوصی طور پر کہے گئے ہیں۔ "شگفتہ نازلی اپنے زمانے کے مناظر' مظاہر' اشیا اور شخصیات کی ناظر بھی ہیں اور اپنے مشاہدات سے اپنے آزاد ذہن اور سوچ کے مطابق نتائج بھی اخذ کرتی ہیں۔ میں نے ان کی متعدد انشائی تحریریں پڑھی ہیں جن میں شگفتگی ایک دوشیزہ کی مسکراہٹ کی طرح موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید..... ان کے انشائیوں میں عام انشائیوں کی طرح گھسی پٹی باتیں نہیں ہیں۔ ایسی باتیں بھی نہیں ہیں جنہیں آپ اپنی ذات سے دور سمجھتے ہوں یا جن کی اجنبیت میں آپ کو کوئی بیگانگی محسوس ہو۔ شگفتہ نازلی عام روزمرہ کی باتیں کرتی ہیں لیکن ان کی عام اور روزمرہ کی باتوں میں ہمیں ایک نئے انداز کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ مشکور حسین یاد..... ان کے انشائیوں میں حسن آفرینی کے ساتھ اسلوب شعر کا بھیگا ہوا انداز بھی لطف دیتا ہے۔ ان کے انشائیے پڑھ کر ایک شاعرانہ اور خوابناک ماحول میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی..... اپنی مزاحی اور فکری اعتبار سے یہ شگفتہ نازلی کے اظہار کا ایک اچھا رخ اور پیٹرن ہے۔ اس میں کرافٹ کم اور بے ساختگی زیادہ ہے۔ وہ سوال اُٹھاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں ان پر اتر رہی ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن.....

ان کی انشائی تحریریں ایسا آئینہ ہیں اور ان میں اتنی شگفتگی اور دلچسپی ہے کہ انہیں بڑی سہولت کے ساتھ ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ برمحل اشعار اور شعر پاروں کی آمیزش نے اسلوب کو رنگین اور دلنشین بنا دیا ہے۔ خیالات شستہ اور پاکیزہ ہیں جن میں بات سے بات کرنے کا انداز قابل تعریف ہے۔ تحریر میں کلاسیکی چاشنی ہے اور مجموعی تاثر رجائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمود ذکیا.....
اس قدر مستند، مدلل اور باوزن آرا کے بعد ہر باذوق قاری کے دل میں "شگفتہ بیانیاں" کے لئے اشتیاق پیدا ہونا فطری امر ہے لہٰذا اولین فرصت میں پوسٹ بکس نمبر 9023' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور سے رجوع کیجئے جہاں "ترانۂ بیداری" فقط ایک صد روپیہ کے عوض آپ کی دسترس میں آنے کو تیار ہے۔

سہ ماہی سورج

لاہور کے شافق' ادیب اور ماہر غالبیات جناب حلیم احمد قصور سہ ماہی "سورج" کو جس قدر جانفشانی' توجہ' لگن اور فراوانی سے ترتیب دے رہے ہیں اُس کی بازگشت اردو کی تمام بستیوں میں سنائی دے رہی ہے۔ خاص کر گزشتہ دنوں حلیم احمد قصور صاحب غالب انسٹیٹیوٹ دہلی بھارت کی دعوت پر غالب سیمینار میں شرکت کے لئے جاتے وقت تازہ "سورج" کی چند کاپیاں احباب کے لئے سوغات کے طور پر لے گئے۔ "سورج" کے اُن شماروں کا ہند کے اہل قلم نے اسی قدر گرمجوشی سے استقبال کیا جس قدر جناب حلیم احمد قصور اور دیگر شرکائے محفل کا۔ تمام احباب کے لئے یہ امر بڑی خوشی کا باعث تھا کہ پاکستان میں عالمی معیار کے اردو مجلے اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔ جناب حلیم احمد قصور دولت کے ساتھ ساتھ موالی عزت اور ہمہ جہتی کے لئے جس قدر متحرک رہتے ہیں اُس کی مثال اردو ادب میں کم کم ملتی ہے۔ جنوری تا مارچ 2006 کے شمارے میں تحقیق وتنقید' داستان طرازی' نوائے سروش' غزلیات' غیر ملکی شعری ادب' خصوصی پیشکش کے طور پر پروفیسر گوپی چند نارنگ سے گفتگو' ایوانِ غالب' کرن کرن اُجالا کے عنوان سے احباب کی آرا اور تجاویز' پہلی کرن کے نام سے اداریہ' لاہور معروف سیاست دان اور ادیب جناب حنیف رامے کی وفات پر فیچر کے علاوہ 18 اکتوبر کے سانحہ پر ملک کے مختلف شعرا اور محترم اہل قلم کی نگارشات شامل کی گئی ہیں۔ "سورج" کے زیر بحث تازہ اور اہم شمارے کے ممتاز اہل قلم مندرجہ ذیل ہیں۔ جناب عبدالعزیز خالد' جناب امجد اسلام امجد' ڈاکٹر وزیر آغا' جناب شاہد واسطی' ڈاکٹر ریاض قدیر' جناب محمد سعید شیخ' ڈاکٹر رشید امجد' جناب مقصود الٰہی شیخ' محترمہ ترنم ریاض' جناب ناصر شہزاد' جناب ادیب سہیل' ڈاکٹر سیفی سرونجی' جناب اسلم کولسری' ڈاکٹر عزیز احسن' اکرام عازم' گروندر سنگھ کوہلی اور دیگر محترمین ہیں۔ کم و بیش چار صد رنگین و سادہ اور دلنشین صفحات کے اس خوبصورت مجلہ کی قیمت صرف دو صد روپیہ فقط ہے جب کہ دستیابی کے لئے مندرجہ ذیل پتوں پر رجوع کیا جا سکتا ہے۔ 6/A نصیرالدین روڈ' اسلام پورہ لاہور۔ بیان چیمبرز 3۔ ٹیمپل روڈ لاہور۔

# مجلسِ چہارسُو

پروفیسر غفور احمد صاحب جماعت اسلامی پاکستان اور قومی سیاست کا ایک قابل احترام باب ہیں۔ سادگی، سچائی، تحمل، بردباری، متانت، سنجیدگی، دور بینی اور دور اندیشی آپ کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات شمار ہوتی ہیں۔ قومی سیاست میں آپ کا کردار تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور تعمیری قدروں کا ترجمان بھی۔ زیرِ نظر گفتگو میں پروفیسر صاحب محترم سے جس قدر بھی ممکن ہو سکا ہے قومی معاملات پر ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے سے گرد صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

گلزار جاوید

☆ برصغیر کے بیشتر مسلم خاندانوں کا آبائی تعلق شرق وسطیٰ، افغانستان، ترکی وغیرہ سے بنتا ہے آپ کے خاندان کی جڑیں کہاں تلاش کی جا سکتی ہیں؟

☆☆ اس حوالے سے میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے آبا ہندوستان کے ہی رہنے والے ہوں گے۔

☆ کچھ خاندانوں میں آبائی پیشے بھی ہوا کرتے ہیں؟

☆☆ ہمارے بزرگ تجارت سے منسلک تھے۔ ہندوستان کے شہر نینی تال میں جنرل اسٹور وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ میری پیدائش کے بعد والد صاحب کو کاروبار میں بہت خسارا اُٹھانا پڑا اس لئے وہ لوگ واپس آبائی وطن بریلی آ گئے وہاں بھی جنرل اسٹور کا کاروبار جاری رہا۔ ویسے بریلی جو سُرمے کے علاوہ بانس کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔

☆ آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

☆☆ میری پیدائش 1927ء میں بریلی میں ہوئی۔

☆ آپ کُل کتنے بہن بھائی ہیں اور آپ کا نمبر کیا ہے؟

☆☆ ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میرا نمبر اُن میں دوسرا ہے۔

☆ اپنے بچپن کی بابت کچھ بتایئے؟

☆☆ میں نے عرض کیا نا! میری پیدائش کے وقت خاندان میں مالی بحران پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آپ اندازہ لگایئے کہ ایک یتیم اور غریب خاندان کا بچہ کس طرح کا ہو سکتا ہے میرا مزاج بچپن سے ہی دھیما ہے اس لئے میرا شمار شرارتی بچوں میں ہرگز نہ ہوتا تھا۔

☆ تعلیمی سلسلہ کب شروع ہوا اور آپ نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟

☆☆ اُس وقت مسلمان بچوں کو مسجد میں با غرضِ قرآن پڑھنے ضرور بھیجا جاتا تھا۔ میں نے بھی پہلے مسجد سے قرآن ختم کیا۔ اُس زمانے میں درجہ چہارم تک تعلیم مفت اور لازمی تھی میں نے بھی بریلی میں محلے کے سکول سے درجہ چہارم تک تعلیم حاصل کی اُس کے بعد اسلامیہ کالج بریلی میں پانچویں کلاس میں داخل ہو گیا۔ 1942ء میں وہیں سے میں نے میٹرک پاس کیا۔

☆ آپ کا شمار کس قسم کے طلبا میں ہوا کرتا تھا؟

☆☆ لائق بہرحال نہیں تھا میں اچھے طلبا میں شمار کیا جاتا تھا۔

☆ آپ کی شادی کب، کہاں اور کس طریقے پر ہوئی؟

☆☆ میری ماموں زاد سے 1950 میں اسلامی طریقے سے میری شادی انجام پائی۔

☆ آپ کی سیاسی زندگی میں اُن کا کردار؟

☆☆ اُن کا کردار یہی ہے کہ اُنہوں نے کبھی کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی۔ جیل کے دنوں میں ہر طرح کی صعوبتوں کے باوجود کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں اور ہر طرح سے ثابت قدم ہیں۔

☆ آپ کا ذریعہ معاش ابتدا میں کیا تھا اور آج کل کیا ہے؟

☆☆ لکھنؤ سے میں نے ایم کام کیا اور وہیں پڑھانا شروع کر دیا تھا بعد میں یہاں بھی پڑھاتا رہا ہوں۔

☆ ہجرت کے وقت کس بنا اور جذبے کے تحت آپ پاکستان تشریف لائے ابتدا میں کس قسم کے مسائل کا سامنا رہا؟

☆☆ ایک صاحب کے بچوں کو میں ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ اُنہوں نے جب ہجرت کا پروگرام بنایا تو میں بھی اُن کے ہمراہ پاکستان چلا آیا۔ نئی جگہ پر جب آدمی جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ مسائل کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

☆ جماعت اسلامی سے آپ کب اور کس طرح وابستہ ہوئے؟

☆☆ 1943ء اور چوالیس میں مولانا مودودی صاحب کی کتاب خطبات کے مطالعہ کے بعد مولانا کی شخصیت اور علمی مقام ومرتبے سے متاثر ہو کر میں جماعت سے وابستہ ہو گیا تھا مگر اُس کا باقاعدہ ممبر نہ تھا۔ تاہم 1950 یا 1951 میں باقاعدہ جماعت کی رکنیت حاصل کی اور اُس وقت سے جماعت سے وابستہ ہوں۔

☆ کیا آپ اُن مراحل کی بابت بتانا پسند کریں گے جن سے گزر کر آپ اس اعلیٰ مقام تک پہنچے؟

☆☆ آپ کس اعلیٰ مقام کی بات کر رہے ہیں؟ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ روزِ اول سے خود کو جماعت کا ادنیٰ کارکن خیال کرتا ہوں اسی جذبے اور سپرٹ سے فعال رہنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔

☆ جماعت اسلامی اپنے کارکنان اور ممبران کو جو اعزاز یہ دیتی ہے اس کی بابت کچھ بتانا پسند کریں گے۔ مثلاً آپ کو کس قدر اعزازیہ ادا کیا جاتا ہے؟

☆☆ جماعت اسلامی کے ممبران اور کارکنان کو کسی قسم کا کوئی اعزازیہ نہیں دیا جاتا نہ مجھے کوئی اعزازیہ کبھی دیا گیا ہے۔ جو لوگ کل وقتی کارکن ہیں اعزازیہ صرف انہیں دیا جاتا ہے۔

☆ مولانا مودودی کے علاوہ آپ کن قومی اور بین الاقوامی شخصیات سے متاثر ہوئے ہیں؟

☆☆ زندگی کے لمبے سفر میں آدمی بہت سے لوگوں سے ملتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ مولانا مودودی کے علاوہ اس وقت حافظے میں مولانا ابوالحسن ندوی کا نام ابھر رہا ہے جن کی دینی خدمات اور علمی استطاعت سے میں متاثر ہوا ہوں۔ سیاسی حوالے سے نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور غیر منتخب حکومتوں کے خلاف جدوجہد میں اُن کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔

☆ مولانا مودودی صاحب کو آپ کس مقام و مرتبہ پر فائز کرتے ہیں؟

☆☆ مولانا مودودی یقیناً بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے دین کا تصور نمایاں کیا۔ جماعت قائم کی تو اس میں بھی دین کی حاکمیت اعلیٰ کو اولیت دی۔ اُن کی کتابوں کے دنیا بھر میں تراجم ہوئے۔ بے شمار شخصیات کو مولانا کی تعلیمات نے متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے اور اُن کی خدمات کو قبول کرے۔

☆ مستقبل کے حوالے سے آپ مولانا مودودی کو کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

☆☆ ظاہر ہے انہوں نے جو دینی اور سیاسی ورثہ چھوڑا ہے اس کی روشنی میں اُن کا مقام اعلیٰ ہے۔

☆ ایک ہی تنہا شخص کس حد تک بطور تحریک کے تحت ملک کی دینی و سیاسی رہنمائی کے ایک سیاسی و دینی جماعت کی بنیاد رکھتا ہے؟

☆☆ اللہ اور رسول کی مدد و رہنمائی نیک مقاصد رکھنے والوں کو ہمیشہ حاصل ہوا کرتی ہے۔ مولانا مودودی کے پیش نظر بھی نیک مقاصد اور تعمیری سوچ تھی اسی لئے انہیں اپنے اللہ اور رسول کی مدد و رہنمائی حاصل تھی۔

☆ ناقدوں کے خیال میں قیام پاکستان کی ناگزیریت کے پیش نظر مخصوص مقاصد کی حامل قوتوں نے مستقبل کے مذہبی و سیاسی خلا کو پُر کرنے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے مولانا کو اس جانب راغب کیا؟

☆☆ جماعت اسلامی کا قیام پاکستان بننے سے بہت پہلے 1941 میں ہوا۔ اگر آپ حقائق کا مطالعہ کریں تو آپ کو علم ہوگا کہ پاکستان جس وقت ناگزیر ہوا تو مفاد پرستوں، سرمایہ داروں اور جاہ طلبوں نے بڑی تعداد میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم بدقسمتی سے انتقال کر گئے اور جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا مسلم لیگ نے اُسے پس پشت ڈال دیا۔ مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈر اسمبلی میں تقریروں کے ذریعہ یہ بات کر رہے تھے کہ پاکستان کے حصول کا مقصد نفاذ اسلام نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ مولانا مودودی نے اس کے خلاف تحریک چلائی جس کے رد عمل میں قرارداد مقاصد 1950ء میں منظور ہوئی۔ یہ بہت جامع اور comprehensive قرارداد ہے جس میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ مولانا کا یہی کارنامہ آپ کے سوال کی نفی کے لئے کافی نہیں کیا؟

☆ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے۔ پاکستان کا قیام معاشی خوشحالی کے لئے تھا یا نفاذ اسلام کے لئے؟

☆☆ سیدھی سی بات ہے اگر مقصد معاشی خوشحالی تھی تو متحدہ ہندوستان کے خوشحال صوبہ یوپی کے لوگ اس تحریک کے روح رواں کیوں ہوئے؟ خوشحالی تو اس خطے میں آنا تھی یا کہ اُن علاقوں میں جہاں پاکستان کی تحریک چلی۔ دراصل اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اگر ایک مسلمان ریاست وجود میں آجاتی ہے اور وہاں قرآن و سنت کا نظام نافذ ہو جاتا ہے تو ایک مضبوط اسلامی ملک کے قیام کے بعد ہندوستان کی اکثریتی آبادی مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی مرتکب نہ ہو گی۔

☆ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی اکثریت باہر کی آشیر باد یا اشارے پر فیصلے کیا کرتی ہیں۔ جماعت اسلامی کی اس حوالے سے پوزیشن کیا ہے؟

☆☆ مجھے آپ کے استدلال سے اتفاق نہیں ہے۔ میرے خیال میں تمام جماعتیں اپنے فیصلے ملک کے اندر ہی کیا کرتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ کسی جماعت کی قیادت پاکستان سے باہر ہو تو وہ اپنی پارٹی کو ہدایت دیتے ہوں جیسے پیپلز پارٹی کی چیئرمین محترمہ بےنظیر بھٹو یا پاکستان مسلم لیگ کے میاں برادران اس کے علاوہ لیفٹ، رائٹ کا نظریاتی جھکاؤ بھی پارٹی کی پالیسیوں میں دکھائی دے سکتا ہے۔ جہاں تک جماعت اسلامی کا سوال ہے تو یہ ایک شورائی جماعت ہے جس کے تمام فیصلے اتفاق رائے سے اجتماعات منعقد کر کے کئے جاتے ہیں۔

☆ جماعت اسلامی کے حوالے سے ایک ناقدانہ تصور یہ ہے کہ جماعت کے بانی مولانا مودودی کو بیرونی عناصر براہ راست مدد یا تعاون پیش کرنے کے بجائے کثیر تعداد میں اُن کی کتب خرید کر مالی تعاون فراہم کیا کرتے تھے؟

☆☆ یہ سراسر الزام ہے۔ اس میں حقیقت کو ذرا بھی دخل نہیں۔ مولانا

مودودی نے سوائے چند کتب کے باقی تمام جماعت کے نام کردی تھیں۔ اُن سے ہونے والی آمدن نہ مولانا مودودی کو جاتی تھی نہ اب اُن کے اہل خانہ کو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مولانا اپنی کتابوں کے پبلشر یا پرنٹر بھی نہ تھے۔ چھاپنے والے اور بیچنے والے دیگر لوگ تھے پھر آپ کس طرح اس قسم کا الزام لگا سکتے ہیں؟

☆ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا ہماری تاریخ کا بڑا سانحہ گردانا جا سکتا ہے۔ جماعت اسلامی بھی اس سانحہ کی کسی قدر ذمہ دار اس سبب ہے کہ 1971ء کے الیکشن میں تمام سیاسی بنگالی قوتوں سے الگ ہو کر الیکشن لڑا اور اس طرح سے مجیب الرحمٰن کو جیت میں بالواسطہ طور پر مدد کی۔

☆☆ اس طرح کا سوال ناواقف شخص ہی کر سکتا ہے۔ اُس وقت کی تمام جماعتیں اپنے اپنے طور پر الیکشن لڑ رہی تھیں۔ بھٹو صاحب نے مشرقی پاکستان میں اپنے اُمیدوار نہ کھڑے کر کے اور مجیب الرحمٰن نے مغربی پاکستان انتخابی حلقوں سے لاتعلقی ظاہر کر کے مغربی پاکستان کی جماعت اور مشرقی پاکستان کی جماعت کا تصور قائم کیا۔ صرف جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جس نے دونوں علاقوں میں بھرپور قوت کے ساتھ الیکشن لڑا۔ مشرقی پاکستان میں تو ہمارے بہت سے اُمیدواروں نے جیتنے والوں کے مقابلے میں مناسب تعداد میں ووٹ بھی لئے۔ مولانا مودودی خود تشریف لے گئے تھے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جلسے سے خطاب کرنے کے لئے مگر بلوائیوں نے ہنگامہ کر کے ہمارے ایک ساتھی کو شہید کر دیا اور مولانا مودودی کو جلسے سے خطاب کئے بغیر ہی واپس لوٹنا پڑا۔

☆ ایک تصور یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے ذاتی نوعیت کی مخاصمت ہے اسی لئے اُنہوں نے بھٹو صاحب کے اقتدار میں آتے ہی دیگر جماعتوں کو ساتھ ملا کر بھٹو صاحب کے خلاف اتحاد بنا لیا؟

☆☆ اس طرح کا سوال بھی کوئی ناواقف شخص ہی کر سکتا ہے۔ اُس وقت سیاسی جماعتوں کے اتحاد میں بلاشبہ جماعت اسلامی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا مگر وہ اتحاد بھٹو صاحب کے خلاف نہیں پاکستان کے آئین کی جدوجہد کے لئے بنا تھا۔

☆ پھر آپ لوگ بھٹو صاحب کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار کیوں ٹھہراتے ہیں؟

☆☆ ہم نے کبھی نام لے کر بھٹو صاحب کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب اور شیخ مجیب الرحمٰن نے الگ الگ صوبوں سے الیکشن لڑ کر اس کی بنیاد فراہم کی۔ ذمہ داری مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی خاص طور پر یحییٰ خان یا اُس وقت کی اعلیٰ فوجی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

☆ آپ یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں جب کہ آپ کے امیر میاں طفیل محمد صاحب اُن سے آئین دینے کی درخواست کر رہے تھے؟

☆☆ دیکھئے! آپ بات کو گڈمڈ کر رہے ہیں۔ میں فوج کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار گردان رہا ہوں نا کہ یحییٰ خان کو۔ جب ایوب کے بعد یحییٰ خان برسرِ اقتدار آجاتے ہیں اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر ملک کا نظام چلانے لگتے ہیں تو اُن سے آئینی اور قانونی نظام کی طرف لوٹنے کی بات نہیں کی جائے گی تو کس سے کی جائے گی۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں جماعت اسلامی مارشل لاء پسند جماعت ہے اسی باعث طفیل محمد صاحب نے دوبارہ ایک اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق سے بھی آئین دینے کی درخواست کی تھی؟

☆☆ آپ بار بار لفظ درخواست استعمال کر رہے ہیں! 1977ء میں ہونے والے الیکشن میں دھاندلی کے باعث تحریک چلی تحریک کے نتیجے میں بھٹو صاحب مذاکرات پر مجبور ہوئے۔ مذاکرات کامیاب بھی ہو گئے تھے چونکہ معاہدہ میں تاخیر ہوئی اور فوج کو پھر سے مارشل لاء لگانے کا موقع مل گیا۔ ملک پھر سے بے آئین ہو گیا تو ایسے میں آئین اور قانون کی بات کرنا کون سا جرم ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ 1977ء کے مذاکرات کی ناکامی کے سلسلے میں نہ صرف پاکستان بلکہ اُمتِ مسلمہ کئی صدی پیچھے چلی گئی ہے؟

☆☆ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا کہ مذاکرات ناکام نہیں ہوئے تھے۔ معاہدہ ہونے میں ضرور چند یوم کی تاخیر ہوئی تھی کیونکہ بھٹو صاحب معاہدہ کی نوک پلک درست کرنا چاہتے تھے۔ فوج چونکہ گھات لگائے بیٹھی تھی کیونکہ وہ بلاواسطہ اور بالواسطہ حکمرانی کو اپنا حق سمجھتی ہے اور سول لوگوں کو اس کا اہل نہیں سمجھتی اس لئے اُنہوں نے مارشل لاء لگا دیا۔

☆ کیا اس سارے عمل میں بیرونی ہاتھ بھی کارفرما تھا؟

☆☆ بیرونی ہاتھ سعودی عرب کا تھا۔ وہ ہمارے معاون کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے اور ہر قیمت پر مذاکرات کامیاب کرانا چاہتے تھے مگر بات پھر وہی ہے کہ اقتدار کی خواہش نے فوج کو مارشل لاء لگانے پر مجبور کر دیا۔ وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ بار بار حکومتی اُمور میں ملوث ہونے سے فوج میں بھی وہی برائیاں در آئیں گی جو سول حکومتوں کے حصے میں آتی رہی ہیں۔ مثلاً عہدوں کا پلاٹ کا پرمٹ کا لالچ۔ اب سول حکمرانوں نے اگر غلطیاں کیں تو اُس کی سزا بھی اُنہوں نے بھگتی۔ بے نظیر صاحبہ ملک سے باہر ہیں۔ نواز شریف صاحب کو پورے خاندان کے ساتھ جلاوطن ہونا پڑا ہے۔ فوجی حکمران یہ نہیں سمجھتے کہ سول حکمرانوں کی غلطی کی سزا اُنہیں خود بھگتنا پڑتی ہے جبکہ فوج کی غلطیوں کے نتیجے میں ملک و قوم کا نقصان ہوتا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں 1977ء کے الیکشن میں واقعی دھاندلی ہوئی تھی ہوئی تھی تو کس پیمانہ پر؟

☆☆ بھٹو صاحب نے خود دھاندلی کے الزام کو درست تسلیم کرتے ہوئے پی این اے کی نشاندہی پر پچاس حلقوں میں دوبارہ الیکشن کی تجویز پیش کی تھی جسے ہم نے تسلیم نہیں کیا اور بھٹو صاحب دوبارہ الیکشن پر آمادہ ہو گئے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ دھاندلی میں نے نہیں میرے کارندوں نے کروائی ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ بھٹو صاحب کے خود ہی دھاندلی کے مرتکب نہ بھی ہوتے تب بھی بھٹو صاحب کو ہٹانے کے لئے کوئی اور جواز تراش لیا جاتا؟

☆☆ بہت مشکل ہوتا! بھٹو صاحب دھاندلی نہ بھی کرتے تب بھی انتخابات میں انہیں اکثریت مل جاتی مگر وہ دوتہائی اکثریت حاصل کرکے آئین میں من مانی تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔

☆ بھٹو صاحب کو دی جانے والی پھانسی کی سزا کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ بھٹو صاحب پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے FIA کے کچھ لوگوں کو یہ حکم دیا ہے کہ فلاں شخص کو ختم کر دو۔ اگر یہ الزام درست بھی ثابت ہوتا تب بھی اُن کو موت کی سزا نہ دی جا سکتی تھی کیونکہ جرم اُن سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ یہ اُن کی پارٹی کی غلطی ہے کہ انہوں نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کو defend نہیں کیا اگر وہ صحیح طور پر بھٹو صاحب کو defend کرتے تو میرے خیال میں پھانسی کا فیصلہ ہرگز نہ ہوتا۔

☆ آپ کے خیال میں انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

☆☆ میرے خیال میں بھٹو صاحب کو یقین تھا کہ انہیں کوئی پھانسی نہیں دے سکتا۔

☆ ضیاالحق کی حکومت میں آپ کی پارٹی کی شمولیت کی بابت آج آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆ ضیاالحق صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ دو مرتبہ انہوں نے الیکشن کا اعلان کرکے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اُس وقت PNA کے صدر مولانا مفتی محمود صاحب حیات تھے۔ ضیاالحق صاحب نے PNA سے کہا کہ میں دو مرتبہ الیکشن کا اعلان کرنے کے باوجود الیکشن نہیں کرا سکا ہوں لہٰذا آپ لوگ مجھے سیاسی سپورٹ فراہم کریں تاکہ میں الیکشن کرانے کے قابل ہو سکوں۔ قومی اتحاد میں اس حوالے سے اختلاف بھی تھا مگر سات ماہ کے طویل مذاکرات کے بعد ضیاالحق صاحب کے ساتھ تحریری معاہدہ طے پایا کہ جیسے ہی ضیاالحق صاحب الیکشن کا اعلان کریں گے ہم لوگ حکومت سے الگ ہو جائیں گے۔ چنانچہ قومی اتحاد نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم فوج سے تو لڑ نہیں سکتے لہٰذا اُسے سیاسی سپورٹ فراہم کرکے الیکشن کے قابل بنایا جائے۔

☆ جماعت اسلامی صالحین کی جماعت تصور کی جاتی ہے جس میں اخلاق و کردار پر بہت زور دیا جاتا ہے جبکہ آپ کی وزارت کے دور میں جماعت اسلامی کے بہت سے کریانہ فروش، کپڑا فروش اور دوا فروش وغیرہ سیمنٹ کی ایجنسیاں لے کر بیٹھ گئے تھے۔

☆☆ پاکستان کو بنے ستاون سال ہو گئے۔ ہم پر غداری کا الزام لگا بیرونی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا پاکستان کی مخالفت اور کئی طرح کے الزام میں ہمیں جیلوں میں ٹھونسا گیا مگر کسی حکومت کو ہم پر کرپشن کا الزام لگانے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ ہم حکومت میں بھی رہے اپوزیشن میں بھی رہے سینٹ میں بھی رہے صوبائی اسمبلیوں میں بھی رہے مگر کرپشن سے ہمیشہ دور رہے۔ میں جماعت اسلامی کو صالحین کی جماعت نہیں کہتا ہم لوگ عام انسان ہیں مگر خدا کا ہم پر خاص کرم ہے کہ نیب کی فائلوں میں آپ کو ہر جماعت کا کارکن یا لیڈر مل جائے گا جماعت اسلامی کا ایک فرد بھی اُس میں شامل نہیں ہے آپ جس دور کی سیمنٹ ایجنسیوں کی بات کر رہے ہیں میں نے تو خود اُس دور میں ایجنسیاں کینسل کی تھیں اگر آپ جماعت اسلامی کے ایک بھی کارکن کے خلاف ثبوت پیش کر دیں تو اُسے فوری طور پر جماعت سے الگ کر دیا جائے گا۔

☆ قاضی حسین احمد صاحب کی امارت کے دور میں نعرہ بازی کی سیاست سے جماعت کا اصل مزاج مجروح نہیں ہو گیا۔ آپ اُن کے حامیوں میں شامل ہوتے ہیں یا ناقدین میں؟

☆☆ قاضی حسین احمد صاحب جماعت اسلامی پاکستان کے امیر ہیں ڈکٹیٹر ہرگز نہیں۔ ہماری جماعت شورائی جماعت ہے۔ تمام فیصلے بحث و تمحیص کے بعد اتفاق رائے سے کئے جاتے ہیں لہٰذا حمایتی یا ناقد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے امیر ہیں اور قابل احترام ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے مولانا مودودی صاحب، میاں طفیل محمد صاحب کا اپنا مزاج تھا قاضی حسین احمد کا اپنا مزاج ہے۔ کچھ وقت اور حالات کا بھی ہوا کرتا ہے۔

☆ آپ جس قدر سینئر اور تجربہ کار راہنما ہیں آپ کی جماعت اُس قدر آپ کی صلاحیتوں سے مستفید نہیں ہو رہی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ خود کنارہ کش ہو رہے ہیں یا کئے جا رہے ہیں؟

☆☆ نہ میں کنارہ کش ہوا ہوں نہ کیا جا رہا ہوں ہر آدمی کی کام کرنے کی ایک عمر ہوتی ہے میری عمر اور صحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ مجھے جماعت اسلامی کا نائب امیر بھی نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ نئے لوگ پُر کرتے ہیں۔ میری بھی خواہش ہے کہ نئے لوگ آگے آئیں اور زیادہ بہتر انداز میں ذمہ داریاں نبھائیں۔

☆ متحدہ قومی موومنٹ کا قیام بھی جماعت اسلامی کی ناکامی سے تعبیر کیا جا رہا ہے؟

☆☆ ایم کیو ایم کہیئے!! اس کے قیام میں ہماری کامیابی یا ناکامی کا دخل کہاں سے آ گیا۔ وہ تو ضیاالحق صاحب یا فوج کی پیداوار ہیں۔ اُن کی سوچ یہ تھی کہ اس طرح کی علاقائی جماعتوں کی موجودگی میں قومی سیاسی جماعتوں کا زور توڑا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایم کیو ایم کی تشکیل کی تھی۔

☆ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کراچی کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی تبھی لوگ جوق در جوق ایم کیو ایم کے ساتھ شامل ہو گئے؟

☆☆ مجھے اعتراف ہے کہ کراچی کے عوام کے روزگار، صحت، مقامی تعلیم اور رہائش کے مسائل واقعی حل نہیں ہوئے جس کے باعث وہاں کے عوام کی اکثریت میں غیر دو شہری ہونے کا احساس نمایاں ہوا۔ جس قدر لوگ وہاں ہجرت کر کے آئے اُس قدر وسائل پیدا نہیں ہوئے مگر الزام جماعت اسلامی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ ہم کس طرح حل کرتے کراچی کے مسائل؟ 1971 کے الیکشن میں ہمیں قومی اسمبلی کی صرف دو سیٹوں پر کامیابی ملی تھی۔ 1977 میں بھی ہم وہاں اکثریت میں نہ تھے نہ کبھی سندھ کی صوبائی اسمبلی میں ہماری اکثریت رہی اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ جماعت اسلامی نے کبھی لسانی جذبات کی سیاست نہیں کی جب کہ ایم کیو ایم نے آتے ہی کراچی کے عوام کے دلوں میں سندھ اور پنجاب کے لوگوں کے خلاف نفرت بھرنا شروع کر دی کہ یہ لوگ تمہارے حقوق غصب کر رہے ہیں لہٰذا آپ لوگ متحد ہو جاؤ۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اُن کے ساتھ نوے فیصد سے بھی زائد لوگوں کی اکثریت شامل ہو گئی مگر اس جماعت کے بدلے انہیں کیا ملا سوائے بدامنی، کلاشنکوف کلچر، بوری بند لاشیں! آج بھی اگر آپ اخبار اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو معصوم نوجوانوں کے قتل کی خبریں ملیں گی۔ پچیس ہزار سے زائد نوجوان ایم کیو ایم بننے کے بعد سے قتل ہو چکے ہیں جن کے الگ قبرستان بن رہے ہیں۔ یہ لوگ حکومتوں میں شامل ہو کر فائدے اٹھا رہے ہیں عوام کے مسائل جوں کے توں ہیں بلکہ کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔

☆ آپ کے خیال میں ایم کیو ایم سیاسی پارٹی ہے یہ پریشر گروپ ہے یا کوئی لابی ہے؟

☆☆ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں! آج کے اخبارات میں آپ الطاف حسین صاحب کا بیان پڑھیے۔ جو انہوں نے لندن جا کر دیا ہے کہ دو قومی نظریہ باطل تھا۔ پاکستان بنانا وقت کی بہت بڑی غلطی تھی یہ نہیں بنانا چاہئے تھا۔ کوئی اور اس قسم کا بیان دیتا تو فوری طور پر اُسے گرفتار کر کے پھانسی چڑھا دیا جاتا جب کہ گورنر سندھ تحریر یہ کہتے ہیں کہ الطاف حسین صاحب فیڈرل گورنمنٹ کی رضامندی سے لندن گئے ہیں۔

☆ الطاف حسین صاحب کو بھارت میں سفیر بنانے کی جو باتیں ہو رہی ہیں آپ کا اُن کے بارے کیا خیال ہے؟

☆☆ سفیر ہی بن کر گئے تھے تبھی تو انہوں نے وہاں جا کر یہ بیان دینا مناسب سمجھا۔ حکومت کے کسی آدمی نے آج تک اس قسم کی بات نہیں کی۔

☆ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کسی اور کی زبان بول رہے تھے؟

☆☆ کچھ بھی ہو اصل بات یہ ہے کہ ایم کیو ایم حکومت سے اپنی سپورٹ واپس لے لے تو اُسے مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ مرکزی اور سندھ کی صوبائی حکومتیں ٹوٹ سکتی ہیں۔ اس لئے اُن کی جانب سے دانستہ چشم پوشی کی جا رہی ہے۔

☆ مہاجر کمیونٹی پر لگنے والے اس الزام کی بابت آپ کی کیا رائے ہے کہ انہوں نے سرزمین سندھ کو مستقل مسکن بنانے کے باوجود وہاں کی زبان اور کلچر کو نہیں اپنایا۔

☆☆ دیکھئے! ہوتا یوں ہے کہ اکثریت کی زبان اور کلچر ہمیشہ dominate ہوا کرتا ہے۔ اندرون سندھ میں بسنے والے مہاجر عموماً سندھی بولتے اور پڑھتے ہیں۔ سندھی کلچر کو اپنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ کراچی میں چونکہ مہاجر آبادی کی تعداد زیادہ ہے اس لئے یہاں بسنے والے سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان روانی سے اردو بولتے ہیں۔ میرے خیال میں اب یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے۔

☆ ایک اعتراض مہاجروں کی آمد اور آبادکاری کے حوالے سے بھی اٹھایا جاتا ہے کہ 1951، 1952 یا 1954 تک آنے والے قانونی شہری ہیں باقی سب غیر قانونی؟

☆☆ پرانی بات ہے جب انڈیا کے مسلمان پاکستان کی طرف دیکھا کرتے تھے یا یہاں آنے کی بابت سوچتے تھے۔ اب انڈیا کے مسلمانوں نے پاکستان کی جانب دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم نے یہیں رہنا ہے اور یہیں مرنا اور جینا ہے۔ اور یہیں رہ کر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے۔

☆ بڑی ردوقدح کے بعد آپ نے حکومت سے مشرف صاحب کی وردی کا فیصلہ منوایا۔ آپ کی صفوں میں پیدا ہونے والے انتشار سے یہ فیصلہ متاثر نہیں ہوگا؟

☆☆ دیکھئے! ایک گھر، ایک خاندان میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں بھی اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ متحدہ مجلس عمل میں تو چھ پارٹیاں شامل ہیں۔ سمیع الحق صاحب نے باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ متحدہ مجلس عمل سے الگ ہو چکے ہیں۔ ساجد میر صاحب پچھلی میٹنگ میں شریک تھے لہٰذا وردی کا فیصلہ ماننا یا نہ ماننا اُن کے ذاتی اختیار میں ہے۔ ہماری صفوں کے

اتحادیا اشتراک سے اس کا قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ کیا سمیع الحق صاحب حکومتی دباؤ پر الگ ہوئے ہیں متحدہ مجلس عمل سے؟

☆☆ میرا یہ مزاج نہیں ہے کہ کسی پر انگلی اٹھاؤں۔ مجھ پر کیوں نہیں ذاتی حکومت دباؤ؟ ہر کسی کا ذوقی فیصلہ اُس کی ذوقی ترجیحات کے تحت ہوتا ہے متحدہ مجلس عمل میں اتفاق بھی ہوتا ہے اور اختلاف بھی فیصلے بہرحال متفقہ طور پر کئے جاتے ہیں۔

☆ حکومت کی بی ٹیم ہونے کا الزام بھی لگتا ہے آپ لوگوں پر؟

☆☆ ابھی بڑا Crucial فیصلہ تھا سیکورٹی کونسل میں شرکت اور عدم شرکت کا۔ حالانکہ یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ مرکزی حکومت صوبہ سرحد میں گورنر راج نافذ نہ کر دے مگر ہم نے اجتماعی طور پر شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا اس کے باوجود بھی آپ اس قسم کا الزام عائد کریں تو افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

☆ ایک رائے یہ بھی ہے کہ جب بھی حکومت کے گول چلاؤ کا وقت آتا ہے متحدہ مجلس عمل حکومت کے خلاف متحرک ہو جاتی ہے؟

☆☆ کہاں آیا ہے حکومت کے گول چلاؤ کا وقت؟ انہوں نے تو 2007 تک خود کو منتخب صدر بھی بنالیا ہے اور پوری فوج اُن کے ساتھ ہے۔

☆ آپ کے خیال میں مشرف صاحب یہ مدت اقتدار پوری کریں گے؟

☆☆ مجھے غیب کا علم نہیں ہے البتہ! کسی ادارے نے سروے کرایا ہے جس میں مشرف صاحب کے حامیوں کی تعداد ملک کی آبادی کا ایک فیصد بتلائی گئی ہے تاریخ کے سب سے غیر مقبول صدر ہیں مشرف صاحب ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی برسر اقتدار ہوتا ہے تو اُسے وقت کے مزاج کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا وہ سوچتا ہے کہ میں ساری عمر اقتدار میں رہوں گا۔ ایوب خان ان سے اچھے حالات میں تھے اُن کے دور میں کسی قدر ترقی بھی ہوئی تھی۔ صنعت اور ڈیم بھی قائم ہوئے تھے مگر جب وہ نامقبول ہوئے تو انہیں چھوڑ کے جانا پڑا۔

☆ یہ یک وقت ہندوستان اور پاکستان میں ماہر اقتصادیات کا وزیراعظم بن جانا کس بات کی دلیل ہے؟

☆☆ میرے خیال میں شوکت عزیز بہتر انسان ہیں۔ اچھے وزیر خزانہ کے طور پر تسلیم کئے جاتے تھے مگر نوے دنوں میں انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے اہم کہا جائے حالانکہ کسی بھی حکمران کے لئے نوے دن کافی اہم ہوتے ہیں۔ ہر حکومت اس عرصہ میں کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دینا چاہتی ہے میرے خیال میں کوئی بہت مضبوط لابی انہیں ناکام بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

☆ وہ لابی اندرون ملک میں ہے یا بیرون ملک؟

☆☆ ظاہر ہے اندرون ملک کی لابی ہی ہو سکتی ہے۔ بیوروکریسی بھی شاید انہیں کامیاب نہ دیکھنا چاہتی ہو!

☆ سول بیوروکریسی یا خاکی؟

☆☆ اس وقت ملک میں سول بیوروکریسی کے بائیس گریڈ کے افسران اور فوجی جرنیل مل کر ملک پر حکومت کر رہے ہیں لہٰذا کسی ایک کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

☆ فوجی حکومت کے مستقبل کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆ میرے خیال میں فوج کے لئے اب مارشل لاء لگانا مشکل ہے مارشل لاء لگائیں گے تو 1971ء والے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ دہشت گردی کا مسئلہ ان سے حل نہیں ہو رہا اور بہت سے مسائل حل طلب ہیں لہٰذا فوج سے سول اقتدار ختم ہونا چاہئے۔ آپ دیکھیں بیشتر سول عہدوں پر ریٹائرڈ یا حاضر فوجی نظر آ رہے ہیں۔ ہر طرف پلاٹوں، مکانوں اور پلازوں کی خرید و فروخت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ پیسے کا بھوت سب کے سروں پر سوار ہے میں نفرت کا لفظ استعمال نہیں کروں گا البتہ! عوام کو اپنی فوج سے پہلے جیسی عقیدت اور محبت اب نہیں ہے اور یہ کوئی نیک شگون نہیں۔

☆ اندرون ملک اور بیرون ملک فوج کے اندر ڈاؤن سائزنگ کی باتیں ہو رہی ہیں آپ کا نقطہ نظر اس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ فوج کو ایک بات جان لینا چاہئے! اُس کا کام ملک کا دفاع کرنا ہے ملک پر حکومت کرنا نہیں۔ فوج جتنا بجٹ چاہے ہم دینے کو تیار ہیں۔ ہم کبھی فوج میں کمی یا کٹوتی کے حامی نہیں ہوں گے۔ ہندوستان کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے اس کے باوجود اس نے ہماری فوج کے برابر فوج صرف کشمیر میں جھونکی ہوئی ہے اس لئے ہمارا نقطہ نظر اس حوالے سے بالکل صاف ہے۔

☆ ہر دور میں اسمبلیوں کی بابت عوام کا بڑا طبقہ تحفظات کا اظہار کرتا رہا ہے موجودہ اسمبلیوں کو واضح طور پر ربڑ اسٹمپ سے تشبیہہ دی جا رہی ہے اس صورت حال میں اسمبلیوں کا وجود قومی خزانے پر بار نہیں؟

☆☆ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں واقعی بار ہے کوئی کام نہیں کر رہیں موجودہ اسمبلیاں کورم پورا کرنا حکومت کا کام ہے اس کے باوجود آج کے اجلاس میں کورم پورا نہ ہونے کے باوجود ISI سے متعلق بل منظور کرا لیا گیا اور اپوزیشن کو تو کام بالکل ہی نہیں کرنے دیتے حالانکہ مراعات اتنا سے زیادہ بڑھا دی ہیں سہولیات کا ڈھیر لگا دیا ہے کام نہیں ہوتا۔

☆ یہی الزام حکومت اپوزیشن پر لگاتی ہے کہ یہ ہمیں قانون سازی نہیں کرنے دیتے!

☆☆ ہم کیسے روک سکتے ہیں انہیں! اکثریت اُن کے پاس ہے کورم پورا کرنے کے لئے مگر آج کے اجلاس میں کم از کم پچیس ممبر کی تعداد کے بجائے بارہ ممبر کی موجودگی میں بل منظور کرا لیا گیا۔

☆ اس بل کی آپ کے خیال میں کیا قانونی حیثیت ہوگی؟

☆☆ Absolute Un-constitutional ہے مگر کون مانے گا یہاں؟ کون سی عدالت ہے جس میں جا کر آپ انصاف حاصل کر سکتے ہیں اسی لئے میں کہتا ہوں کہ موجودہ پارلیمنٹ کوئی کام نہیں کر رہی۔

☆ آپ کے دور سینیٹری میں کس قدر قانون سازی ہوئی اور آپ اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

☆☆ قانون سازی تو ہوتی ہے مگر عوام کی بہبود کے لئے نہیں ان کا اختیار بڑھانے کے لئے ہوتی ہے۔ آج جو بل منظور ہوا ہے اس میں یہ شامل ہے کہ پہلے ISI آرمی کے آدمی خود سلیکٹ کیا کرتی تھی اور اس سے منسلک سول لوگ پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ اس بل کے ذریعہ یہ اختیار حاصل کیا گیا ہے کہ سول کے لوگ بھی آرمی ہی منتخب کیا کرے گی۔ ISI کا کیا کردار ہے؟ آپ بار بار خفیہ ہاتھ کی بابت دریافت کر رہے ہیں آپ کو کیا بتلاؤں کہ وہ ہاتھ اتنا ہی دست دراز ہے جو سیاسی پارٹیوں کے جوڑ توڑ اور الیکشن کے فیصلوں تک پر اثر انداز ہوتا ہے۔

☆ جس قدر ہمارا معاشرہ زوال پذیر ہو چکا ہے اس قدر ہم پستی کی جانب جا رہے ہیں کوئی صورت اصلاح احوال کی نظر آتی ہے؟

☆☆ فی الحال تو نظر نہیں آتی۔ اسلامی معاشرہ میں جن جرائم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہ ہمارے ہاں عام ہیں۔ آج ہی کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے! ایک شخص نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ زہر پی کر صرف اس لئے خودکشی کر لی کہ وہ اپنی قلیل آمدنی میں بنیادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر تھا۔ دہشت گردی، لاقانونیت، حکومت کی سختیاں، جمہوری کلچر کا فقدان، معاشی عدم مساوات، عریانی، فحاشی، بھارتی فلموں کی یلغار آپ دیکھیں گے کہ سب کچھ On slaught ہو رہا ہے مگر میں اس سب کے باوجود مایوس ہرگز نہیں ہوں۔ حالات میں یقیناً تبدیلی آئے گی۔ اچھے اور دیندار لوگ بھی یقیناً آگے آئیں گے۔ گزشتہ رمضان میں میرے لئے مساجد کا پہلے سے زیادہ بھرا ہونا جوانوں کی اکثریت کا اعتکاف میں بیٹھنا امید کی دلیل ہے۔

☆ کس جماعت یا طبقے سے بہتری کی امید باندھی جا سکتی ہے؟

☆☆ میں یہاں کسی جماعت کا نام نہیں بتا سکتا آپ کو البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بے لوث اور باکردار لوگوں سے ہی توقعات قائم ہوا کرتی ہیں۔ ہر جماعت میں اچھے لوگ کسی نہ کسی تعداد میں موجود ہیں۔ الحمدللہ! جماعت اسلامی اس حوالے سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہے۔ جماعت اسلامی اس قدر بڑی جماعت نہیں ہے کہ پورے ملک میں کسی اہم تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکے۔ متحدہ مجلس عمل بھی صرف ایک صوبہ میں اکثریت رکھتی ہے مگر مجھے امید ہے کہ آمدہ الیکشن میں پچھلے الیکشن کے مقابلے ہم بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں گے۔

☆ آپ کے خیال میں نئے الیکشن کب تک متوقع ہیں؟

☆☆ عموماً طور پر ایک اسمبلی کا دورانیہ پانچ سال ہوا کرتا ہے۔ 2002 میں الیکشن ہوئے تھے اس کا مطلب ہے اگلے الیکشن 2007 میں ہونا چاہئیں مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ اسمبلیاں چلنے والی نہیں ہیں۔ یہاں کسی کو کام کرنے نہیں دیا جاتا نہ قومی اسمبلیوں کو نہ صوبائی اسمبلیوں کو۔ ہر طرف دھونس دھاندلی کا راج ہے اپوزیشن کو split کیا جا رہا ہے عوام میں بے چینی پھیل رہی ہے اس کی بنا پر کوئی بھی mishap ہو سکتا ہے۔ مثلاً آرمی کوشش کر سکتی ہے۔ مشرف صاحب نے کہا تھا کہ نیشنل سیکورٹی کونسل مارشل لاء کو روکنے کا ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ذہن میں مارشل لاء کا لفظ ابھی بھی محفوظ ہے۔ مشرف صاحب کے پاس اختیار موجود ہے وہ جب چاہیں اسمبلیاں توڑ سکتے ہیں۔

☆ موجودہ قومی و بین الاقوامی ملکی منظر میں ایک بار پھر آمریت کی گلی میں جانے کا رسک لیا جا سکتا ہے؟

☆☆ خدانخواستہ ایسا ہوا تو وہ مشرف صاحب کے ہاتھوں ہرگز نہ ہوگا۔ ایسا کرنے والے کوئی اور ہوں گے۔ ایک طرح سے وہ اقدام مشرف صاحب کے خلاف ہوگا۔

☆ پاک بھارت مذاکرات کا اونٹ آپ کے خیال میں کس کروٹ بیٹھے گا؟

☆☆ ہماری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار ہوں مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آپ بنیادی معاملات پر یکسو نہ ہو جائیں۔ آپ تجارت، صنعت، ثقافت اور کھلاڑیوں کے وفود کا جتنا مرضی تبادلہ کر لیں اصل مسئلہ حل ہونے تک پیش رفت مشکل ہے۔ گزشتہ دنوں بھارت کے وزیراعظم نے کشمیر کا دورہ کیا تو وہاں مکمل ہڑتال تھی۔ پاکستان نے جا کر تو نہیں کی تھی وہاں ہڑتال؟ اس لئے پاکستان کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کشمیر کے لوگوں نے بھارتی حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے Package کو بھی یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ہمیں نہیں چاہئے آپ کا Package ہمیں آپ ہمارے حقوق دیجئے! اپنے معاملات ہم خود حل کر لیں گے۔

☆ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ موجودہ مذاکرات میں اس مسئلے کے حل ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں بھارت کی آبادی کا ایک بڑا طبقہ اس بات کا حامی ہے کہ زور اور جبر کے ذریعے کشمیر کو زیادہ دیر ساتھ نہیں رکھا جا سکتا اگر اس طبقہ کا بھارتی حکومت پر دباؤ بڑھے گا تو بھارتی حکومت کو ہٹ دھرمی والی پالیسی کو بدلنا پڑے گا۔

☆ آپ کشمیر کے تنازعہ کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

☆☆ ایک ہی حل ہے کہ کشمیر کے لوگوں کو اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے اور

اپنی رائے دینے کا موقع فراہم کیا جانا چاہئے۔ ہم اصل فریق نہیں ہیں ہمارے مفادات منسلک ہیں مگر فیصلے کا اختیار کشمیریوں کے ہی پاس ہے۔

☆ اُمتِ مسلمہ کے خلاف جاری آپریشن کلین اپ کے نتائج کیا دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان ممالک ماسوائے کے قریب ہیں مشکل سے چند ہی ایسے ہوں گے جہاں منتخب حکومتیں ہیں ورنہ بادشاہت اور آمریت ہے باقی تمام ممالک میں۔ اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ عوام کی سوچ اور طرح کی ہوتی ہے حکمران اور طرح سوچ رہے ہوتے ہیں۔ یہ Rift ہے جس نے مسلمانوں کو کمزور کردیا ہے اگر ہمارے درمیان کا یہ فرق ختم ہو جائے تو ہم اتنی بڑی قوت بن سکتے ہیں کہ کسی کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔

☆ ہمارے سوال کا تعلق خصوصیت سے عراق اور افغانستان کی ہم جوئی سے ہے؟

☆☆ میں نے کہا!! عوام اور حکومتیں الگ الگ ہیں اس لئے کوئی منظم آواز نہیں اٹھ رہی۔ عراق پر ظلم ہو رہا ہے سب خاموش ہیں۔ افغانستان پر ظلم ہو رہا ہے کوئی نہیں بول رہا۔ یہ سب ہماری صفوں کے انتشار کے باعث ہے مگر آپ دیکھیں کہ اب صورت حال پہلے جیسی نہیں ہے۔ جن ممالک میں بہت سخت آمریت ہوا کرتی تھی وہاں بھی عوام کا موڈ بدل رہا ہے۔ تبدیلی یقیناً آئے گی۔

☆ آپ اس کا منطقی انجام کیا دیکھتے ہیں؟

☆☆ عوام کی بیداری کے تحت حکومتوں کو اپنا رویہ بدلنا پڑے گا ورنہ وہ خود تبدیل ہو جائیں گی اور اس تبدیلی کی شکل میں بہتری کی صورت حال پیدا ہو گی۔

☆ اندازاً کب تک اس قسم کی تبدیلی کے آثار ہیں؟

☆☆ وقت کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا البتہ یہ بات یقینی ہے کہ عوام کی سوچ کا دھارا بدل رہا ہے آپ دیکھئے!! امریکہ کو آزاد ہوئے تقریباً ڈھائی سو سال ہونے کو ہیں ہمیں تو صرف نصف صدی ہوئی ہے آزاد ہوئے۔ پوری مسلم دنیا کو آزادی ملے ایک صدی بھی نہیں گذری۔ جوں جوں وقت گذرے گا عوام کی سوچ کے تحت پالیسی بدلے گی یا حکمران بدلیں گے اسی کے نتیجے میں حالات میں بھی تبدیلی آئے گی۔ انشا اللہ تعالیٰ۔

# رس رابطے

جستجو تیرے دم تک ہی..... اعجاز کھوکھر

میرے گلزار جاوید خوش رہو!

زہے عنایت..... "دلِ مضطرب تھا مشتاقانہ" ہے خوب

منعجبا! تحریر کی کس طرح داد دی جائے؟

'چہار سو' کا تازہ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۹ء باصرہ نواز ہوا۔ دل خوش ہو گیا۔ قرطاسِ اعزاز پر بلند کار گجرال صاحب غضب ڈھا رہے ہیں۔ ایسے اُردو ہمدرد جو ہر کسی کے دل میں بستے ہیں۔ گلزار بھائی جوہر تلاش کرنے میں آپ کا جواب نہیں۔ عزیز قیصر الجعفری کی حمد و نعت بھی خوب ہے۔

بیدل کا درد ہے' گجرال کا قصیدہ نہیں ۔ کہ ذاتیات پرستی میرا عقیدہ نہیں

ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا۔

چھلک رہا ہے مروت کا درد آنکھوں میں ۔ کسک رہا ہو گا بھی تیرا زخم جاں جیسے

گجرال صاحب کا مضمون "سرفروشی کے انداز بدلے گئے" ماضی کے زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ انشائیہ بھی پسند آیا۔ آپ کے سوالوں کے اُن کے صاف صاف اور کھرے جواب بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ اُن کا چاہنے والوں کے لئے خطاب:

اِس محفلِ کیف و مستی میں' اِس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے' ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کا مضمون "موجودہ دور کے نمبر وَن" بہت اچھا ہے۔ اُردو والوں کو اور ہندوستان کو اُن پر ناز ہے۔ اِک جشنِ گل' ناگ صاحب کا اور کلدیپ نیر صاحب کا مضمون بھی اچھے لگے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب تو اُن پر اِس طرح فریفتہ ہیں کہ اُن کی تعریف کرتے تھکتے ہی نہیں۔ میں اُن کے ہمراہ گجرال صاحب کے بہارانی باغ کے مکان پر گیا تھا جب ۱۹۸۴ء کے فسادات ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میری بیوی سردار خاندان سے ہے اور میں کھتری خاندان سے اور اسی طرح باقی لوگ بھی بٹے ہیں۔ یہ الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر ہر کسی کی اپنی سوچ ہے۔ اب نثر میں وقار جاوید نے خوب محنت سے لکھے سارے خطوط اکٹھے کر لئے۔ جن میں امرا ہیں۔

سنگ تراش پتھر کو تراش کر خوبصورت مورتیاں' مجسمے تیار کرتے ہیں کہ روح پھونکنے کی دیر ہے۔ اسی طرح بولنے کو تیار بیٹھے ہوں۔ میرے تراشنے کا فن بھی اپنی جگہ خوب ہے مگر میرے بھائی آپ نے اس مرتبہ ایک ایسے ادیب و شاعر کو تراشا ہے جو آج تک اپنے ہی تک محدود رہا ہے اور ایسے سخن سرایاں میں انتخاب کیا کہ میں از خود بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ الغرض اُردو کو شامل کر کے آپ نے اچھا کام کیا ہے۔ "میری عدم مری دمساز" کا انتخاب بہترین ہے۔ انتخاب بے حد پسند آیا۔ آپ نے افسانے کا بھی وہ انتخاب کیا جو آج سے ۵۵ پچپن سال پہلے لکھا۔ پڑھ کر وہ دن یاد آ گئے۔ آراء پلکوں پر روشن دیئے۔ مصطفیٰ ملک صاحب کا اچھا لگا۔ آپ نے اپنی فہرست میں ایک اور غلام شامل کر لیا۔ بھئی کمال کرتے ہو۔ تاہو لے جاؤ گے اِس بلندی کا تو میں (جو اپنے کو اپنے آپ تک ہی محدود رکھتا آیا ہوں) سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں اور تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اور حصہ نظم و نثر سے مشکور حسین یاد صاحب کی غزل اچھی لگی

کون ہے بات زباں پہ لائے ۔ کون ہے پوری رات جلائے
حرف کی حرمت تو جاوی ہے ۔ ہجر وقت الگ ہے کھڑی

باقی غزلیات بھی خوب ہیں۔ افسانہ "زندہ باد" مشتاق احمد کا پسند آیا۔ ڈاکٹر عمران مشتاق کا "مانگے کی انا" اچھا ہے۔ اور آپ کا "راون کی لنکا" آپ کب تک اِن حاکم وقت تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کریں گے یہ سیاست دان نیرو دکوں میں "گھنیا تم" کے لوگوں پر مشتمل ہیں۔ اِن کی کھال اتنی موٹی ہے کہ اِن کو لوگوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں۔ اِن کے سینے میں دل نہیں۔ آپ کوئی اچھا سا کام کریں ان کو کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے طرزِ تحریر خوب اپنایا ہے۔ کہانی کی روش میں بیچاروں کو خوب تو لتاڑ دیا۔

ستیہ پال آنند صاحب کی نظم "کہاں کھویا در بچہ ہے" پسند آئی۔ رفعت سروش صاحب کی "اگر یہ زندگی ہے" میری اپنی سوچوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مجھے تو اِس لئے پسند آنا ہی تھی۔ بیجا مرزا صاحب کی نظم "اپنی تہذیب کی تلاش" پسند آئی۔

پد ما سچدیو کا مضمون "ناطی دے او طے مہر کے" ترجمہ نورجہاں ثروت پسند آیا۔ اِس میں یہ فقرہ اپنا جواب آپ ہے "یہ تو بالکل ہی نہیں لگ رہا کہ ہم کسی دوسرے ملک میں آ گئے ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ماں نے اپنی گود میں سے اُٹھا کر پڑوسن کی جھولی میں ڈال دیا ہو۔ اور اس میں سے یہ شعر:

دو جیب بھی جنت کدہ بھی کعبہ بھی ۔ یہ دیکھنا ہے کہ سکوں اب کہاں ملتا ہے

اچھا لگا۔

اِس مرتبہ کا "چہار سُو" اس سے پہلے شماروں سے سبقت لے گیا۔ میری جانب سے مبارکباد قبول کریں۔

(ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ)

برادرِ محترم جناب گلزار جاوید صاحب السلام علیکم۔

گوہر نایاب تلاشنے اور تراشنے کی جستجو میں آخر کار آپ نے گجرال صاحب کو بھی نہیں چھوڑا اور چھوڑتے بھی کیوں' سید ضمیر جعفری اور جہلم سے منسوب جو ہوئے۔ گجرال صاحب کے مضامین اور گجرال صاحب پر مضامین سو فیصد خوب لطف دے رہے ہیں..... زندہ باد..... شاباش۔

(مشکور حسین یاد)

برادرِ گرامی گلزار جاوید صاحب۔ تسلیم!

چہار سُو کا نومبر/دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ قرطاسِ احترام جناب اندر کمار گجرال کے نام پیش کر کے آپ نے ایک بہت مفید بلکہ تاریخی کام انجام دیا ہے۔ گجرال صاحب نہ صرف ملک کے موجودہ دانشوروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ جواہر لال نہرو کے بعد وہ ہندوستان کے شریف ترین سیاستدان ہیں جن کا دامن ہر قسم کے داغ دھبوں سے قطعی پاک و صاف ہے۔ میں ان کی عظمت و شرافت اور اردو زبان و ادب سے ان کی محبت کو سلام کرتا ہوں۔

فیض کی شخصیت کے بارے میں ان کا دلچسپ خاکہ میں نے پہلی بار پڑھا اور بے حد محظوظ ہوا۔ آپ کا انٹرویو اور دیگر ادیبوں کے مضامین بھی پڑھنے کے لائق ہیں لیکن قیصر الجعفری (مرحوم) کی نظم "عہدِ منافقت" بڑی موثر اور دلکش نظم ہے۔ اتنی خوبصورت اور بہترین الفاظ والی ایک سے بڑھ کر نظم خود قیصر الجعفری کی بھی ایک یادگار نظم کے طور پر زندہ رہے گی۔ گجرال کمیٹی کے بارے میں ظلِ انجم کا مضمون ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے اس کمیٹی کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کر کے ایک قابلِ قدر کام کیا ہے جو آئندہ زمانوں میں اردو کا مقدمہ لکھنے والوں کے لئے ایک معتبر حوالہ ثابت ہو گا۔ قرطاسِ احترام سے ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ مشکور حسین یاد نے نامانوس ردیف اور نامانوس بحر میں کتنے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ میں تو حیرت زدہ ہو گیا۔ قیصر تمکین صاحب کے کلماتِ تحسین کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

(نامی انصاری)

پیارے گلزار جاوید! السلام علیکم۔

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ آپ نے واقعی ایک نیا رجحان Trend دیا ہے جو کہ مقبول ہو رہا ہے اور آپ کے حسنِ ادارت کی دھاک بیٹھ رہی ہے۔ اُمید ہے آپ اور آپ کے عزیز و اقارب خیریت سے ہوں گے۔ اداسی دن بدن گہری ہو رہی ہے۔ سوگ کا موسم دلوں کو گھیرنے لگا ہے۔ حواس جواب دینے لگے ہیں اعصاب شل ہوتے جا رہے ہیں۔ فرازِ کوہ سے نشیبِ بحر تک غیرت کا تانا بانا ہے اور جبینوں سے ندامت قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے۔ میرے وطن میرے ملک میری سرزمین کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ یہ وقتِ دعا ہے جو لقمۂ اجل بنے ان کے لئے اللہ ان کی مغفرت فرمائے (آمین)۔ یہ وقتِ دعا ہے جو ہنوز گرفتارِ بلا ہیں اللہ ان کی دستگیری فرمائے۔ یہ وقتِ دعا ہے جن کے دل زخمی ہوئے ان کے لئے رب رحیم و کریم ان کے دلوں پر مرہمِ رحمت لگائے۔ آمین۔ آپ کا ایک سوگوار بھائی۔

(اسلم کمال)

پیارے بھائی گلزار جاوید خوش رہیے!

میں نے چند روز پیشتر "تھیں رنگیں بابو" کے ہندی ترجمے کی کتاب بھی آپ کو بھجوائی تھی۔ اُمید ہے مل گئی ہو گی۔ آپ تو ہندی بخوبی پڑھ لیتے ہیں مگر میں دیوناگری لپی رک رک کر ہی پڑھ پاتا ہوں۔ آپ کی چٹھی کا جواب بھیجنے میں اس لئے تاخیر واقع ہو گئی ہے کہ سوچا آپ کی فرمائش پوری کرنے کے قابل ہو جاؤں تو لکھوں...... لیجئے "چہار سُو" کے لئے "قیاس" ہو لی ہے۔ حاضر ہے اتنی بے ساختہ اور سبک ہے کہ لگتا ہے خود آپ ہی اپنے آپ کو لکھ گئی ہے۔ ملنے پر مطلع کر سکیں تو میرا اطمینان ہو جائے گا...... زلزلے کی بہت سی جان لیوا کہانیاں سننے میں آ رہی ہیں۔ خدا ان مصیبت زدوں کی مدد کرے اور وہ جلد ہی معمول کی زندگی کی طرف لوٹ پائیں۔ ادبی دوستوں اور گھر میں سبھوں کو ہم دونوں کی دعائیں دیجئے۔

آئندہ کب دلی آنا ہو رہا ہے۔ بن پائے تو جلد از جلد پروگرام بنائیے۔ آپ جیسے اچھے لوگوں سے مل بیٹھنے کا موقع پا کر بہت تقویت پہنچتی ہے۔

(جوگندر پال)

عزیز محترم! سلام و نیاز۔

میں پھر وہی عرض کروں گا کہ آپ عزت افزائی فرماتے ہیں میں ہرگز اس کرم فرمائی کا اپنے کو مستحق نہیں پاتا۔ چہار سُو کا یہ شمارہ بھی ہو قابلِ قدر شخصیات کے کوائف کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور میری معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔ سچ گجرال صاحب کی تصویر دیکھ کر ان پر بے حد پیار آیا۔ کیا عجب کہ وہ سامنے ہوتے جو ادب اتنی اجازت تو دیتا ہے کہ دست بوسی کر لیتا۔ بہر حال بیحد معلوماتی اور اہم ہوتی ہیں اور اس میں جو مجھے سب سے بڑی بات نظر آئی وہ یہ ہے کہ عاشقانِ ادب کی تفریق تو مذہب سے نہیں کی گئی۔ یہ قدم آپ کے اعلیٰ ترین اوصاف کا حامل ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے۔ آپ نے ہندو چاہے اور مسلمان چاہے کی آواز نہیں لگائی۔ حقیقتاً ادب کی یہی اسپرٹ بھی ہے۔

(محشر زیدی)

حبیب مکرم! ہدیہ تسلیم۔

آپ کے قیمتی جریدے کا ذکر تو کئی جگہ سنا مگر دیکھنے کا اتفاق اسی ہفتے ہوا۔ آپ نے کسی صاحب کے ذریعے بھجوایا۔ میں نے انہیں فوراً شکریہ کا خط لکھ دیا اور اب بطور رسید یہ چند سطریں آنجناب کی نذر ہیں۔

میں نے پورا رسالہ بہت اشتیاق اور شوق سے پڑھا۔ "سرفروشی کے انداز..." بہت اچھا لگا۔ باقی مضامین بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔ مجھے افسوس بھی ہے اور خوشی بھی۔ افسوس اس پر کہ اب تک میں ایسے معقول جریدے سے محروم کیوں رہا اور خوشی یہ ہوئی کہ کیا خبر یہ مصرع "دیر آید درست آید" کے مصداق ثابت

ہو۔

زیر نظر شمارے کے ہر خط میں قارئین نے قرۃ العین حیدر کے بارے میں خصوصی اشاعت کا حوالہ دیا ہے کیا ممکن ہے کہ میں بھی وہ شمارہ دیکھ سکوں؟

(قیصر تمکین)

بھائی جان، آداب۔

جب تک یہ خط آپ کو پہنچے گا۔ نیا برس چڑھ چکا ہوگا۔ میری طرف سے آپ کو اور آپ کے سبھی چاہنے والوں کو نئے برس کی مبارکباد۔ خدا آپ پر نیا برس رحمت کی پھوار کی طرح برسائے اور آپ خوشی، خوشحالی، اچھی صحت اور کامرانی سے ہم کنار ہوں، آمین!

آپ کی بھابھی کی صحت مخدوش ہے۔ صرف زندگی پرولانگ' کی جا رہی ہے' جو میڈیکل ٹیکنالوجی میں تین چار برس بھی کی جا سکتی ہے۔ کئی بار اپنے ماموں میلا رام وفا صاحب کا یہ شعر دہراتی ہیں:

دعا کو ہاتھ کیوں اٹھے مرے تیمار داروں کے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امید شفا کم ہے؟

میں آپ کو اپنا ایک طویل مختصر افسانہ "سانپ اور سانپ" بھیج رہا ہوں۔ یہ ہندی میں چھپ چکا ہے ("گیان اودے" کلکتہ میں) لیکن اردو میں اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ جو زمانہ میں نے اس کہانی میں قید کیا ہے وہ ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ کا ہے۔ جب ایسے بے فکرے نوجوان اکثر گلیوں میں دیکھے جاتے تھے۔ جس محلے کا یہ ذکر ہے وہ موہن پورہ، راولپنڈی ہے اور ان نوجوانوں کی ٹولی کو ہم بچے "چنڈال چوکڑی" کہا کرتے تھے۔ امید ہے آپ کو یہ کہانی اچھی لگے گی۔ آپ خود بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے آپ کی رائے معتبر ہوگی اور مجھے انتظار رہے گا کہ آپ اس کے بارے میں مجھے لکھیں۔ میرا e-mail ایڈریس اور فون نمبر نیچے درج ہے۔

E-mail: spanand786@hotmail.com
Ph: 703-733-3993 (USA)

(ستیہ پال آنند)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب السلام علیکم!

کئی ماہ کی خانگی پریشانی سے تنگ آ کر میں لاہور آ گیا ہوں۔ سرگودھا آنا جانا تو رہے گا مگر اب مستقل سکونت مجھلے بیٹے راشد حبیب کے ہاں رہے گی۔

"چہارسو" بڑی باقاعدگی سے مل رہا ہے مگر میں پچھلے تین شماروں سے اس میں غیر حاضر چلا آ رہا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا' یہ بھی نہیں کہ مضامین نظم و نثر سے سرسری گزر گیا ہوں۔ ہر شمارے میں وہ تین چیزیں ایسی ہوتی تھیں جو اپنی فکر انگیزی کے سبب قاری سے داد کا مطالبہ کرتی تھیں۔ "چہارسو" میں "گفتگو" کے تحت پچھلے تین پرچوں میں ڈاکٹر جاوید اقبال' ائر مارشل اصغر خان اور اداکار گجرال سے آپ کا مکالمہ بہت سی نئی باتیں منظر عام پر لاتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے اپنے اور علامہ مرحوم کے اسمبلی الیکشن میں پنجابی عوام کے مزاج اور رویئے کے ذکر میں اگرچہ جذباتیت در آئی ہے مگر سچی برحقیقت اور قارئین کے لئے انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس طرح ائر مارشل صاحب نے اپنی بے لاگ سیاسی سوچ اور حب الوطنی کے تحت آپ کے سوالات کا جواب دیا اس نے ان کی شخصیت میں توانائی کے ساتھ انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ آپ کے مکالمے سے پہلے میں نے ائر مارشل صاحب کی کتھا We learnt but nothing from history. پڑھ رکھی تھی' مجھے ان کی تفصیل سے کہی گئی باتوں اور آپ سے مختصر گفتگو میں کوئی تضاد نظر نہ آیا۔ ہمارے ملک کی سیاست میں نعرہ بازی کے عمل دخل نے ملک کو کوئی فائدہ نہیں دیا۔ بھٹو مرحوم اور ان کے بعد جو بھی برسرِ اقتدار آیا انہوں نے عوام کی بھی سادگی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سوشلزم اور اسلامائزیشن نعرے ہی ہیں جو حکمرانوں نے پاکستانی عوام کو افیون کی گولیوں کی شکل میں عطا کئے کہ کھاؤ اور احمقوں کی جنت میں خواب خرگوش کے مزے لو۔ میں نے پہلے بھی کسی خط میں لکھا تھا کہ آپ اپنے افسانوں میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی بازیافت کر رہے ہیں۔ ان میں خود نوشت کی خوبی اور افسانویت اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ اس سے ایک نیا اسلوب ابھر آیا ہے۔ اگر کبھی آپ کو آپ کے افسانوں کا نقاد میسر آیا تو اسلوب کے حوالے سے اردو افسانہ نگاروں میں آپ کے افسانوں کا مطالعہ اس کے لئے دلچسپ ہوگا۔

(سجاد نقوی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب تسلیم!

"چہارسو" کا شمارہ جولائی۔ اگست' ملک زادہ جاوید کے سلسلے سے کل ہی میرے پاس تک پہنچا۔ میں بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری نظم شامل کر کے مجھے دلی پاکستان تک پہنچنے کا شرف بخشا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ چہارسو ہمارے یہاں چھپنے والے بہت سارے رسالوں سے بہتر ہے۔ چہارسو ایک خالص معیاری ادبی پرچہ ہے اور آپ اس معیار کو قائم رکھنے میں بہت احتیاط اور محنت سے کام لے رہے ہیں۔ "براہِ راست" میں محترمہ قرۃ العین حیدر کا انٹرویو اور کل افشانی دونوں پڑھنے کے لائق ہیں اور جن سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ تینی آپا کے افسانے شامل کر کے آپ نے رسالے کے وقار کو مزید توانائی بخشی ہے۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ بھی بہت خوب ہے۔ اللہ آپ کے رسالے کی عمر دراز کرے۔

(پی۔پی۔سریواستو رند)

محترم و مکرم گلزار جاوید' السلام علیکم۔

آپ کا ہدیۂ علمی ۱۴ روز قبل موصول ہوا اور دل کو تسلی ہوئی اس عنایت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے دوبارہ ارسال کرنے کی زحمت کی گو کیا کیا جائے

اکثر "چہارسو" کے ساتھ ہی ڈاک کے ڈاکو ایسا سلوک کرتے ہیں ورنہ میری ڈاک دیر یا سویر سے مل تو جاتی ہے بہر حال چونکہ آپ کے اس جریدے کے ساتھ میرا کچھ تعلق قائم ہو چکا ہے لہٰذا شکایت زبان پر آجاتی ہے۔ میرے کسی جملے سے آپ کو تکلیف ہوئی ہو تو معذرت!

تازہ شمارے میں پہلے تو اندر کمار گجرال کی تصویر سرورق پر دیکھا تو حیرت ہوئی کہ شاید چہارسو کی تاریخ میں ایک سیاسی چہرہ پہلی مرتبہ ٹائٹل پر نظر آیا لیکن اندر کے صفحات پر ان کا اردو سے عشق دیکھا تو مطمئن ہوا کہ واقعی ان جیسی شخصیت کو اعزاز بخش کر آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مبارکباد پیش ہے "سرفروشی کے انداز بدلے گئے" میں گجرال صاحب نے بہت کچھ انکشاف کیا ہے جس میں سے ایک فقرہ تا ابد ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ صفحہ ۹ کی پہلی عبارت کی چوتھی سطر ملاحظہ ہو "فیض کی اردو زبان کو ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو بین الاقوامی زبان بنا دیا۔" اگرچہ اس رائے پر اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن گجرال صاحب اگر اردو کو اپنے کسی دوست فیض کے ذریعے یاد رکھتے ہیں تو بھلا ان کے اس خلوص سے ان کو کون روک سکتا ہے؟ ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ پر بھی قرطاس اعزاز پسند آیا کہ ان کے حوالے سے بہت ساری معلومات اس طرح مجھے حاصل ہو گئیں۔ افسانوں میں "زندہ باد" شمشاد احمد کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ان کا فن روشنی کی طرح چھایا ہوا ہے۔ قائد اعظم کی شخصیت اور ان سے بھرپور عقیدت کو بنیاد بناتے ہوئے افسانہ نگار نے کہانی کو اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ مجھے اپنے آنسوؤں کو روکنا پڑا پڑھتے پڑھتے۔ ایسی کہانی جس میں حب الوطنی اور عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہو آج کل کہاں پڑھنے کو ملتی ہے۔ خراج تحسین ہے لکھنے والے کے لئے اور چھاپنے والے کے لئے بھی! "ماں کی ممتا" میں ڈاکٹر عمران مشتاق شاید یہ بھول گئے کہ افسانے کے آغاز میں انہوں نے "روتھ" کو ماں بننے کی صلاحیت سے محروم دکھایا تھا جبکہ آخر میں ایک اجنبی سے جنسی ملاپ کے بعد "روتھ" کو حاملہ بنا کر انہوں نے ماں بننے کا موقع فراہم کر دیا۔ یہ بھی! غیر منطقی اور غیر سائنٹیفک بات ہے نا! "راون کی لنکا" میں ایک بار پھر آپ کے قلم کی روانی جوبن پر ہے اور سچ پوچھئے تو مجھے اس میں انشائیے کا لطف آیا ہے۔

اب چلتے چلتے ایک جملہ معترضہ! غزلوں میں آپ نے ملک زادہ جاوید کی غزل بھی شائع کی ہے ان کے نام کو اپنے اور محترم خیال آفاقی کے درمیان میں دیکھ کر میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ یہ بھی کم از کم ہم دونوں کی سطح کے شاعر ہیں لیکن "رس بھرے بلبلے" میں سب سے آخر میں ان کا خط پڑھا تو مایوسی ہوئی کہ وہ "موزوں" اور "موضوع" کے فرق تک سے ناواقف ہیں ملاحظہ کیجئے خط کا آخری جملہ "ایک لفظ ادھر ادھر ہونے سے موضوع شعر ناموضوع ہو گیا ہے" حالانکہ یہاں لفظ موزوں کا استعمال ہونا چاہئے ویسے مجھے یقین ہے کہ یہ کمپوزنگ کی غلطی بہرحال نہیں ہو سکتی!

(غالب عرفان)

برادرم گلزار جاوید صاحب۔ آداب و نیاز!

"چہارسو" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ

فی الحال ذہن و دل مفلوج سے ہیں۔ ابھی تین دن پہلے چھوٹے بھائی نے گھر کو ماتم کدہ بنایا تھا۔ ہر فرد ٹوٹا ہوا سا، گھر اجڑا سا پڑا ہے۔ کس کس کا ذکر کروں۔

کل رات "چہارسو" پر اچٹتی نظر ڈالی۔ گجرال صاحب پر ایک خاص گوشہ آپ نے جمع کر دیا ہے۔ واقعی موصوف اس کے مستحق ہیں اور انہوں نے اردو کی بڑی خاموش خدمت کی ہے۔

"قرطاس اعزاز" کا حصہ بھی کافی معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مظفر حنفی اور سیم انصاری نے تشنہ کی شاعری کی مختلف پرتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ٹورنٹو کی کانفرنس کی سیر ڈاکٹر قمر رئیس نے "نیا سفر" کی توسط سے کرائی تھی اب ڈاکٹر سید تقی عابدی سے بھی وہاں کی تاریخ ساز اردو کانفرنس کا بھرپور نقشہ سامنے آیا۔ اردو کے تعلق سے بڑے کام ہو رہے ہیں کہ دلی طمانیت نصیب ہوتی ہے۔

(علیم صبا نویدی)

پیارے گلزار جاوید صاحب۔ آداب!

غیر مطبوعہ غزل بھیجنے کا آپ کا تقاضا بجا اور درست مگر اب خود "چہارسو" اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کے لئے غیر مطبوعہ غزل ہی بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ میرے پاس غیر مطبوعہ غزل نہیں تھی۔ کچھ چھپ چکیں کچھ چھپنے کو جا چکیں۔ آج نئی غزل لکھی ہے تو آپ کے لئے حاضر ہے۔ آپ بڑے حوصلہ مند انسان ہیں کہ پرچہ برسوں سے بڑی استقامت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ سو اب پرچے کا شمار ملک کے بہت اہم پرچوں میں ہونے لگا ہے۔ مبارکباد۔

(اکبر حمیدی)

محترم گلزار جاوید صاحب تسلیمات۔

محترم اندر کمار گجرال صاحب کی شخصیت کتنی تہہ دار اور دل موہ لینے والی ہے۔ اس کا اندازہ تو تھا پر اس یقین کو استحکام بخشنے کے لئے جس طرح آپ نے قرطاس اعزاز اندر کمار گجرال صاحب کے نام کیا وہ لائق صد ستائش ہے۔ گجرال صاحب کی دانشمندانہ اور بصیرت افروز باتیں قول الذہب کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کی بالمشافہ ملاقات کے ساتھ ساتھ خواجہ حسن نظامی ثانی، خشونت سنگھ، گوپی چند نارنگ، کلدیپ نیر اور ڈاکٹر قمر رئیس نے جس طرح ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اس نے چہارسو کے موجودہ شمارے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اب تو چہارسو کا ہر شمارہ ایک اہم دستاویز کی صورت نظر نواز ہونے لگا ہے۔

ڈاکٹر یوگندر بکل تشنہ کے نام قرطاس اعزاز بھی خوب تھا۔ دس

رابطے ہمیشہ کی طرح پہلے پڑھا گیا۔ پروفیسر قیصر نجفی کے ساتھ ساتھ ان تمام تبصرہ نگاروں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میرے افسانے "سیاہ فام" کو پڑھنے کی زحمت کرتے ہوئے رس رابطے کے ذریعے اپنے خیالات سے آگاہ فرمایا۔

(ڈاکٹر عمران مشتاق)

جناب گلزار جاوید صاحب آداب!

آپ کا رسالہ "چہار سُو" تو ایک پاکستان میں چھپا ہندوستانی جریدہ معلوم ہوتا ہے یا یک ہندوستان دوستی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی۔ پہلے شمارے میں قرۃ العین صاحبہ کے بارے میں گوشہ تھا اور اب کی بار جناب اندر کمار گجرال کے بارے میں اور ڈاکٹر یوگیندر بکل کے بارے میں۔ یہ سب اور آپ کی محنت اور کاوش سے سارا سو حاصل کیا گیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے واہ واہ نکلتی ہے۔ دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات چاہے جیسے بھی رہیں لیکن یہ مشترکہ میراث ہم لوگوں کو ہمیشہ جوڑے رکھے گی اور دلوں کو گرماتی رہے گی۔

(پی۔ ایس۔ جین جوہر)

مدیر محترم سلام و رحمت۔

نومبر و دسمبر کا شمارہ ۱۰ اکتوبر کو موصول ہو گیا تھا۔ بہت شکریہ! اس شمارے کے "قرطاسِ احترام" اور "قرطاسِ اعزاز" کے علاوہ میرے لئے اس کی اہمیت و انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں استاد محترم ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کا مکتوبِ گرامی شاید پہلی بار رونمایت تاسف کے ساتھ آخری بار "رس رابطے" کی زینت بنا اور "تخلیق عصر" میں برفہرست "مفترق خطوط" پہ تبصرہ شامل ہوا.....!

سرورق اور بیک ورق کی ترتیب و تزئین نیئر زیدی صاحب نے عمدگی سے کی۔ "بالمشافہ" میں محترم اندر کمار گجرال صاحب سے کئے گئے سوالات کے جوابات سے جہاں ان کے متوازن و متناسب ذہن کی روشن خیالی اجاگر ہوتی ہے... وہاں کہیں کہیں اختلافی نوعیت بھی ابھرتی ہوئی محسوس ہوئیں..... "کپ شیرینی" کے حوالے سے ان سے متعلق مختلف طبقہ ہائے فکر کے معتبر و خوشگوار احساسات و تاثرات جاننے کا موقع بھی ملا۔ "براہِ راست" میں ڈاکٹر فرشتہ صاحبہ کے شعری و نثری ادب کی خوبیوں کے علاوہ اُردو زبان سے اُن کی محبت نے متاثر کیا اور جو اوصاف وہ اپنی شخصیت میں سمیٹے ہوئے ہیں نیز جس طرح وہ اپنی دعاؤں میں ہر شخص کا بھلا چاہتی ہیں ایسے فضائل جلیلہ تو اب ڈھونڈنے سے بھی خال خال ملتے ہیں... اور.... پھر وہ "انتظار" بھی کیا جس میں منتظر رہنے کی کیفیت تمام ہو جائے اس میں تجسس کا برقرار رہنا ہی اُن کے افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے.... "تشنگی" پیاس کا صحرا احساس کی صلیب اور خون بہا کے حوالے سے..... "پلکوں پہ روشن دیئے"... پڑھ کے سامعین و قارئین کی معزز آراء نے آگہی دی اور بعض خصوصیات کے ساتھ ذاتی و شخصی مسائل کا تذکرہ بھی بچاؤ سے ہوا.....

"زندہ باد" حب الوطنی کے مقدس جذبے اور ارفع و اعلیٰ احساسات سے گندھی ہوئی حقیقت نما کہانی یا پھر کہانی نما حقیقت ہے جس میں مرکزی کردار کا نعرہ ہی اس کی پہچان میں تبدیل ہو گیا اس کو لازوال بنانے کے لئے ایک خوبصورت سطور ہی کافی ہیں۔ "زندہ باد کا کندھا مقدس ہو گیا... اس کے بعد اس نے کسی کو اپنے دائیں کندھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا"... "اُسے قائد پر شک نہ تھا... قائد پر شک کیا گناہ تھا"... "پاکستان زندہ باد... پاکستان زندہ باد"..... "میرے قائد کو بھی میرے ساتھ دفن کر دینا"..... اس کہانی کو تو نصابوں کا حصہ ہونا چاہیے! "مانگے کی ممتا" پڑھتے ہوئے ایسا ہوا.... مغربی تہذیب و ثقافت کو درمیان میں رکھتے ہوئے معمول کی بات لگی... مگر... روتھ کا "اعتراف" کہانی کو مختلف موڑ دیتا اور غیر معمولی بنا جاتا ہے... "راون کی لنکا" میں کرشماتی ذہنیت کے تحت غیر معمولی عمل و ردِّعمل کے پس منظر میں.... کرۂ ارض پہ بسنے والے بنی نوع انسان کے جو متنوع روپ بہروپ مختلف تہذیب و تمدن کے توسط سے ابھر کر سامنے آئے وہ گویا فکر کا طویل تسلسل ہے اور پھر کرشماتی ذہنیت کو کیا کہیے..... 'جو چاہے اس کا حسن کرشمہ ساز کرے'

محترمہ ماجد یوسف نے "کالی دے او بلیہ ہو کے" (ترجمہ) میں بین الاقوامی کتب کے میلے اور کانفرنس میں شرکت کے حوالے سے جس طرح اپنی پاکستان آمد کی یادوں کو تر و تازہ و یادداشتوں کو شاداب پیرائے میں قلمبند کیا اُسے پڑھنا بہت پُر لطف لگا۔ جس سے بین السطور ادبی نکتہ نظر کی بھی وضاحت ہوئی۔

غزلیات کا مجموعہ 'پتھر کی سلی' آکٹو افسانوی مجموعہ 'بڑی دیر ہوئی' سرائیکی مجموعہ 'پیک نظارے لیجدی' ان سب کتابوں سے تعارف اور ان کی خوبیوں کی جانکاری اچھی لگی..... ان میں اول الذکر 'پتھر کی سلی' آکٹو کے مطالعے کا اعزاز بھی پایا.... اور... مائل صاحب نے میرے تبصرے کو پسندیدگی کی سند بھی عطا کی جو ماہنامہ "نیرنگ خیال" اور کوئٹہ کے روزنامہ "جنگ" میں اشاعت پذیر ہوئے۔

'عالمی اُردو کانفرنس ٹورنٹو کا انعقاد.... وقتاً اُردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی کے لئے تاریخ ساز معلومات افزا اور غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا جس میں مزید پیش رفت کے لئے کئی نکات و تجاویز پیش کئے گئے اور اس ضمن میں کئی مثبت اقدام اٹھائے گئے۔

(شگفتہ نازلی)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب آداب و نیاز!

خدا کرے آپ شاد ماں ہوں۔ چند روز پہلے شام کو دفتر سے لوٹی تو اچانک اپنے لئے اتنا خوبصورت تحفہ دیکھ کر خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میرے

دھیرے ایک ایک رسالہ اور پھر چند کتابوں کو پہلے سرسری نظر سے دیکھا پھر دوبارہ غور سے دیکھا اور اب تسلی سے ایک ایک کرکے پڑھ رہی ہوں۔ میرے خیال سے کتابوں سے تو خوبصورت چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ دور دیس سے اتنا پیار اور پُر خلوص تحفہ کسی کو بھی خوشی دے سکتا ہے۔

ماہنامہ ''چہار سُو'' کے جتنے بھی شمارے ملے ہیں اُن کی کیا تعریف کروں۔ جناب احمد فراز صاحب کے بارے میں جاننے کی کافی دیر سے تمنا تھی جو آپ نے پوری کردی۔ آرام آرام سے پڑھ کر لطف لوں گی۔ ان سب کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ 'اردو ادب' کی کتنی خدمت کر رہے ہیں کتنی محنت کر رہے ہیں۔ خدا آپ کی محنت میں چار چاند لگا دے۔ آپ اسی طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

''نیاں بندی'' اور ''مٹی کے کھلونے'' بھی ملے ان خوبصورت کتابوں کے لئے شکریہ۔ آپ کو اتنا وقت کیسے مل پاتا ہے کہ آپ ''چہار سُو'' بھی نکالتے ہیں اور ساتھ میں افسانہ نگاری بھی کرتے ہیں۔ ذکیہ بھابھی اور بچوں کے لئے بھی وقت نکالتے ہوں گے؟ گلزار صاحب اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

''براہِ راست'' کا حصہ اول نظر سے گزرا یہ کئی سالوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میرے پاس تعریف کے لئے بھی الفاظ نہیں ہیں۔ میں آپ کے کام کی تنقید تو کسی بھی طرح نہیں کر سکتی۔ آپ جیسے اول درجے کے ادیب کی کتابیں پڑھنا میری خوش قسمتی ہے۔

آپ کو میرا خط پڑھ کر میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ آپ کی شخصیت جاننے کے بعد اپنے بارے میں بتانا بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔ خیر! اپنے بارے میں اتنی بتانا چاہوں گی کہ اردو زبان سے محبت ہے۔ بی۔ اے کے ساتھ ساتھ الف۔ بے سیکھا اور پھر اسے جاننے کے لئے (اردو زبان اور ادب کی) ایم۔ اے اور Ph.D کرلی۔ اُردو میں افسانے لکھ رہی ہوں اور مختلف رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ دو افسانوی مجموعے ''آئینہ'' اور ''آنکھوں سے دل تک'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ تیسرا سکا سو ہو تیار ہے مگر ابھی نہیں چھپواؤں گی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے یہاں اُردو کا کیا منظر ہے۔ میرے اپنے گھر میں میری لکھی کہانی کوئی نہیں پڑھ سکتا نہ ہی میرے جاننے والے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا ہے کہ ہندی میں ہی لکھنا شروع کردوں مگر نہ جانے کیوں ایسا کر نہیں پاتی۔ چھوٹی سی کوشش ہے کہ اس زبان کو زندہ رکھنا ہے جسے ختم نہیں ہونے دینا۔ کئی لوگوں نے مجھے اردو پڑھتے اور لکھتے دیکھ اُردو سیکھنی بھی چاہی ہے اور میں نے اس میں اُن کی مدد بھی کی ہے۔ اپنی طرف سے تو کوشش جاری ہے۔

نیا سال آنے میں بس اب کچھ ہی دن رہ گئے ہیں۔ میری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ آنے والا 2006 سب کے لئے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ دونوں ملک آپس میں امن شانتی اور پیار کی خوشیوں سے رچ بس جائیں۔ اسی طرح آپس میں میل ملاپ ہوتا رہے۔ ہم لوگ مل کر اُردو زبان اور اُردو ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

(ڈاکٹر رینو بہل)

محترمی گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

تازہ ''چہار سُو'' موصول ہوا جسے میں نے بڑی رغبت سے پڑھا اور اس میں موجود اولی رس سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ لگتا ہے کہ آپ نے اپنے معیار کی پیشکش میں کوئی کمی نہیں کی۔ نظم و نثر و غزل کی بیشتر کاوشیں اپنے اپنے طور پر لطف اور با معنی ہیں اور ''چہار سُو'' کی حیثیت کی بہترین ساحلی و معکار ہے۔ دیکھ کر آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ کریم آپ کی توفیقات میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔

(صدیق شاہد)

برادر عزیز گلزار جاوید صاحب۔

مزاج گرامی قدر۔ آپ کا ''چہار سُو'' جب چہار سُو نظر آتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ خدا کرے یہ چراغ جلتا رہے۔ آپ کے نام کام اور مقام میں اضافہ و برکت کا سو جب ہوا کہ ایک تحریک ثابت ہو۔ پچھلے دنوں پھر اسلام آباد فنکر کی تجویز زیر غور تھی کچھ پیش نہیں کر پر دوش پر ہوا روند کیا اسلام آباد پہنچنگ ہو جائے۔

آپ کے گھر اور مختلف جگہوں پر آپ کے ساتھ گزری ساعتیں ابھی تک یاد ہیں۔ ادب کے حوالے سے آپ کا کام بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور بہت لوگ آپ کے پرچے کی تعریف کرتے ہیں خصوصاً محترمہ شریف رحمی صاحب جب بھی لاہور میں ملاقات ہوتی ہے آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔

خدا کرے اسی طرح ہماری روایات، اقدار اور تہذیب کے اَدوار ارتقا کی جانب سفر کرتے رہیں۔ اور ہم اُردو زبان کی خدمت کرتے رہیں کہ یہ ہمارے آبا و اجداد کی زبان ہے۔

(کرامت بخاری)

گلزار جاوید صاحب، مکرم! السلام علیکم۔

امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ تازہ ''چہار سُو'' ارسال فرمانے کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ کی خواہش نے ادب کے بے شمار قیمتی ہوتیوں سے روشناس کروایا ہے جنہیں ہم صرف سیاست دان ہی سمجھتے تھے وہ تو بہت بڑے تخلیق کار نکلے! اندر کمار گجرال کی تحریروں میں جو شعاس ہے وہ اوروں میں کم کم نظر آتی ہے۔

(سجاد مرزا)

محترم المقام جناب گلزار جاوید! نومبر دسمبر کا ''چہار سُو'' باصرہ نواز ہوا۔ ارسال خاص پر شکریہ۔ اندر کمار گجرال اور یوگیندر بکل تشنہ کے گوشوں سے مزین یہ شمارہ مذکورہ شخصیات کی خدمات اور اُن کے بے لاگ تجزیے کا حسین

نرم ہے جناب کے انٹرویو اور نازک سوالات پر مخاطب کے جوابات وسیع النظری کا عکس اظہار ہے۔ یوگندر بہل تشنہ کی شخصیت پہلوداری سوغات کی حامل ہے جو عصری تشنہ لبوں کی تشنگی کو قرار بخشتی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مضمون تشنہ کی شاعری کا عمدہ تنقیدی تجزیہ ہے۔

کیمونسٹ اور بالغ نظر فنکار جگر مل کا فیض صاحب کی بابت یادداشتی مضمون بحیثیت فیض کو شناخت کرتا ہے۔

غزلیات میں منظور حسین یادؔ، محسن احسان، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بدر ساغری، عبدالرحمان عبدؔ، سرور راہبالوی، قیصر نجفی، دل نواز دل اور مختار ابر کا کلام اچھا لگا۔

کراچی میں ہونے والے ایک مذاکرے میں اُردو نظم کے زوال کا ذکر چھڑا ہے جسے روزنامہ ایکسپریس میں سرور جاوید (ادبی کالم: متاعِ نظر) نے لے رپورٹ کیا ہے۔ اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے فقط اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ فکر اور جمالیاتی مظہر کی حامل نظم آج بھی لکھی جا رہی ہے اور منتخب قاری کی طالب ہے۔ "چہارسو" کے موجودہ شمارے میں شامل نظمیں "کہاں کچھ یاد رہتا ہے"، No man is on Island (ستیہ پال آنند) "میں نے پڑھنا سیکھ لیا ہے" (نذیر جہاں) "نئی تاریخ لکھنی ہے" (سید عارف) "جانے کی باک" (نذیر گجانی) اُردو نظم کو اعتبار بخشتی ہیں۔ شمشاد احمد کا بیانیہ افسانہ "زندہ باد" بلوغ کا شاکی نہیں لیکن سپاٹ پن کا روگی ضرور ہے۔ ڈاکٹر عمران مشتاق نے "مانگے کی ماں" میں مغربی اقدار میں ڈھلنے والی ممتا کے پیار کا سُراغ لگانے کی سعی کی ہے اور افسانے کی دلچسپی کو دوآتشہ کر دیا ہے۔ افسانہ کے عصری بانجھ پن میں بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا یہ افسانہ پلاٹ، کردار اور کہانی پن کا واضح جواز مہیا کرتا ہے۔

آخری بات، جناب کے افسانے "راون کی لنکا" کی۔ ہم کلامی کا مظہر یہ افسانہ موجودہ عہد کے منظرنامے کا عکاس ہے۔ اس افسانے کی کئی بار قرأت کر چکا ہوں، اپنا سچا اظہار دیدہ و شنید میں نہیں۔

(نسیم عباس)

گرامی قدر جگر ارجاوید صاحب، سلام و رحمت۔

"چہارسو" پابندی سے ملتا ہے۔ شکریہ قبول کیجئے۔ معذرت خواہ ہوں کہ بے طرح مصروفیات کے سبب شمارہ "چہارسو" کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کر سکا ہوں اور سرسری طور پر ڈالی ہوئی نظر اظہارِ رائے کا استحقاق نہیں رکھتی۔ سو بریں معمول کا تبصرہ رقم کرنے سے قاصر ہوں۔ بعض احباب میری تخلیقی کاوشوں کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ خصوصاً جناب محسن احسان کا ممنون ہوں، جو ہمیشہ میرے لئے کلمۂ خیر لکھتے ہیں۔ وہ ایک بڑے تخلیق کار ہیں، ان کے لکھے کو میں سند تصور کرتا ہوں۔ برادرم کرشن کمار طور نے مجھے اپنی محبت سے نوازا ہے۔ وہ سراپا محبت ہی محبت ہیں۔ ان جیسے مہان لوگ خال خال ہیں..... پنہاں صاحب میری پسندیدہ شاعرہ ہیں۔ وہ سچا شعر کہتی ہیں۔ میرے نزدیک وہ غزل کہہ سکتی ہیں۔ میں نے اپنے تبصرے میں ان کے درج ذیل شعر پر گرفت نہیں کی تھی:

فطرت کے بیگار بھی
شمع ہے پروانہ ہے

بلکہ ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ جہاں تک تسامحات کا تعلق ہے تو کون ایسا شاعر ہے (بشمول میرے) جس سے دانستہ یا نادانستہ لغزش نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے مشاہیر بھی اس زد میں آتے ہیں۔ میر صاحب کے علاوہ شاعری کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تاہم ان کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا بلند شعر بلند تر ہے اور پست شعر پست تر ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے اردو ادب کا استاد ہوں، مگر ذوقی لحاظ سے ادب کا ایک طالب علم ہوں اور اس بات کو میں اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا ہوں۔ پنہاں صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں یہ عرض ہے کہ لفظ "شمع" کو اساتذہ نے بروزن "شمع" مدعیا جمع باندھا ہے۔ ان تمام الفاظ کے آخری حرف کا جزم میں اعلان محل نظر ہے یعنی یہ الفاظ دو حرفی تصور ہوتے ہیں اور شعر میں دو حرفی الفاظ کی صورت ہی میں استعمال کئے جاتے ہیں:

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے — دردؔ

ہم لیے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی — جوشؔ

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں — غالبؔ

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا — میرؔ

(قیصر نجفی)

مکرم و محترم جگر ارجاوید، آداب۔

مزاجِ گرامی۔ "چہارسو" کی ادبی خدمات سب کے پیش نظر ہیں۔ کل یوسف صاحب تشریف لائے تو دسمبر 2005 کا پرچہ دے گئے۔ آپ کی تحریر اور حمد، نظم و نثر خوب ہیں۔ ہم تو سبھی زبانوں سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا اردو کی افادیت کے پیش نظر اکثریت کو اس کی ضرورت ہے۔ اردو سے محبت کے سبب جگر مل صاحب بھی ہمیں عزیز ہیں۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کے سلسلے میں مضامین خوب ہیں۔ پیاسا بدیو (ترجمہ نور جہاں ثروت) کا انداز بیاں اور شمشاد احمد کا زندہ باد قابل ذکر ہیں۔

(ماجد سرحدی)